

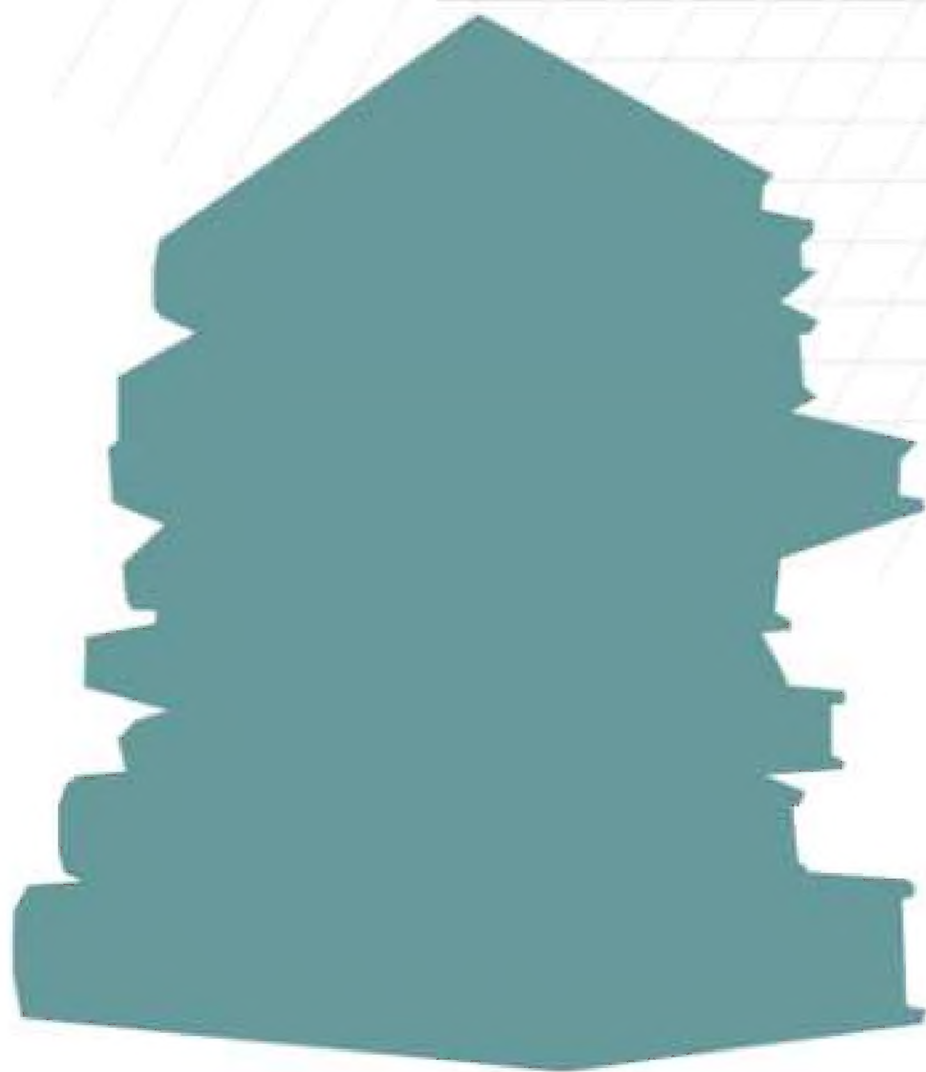
مقالات فریدی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے مقالات

(جلدِ اوّل)

جامع ومرتب :

مولانا محب الحق



مقالات فریدی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے مقالات

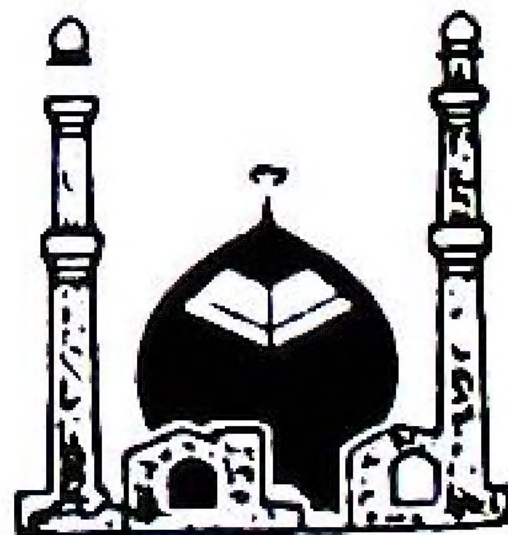
(جلد اول)

جامع ومرتب

مولانا محب الحق

استاذ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ





ادارہ ادبیات دلی ۵۸۰۳ صدر بازار دہلی

نام کتاب	:	مقالات فریدی
جامع و مرتب	:	مولانا محب الحق (پروہی مدھوبنی بہار)
کمپوزنگ	:	فعال رہبر ابن مرغوب احمد امروہی و عبد الصبور (عبد الرحمٰن کمپیوٹر گرافکس)
ناشر	:	ادارۂ ادبیات دلی ۵۸۰۳ صدر بازار دہلی
طباعت	:	جید پریس بلی ماران دہلی
تعداد	:	۵۰۰
سن اشاعت	:	۲۰۰۸ء
قیمت	:	
ملنے کے پتے	:	مدرسہ نسیم العلوم مسجد انار والی، سرائے کہنہ، امروہہ
		دار الکتاب شیخ الاسلام روڈ (نل روڈ) محلہ ملانہ، امروہہ
		مدنی کتب خانہ نزد جامع مسجد، امروہہ
		الفرقان بک ڈپو ۱۱۴/۳۱ نیا گاؤں نظیر آباد لکھنؤ
		ادارۂ ادبیات دلی ۵۸۰۳ صدر بازار دہلی ۶

محمد احمد نے ادارۂ ادبیات دلی کے لئے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر شائع کی۔

ترتیب

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

فہرست تالیفاتِ شیخ (حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری مہاجر مدینہؒ) کے شروع میں مولانا سید محمد شاہد زید مجدہم نے "ایاز! قدر خود را بشناس" عنوان قائم کر کے تالیفات و تصنیفات کی اہمیت و ضرورت پر جو تحریر کیا ہے اس کو کچھ ترمیم کے ساتھ اس کتاب "مقالاتِ فریدی" میں شامل کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

"اس برصغیر میں علماء اسلام و مشائخ کرام کے قلم سے علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ علم دین کی خدمت جس قدر وسعت اور ہمہ گیر طریقہ پر ہوئی ہے اس کا احاطہ تو درکنار تصور کرنا بھی مشکل ہے اس دائرہ کو اگر زیادہ وسیع کر کے عالم عرب کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر معاملہ کہیں سے کہیں جا پہنچے گا اور یہاں بھی قرآن پاک کی آیت "ولو اَنّ ما فی الارضِ من شجرۃ اَقلام و البحر یمدّہ من بعدہ سبعۃ اَبحُرٍ ما نفدتْ کلمات اللہ" پڑھ کر اعداد و شمار سے عاجزی اور بے بسی ظاہر کرنی پڑے گی اس لئے کہ اسلام کی گذشتہ چودہ صدیوں میں پیدا ہونے والے محققین اہل علم کی تالیفات و تصنیفات دنیا کے چپہ چپہ پر قائم کتب خانوں لائبریریوں اور علمی و مطالعاتی اداروں میں آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں جس سے تشنگان علوم اپنی علمی پیاس بجھانے میں مصروف ہیں۔

تحریر کے ذریعہ دین و مذہب کی خدمت اور اس کی آبیاری اس امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے اس سے قبل کے ادیان و ملل کی تاریخ اس نوع کی جدوجہد سے خالی ہے اور پھر یہ بھی نہیں کہ یہ جدوجہد تاریخ کے کسی عہد میں ہوگئی ہو اور کسی عہد میں نہ ہوئی ہو بلکہ تاریخ کے ہر دور ہر قرن اور ہر عہد میں تواتر و تسلسل کے ساتھ قدم بقدم سے مربوط ہو کر چلتا رہا اور علم و قلم سے اپنا رشتہ قائم کئے رہا اور پھر ان دونوں کے حسن اشتراک سے ایسی بیش بہا کتابیں وجود میں آئیں جس نے نسل انسانی کو روشن ضمیری عطا کی اور کائنات میں غور و فکر کے

مواقع مہیا کر کے اس کو خالق کائنات سے قریب کیا''۔

زیر نظر کتاب بھی ایک ایسے ہی عالم دین اور صاحب قلم شخصیت کے سیکڑوں مقالات میں سے چند مقالوں کا مجموعہ ہے جن کی علمی وقلمی کاوشوں سے بہت سے پوشیدہ گوشے منصۂ شہود پر آئے اور اس سے تصنیف وتالیف اور تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کو کافی مدد ملی اور تقریباً پچاس سال سے زائد عرصہ تک برصغیر کے مختلف مؤقر رسالوں میں قلمی خدمات انجام دیں اس صاحب قلم دینی ومذہبی شخصیت کا نام نامی اسم گرامی مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہیؒ ہے۔

اللہ تعالی نے آپ کو علم وقلم کا عمدہ سلیقہ بچپن ہی سے ودیعت کیا تھا بلکہ تصنیف وتالیف اور تحقیق وتنقید کا ذوق آپ کے خاندان اور خاندان کی دیگر شاخوں میں بہت پہلے سے چلا آرہا ہے اگر شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندیؒ اور ان کے خانوادہ کو نیز صاحب ''شمس بازغہ'' ملا محمود فاروقی جون پوریؒ، صاحبِ ''شرح سلم العلوم'' قاضی مبارک فاروقی گوپاموئیؒ، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکیؒ، شیخ محمد محدث فاروقیؒ چشتی تھانویؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیفات وتالیفات کو بھی شامل کرلیا جائے تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوجائے گا یہ تمام حضرات فرخ شاہی فاروقی ہیں اور مزید اوپر جا کر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادہ کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو یہ دائرہ وسیع تر ہوجائے گا اس لئے کہ ان تمام حضرات کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن عمر فاروق اعظمؓ پر متصل ہوجاتا ہے۔

مولانا فریدیؒ کے دادا کے برادر معظم مولوی ارشاد علی فاروقی مرحوم نے متعدد کتابیں تصنیف کیں خصوصاً ''بشیر المدائح، بشیر النصائح، بشیر الانشاء، مصدر ارشاد اور انشاء ارشاد'' مشہور ومعروف ہیں اور یہ تمام کتابیں اس زمانے میں مدارس میں داخل نصاب تھیں اور ان کے علاوہ ''فرہنگ ارشاد، منتخب چراغ ہدایت، کتاب النصائح'' بھی لکھیں۔

بعد کی کڑیوں میں آپ کے خواہرزادے پروفیسر خلیق احمد فاروقی نظامی مرحوم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وسفیر شام اور برادرزادے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مرحوم صدر شعبۂ عربی دہلی یونورسٹی دہلی

ہندوستان کے مایہ ناز صاحب قلم اور ادیب تھے۔

مولانا فریدیؒ کی پوری زندگی علم وقلم اور درس وتدریس کے لئے وقف تھی وفات تک آپ کا قلم جاری وساری رہا ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنو میں لکھے ہوئے مضامین میں سے کچھ مضامین کتابی شکل میں آگئے ہیں. آپ کی تمام کتابوں نے اپنی افادیت کے لحاظ سے شہرت دوام حاصل کی ہے۔

خصوصاً ''تجلیاتِ ربانی، مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ترجمہ اور تلخیص۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کو عربی، ترکی اور اردو میں پیش کرنے کی کوشش مختلف حضرات نے کی ہے لیکن ان کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی تجلیات ربانی کو حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ان مباحث کو چھوڑ دیا گیا ہے جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں بلکہ مفید مطالب ومباحث کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی فکر اور ان کے عظیم کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ مکتوبات ماہنامہ الفرقان میں چھیالس قسطوں میں پہلے شائع ہوئے ہیں۔ بعدہٗ کتابی شکل میں مکتبہ الفرقان سے دو جلدوں میں طبع ہوئے۔ اگر تجلیات ربانی میں سے مولانا فریدیؒ کے نام کو حذف کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو یہ محسوس ہوگا کہ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ نے خود یہ ترجمہ کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بانی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ تجلیات ربانی کے حرف آغاز میں ارقام فرماتے ہیں:

''مولانا فریدی نے بالکل اسی انداز پر جو اس عاجز کی آرزو تھی مکتوبات کے تینوں دفتروں کی تلخیص و ترجمہ کا کام انجام دیا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار میں ذرہ برابر بھی تواضع اور کسر نفسی نہیں ہے کہ اگر میں خود یہ کام کرتا تو ہرگز ایسا نہ کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا فریدی کو ایسے کاموں کی خاص صلاحیت بخشی ہے۔''

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ کا ترجمہ وتلخیص:

''یہ مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات کے تینوں دفتروں وسیلۃ السعادہ، درۃ التاج اور مکتوبات معصومیہ کا عطر ہیں۔ ان مکتوبات کا ترجمہ وتلخیص ماہنامہ الفرقان میں ۲۲ قسطوں میں پہلے شائع ہوا پھر ۱۹۶۰ء

میں کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آئے۔ اس سے پہلی مرتبہ خواجہ صاحبؒ کی فکر، مجتہدانہ کارناموں اور دینی بصیرت کا اندازہ ہوا۔ مولانا فریدیؒ نے خواجہ صاحبؒ کی فکر کو جس انداز میں اجاگر کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

تذکرہ خواجہ باقی باللہ، قافلہ اہل دل، تذکرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مکتوبات اکابر دیوبند، ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز (نواب مولانا رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ کا سفرنامہ حرمین ۱۲۰۱ھ ۱۲۰۳ھ)، تذکرہ شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ سلسلہ ولی اللّٰہی کا ایک گمنام درویش، تذکرہ شاہ عبدالرحیمؒ ابوالرضا محمد، تذکرہ خلفاء شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ، وصایا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، فرائدِ قاسمیہ، مکتوباتِ سید العلماء وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

احقر کی ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ آپ کے مقالات کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے، تاکہ صاحبان اہل قلم وعلم اور صاحبان تصانیف کے لئے تحقیق وجستجو میں مدد ملے۔

اس کتاب میں مولانا فریدیؒ کے ''تیرہ مقالے'' ہیں جو ماہنامہ ''دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ تذکرہ دیوبند، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، ماہنامہ تاج لاہور اور ماہنامہ برہان دہلی'' میں شائع ہوئے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم نے حضرت نانوتویؒ کی شاعری، حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے غیر مطبوعہ مکتوبات اور حضرت نانوتوی کی آخری یادگار، مقالوں اور مقالہ نگار کے متعلق جو ارقام کیا ہے اس کو بھی یہاں نقل کر دیا جائے جس سے مولانا فریدیؒ کی علمی وتحقیقی جستجو سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا کہ مولاناؒ کس محنت ولگن اور عرق ریزی سے مضامین لکھا کرتے تھے تاکہ ہم جیسوں کے لئے مشعلِ راہ ہو۔

حضرت نانوتویؒ کی شاعری پر قیصر صاحب مرحوم رقمطراز ہیں:

''برادرم مولانا فریدی کے متعلق اگر میں یہ کہوں کہ ان کی زندگی متضاد صفات وخصوصیات کی حامل ہے تو اس میں کسی شاعرانہ اور خطیبانہ مبالغہ کا دخل نہیں ہوگا اپنی شکل وصورت اور ظاہری انداز واطوار کے لحاظ سے وہ مجذوب صفت انسان ہیں جنھوں نے درس وتدریس تبلیغی جماعت اور قومی کاموں کے لئے خود کو وقف

کر دیا ہے لیکن کچھ دیر ان سے گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا دین ودیانت کے اس سبزہ زار میں جابجا شعروادب، علم وتحقیق اور فکر ونظر کے ایسے سدا بہار پھول بھی کھلے ہوئے ہیں جن کی رنگارنگی، تازگی اور دلکشی گلچیں کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ع گلوں کی جانب تو دست گلچیں بڑھا کئے ہیں بڑھا کریں گے

مولانا فریدی نے حضرت نانوتویؒ کی باکمال زندگی کا ایک بالکل نیا رخ پیش کیا ہے اور یہ رخ مولاناؒ کے تقدس، بزرگی، زاہدانہ زندگی اور مجاہدانہ شغف سے بالکل جدا ہے مگر حیرت ناک نہیں اس لئے کہ۔

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ☆ ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

مجھے بہت خوشی ہے کہ میں اپنی سعی میں کامیاب ہوا۔ اور مولانا فریدی سے اتنا اچھا مضمون رسالہ ''دارالعلوم'' کے لئے حاصل کرسکا''۔

''تبرکات'' (حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے غیر مطبوعہ مکاتیب) پر قیصر صاحب ارقام کرتے ہیں:

ہم رسالہ ''دارالعلوم'' کے خاص مضمون نگار مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے ممنون ہیں کہ ان کے تحقیقی اور تاریخی ذوق وشغف کی بدولت ہمیں حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے چند غیر مطبوعہ مکاتیب اشاعت کے لئے میسر آئے یہ قیمتی تبرکات ہیں جنھیں ہم بڑی خوشی کے ساتھ رسالہ میں شائع کر رہے ہیں۔

تینوں خطوط جن حضرات کے نام لکھے گئے ہیں ان کا تعارف مولانا فریدی صاحب نے اپنے حواشی میں کرادیا ہے حضرت نانوتویؒ کے خط میں جن مولانا محمد علی صاحب کا ذکر ہے ان کے متعلق فریدی صاحب مدیر رسالہ کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا محمد علی جن کا ذکر اس خط میں ہے ان کا حال معلوم نہ ہوسکا میں ان کے حالات کی جستجو میں ہوں غالباً ''تحذیر الناس'' کے شائع ہونے پر چاروں طرف سے جو اعتراضات[1] کی بارش ہوئی ہے اسی سلسلہ

[1] حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ رشید قاسم ثانی سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ نے مولانا محمد علی کے اعتراض کا جواب دنداں شکن دیا ہے اور حضرت نانوتویؒ نے مولانا عبدالقادر بدایونی کے اعتراض کا جواب جامع ومسکت دیا ہے اس مجموعہ کا نام ''تنویر النبراس'' براعتراض تحذیر الناس ہے۔ یہ قلمی مخطوطہ پھلاودہ میں ہے۔ احقر نے مولانا فریدیؒ کو پورا مخطوطہ سنایا ہے۔ اس مخطوطے کا ذکر مولانا فریدیؒ نے فرائد قاسمیہ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ مولانا محمد علی بچھرایوں کے رہنے والے تھے۔ یہ مردم خیز قصبہ اس وقت مرادآباد میں شامل تھا اب جے. پی نگر امروہہ سے متعلق ہے۔ (محب الحق)

میں مولانا محمد علی بھی بولے ہوں گے، غالباً حضرت نانوتویؒ اور ان کے تلامذہ نے جوابات دیئے ہیں بعض جوابات پھلاودہ میں ہیں یہ مولانا محمد علیؒ مناظر ضرور تھے اور حضرت نانوتوی سے ان کے اچھے مراسم تھے اور غالباً ضلع بجنور یا مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ آئندہ میں ان سب باتوں کی تحقیق کر کے ایک مضمون لکھوں گا۔ حضرت نانوتویؒ کی آخری یادگار مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر امروہیؒ پر تحریر کرتے ہیں:

سن تو مجھے یاد نہیں، غالباً سترہ، سولہ (۱۶/۱۷) سال پہلے کی بات ہے، ابا جی (حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ) کے انتقال کے بعد جب پہلی دفعہ ڈابھیل گیا تو اس کمرہ میں جہاں ابا جی اور ہم رہتے تھے ایک نئے بزرگ نظر آئے بہت سن رسیدہ، ضعیف و کمزور مگر بے حد زندہ دل، سادہ لوح اور طبیعت کی سچائی کے لحاظ سے قدیم بزرگوں کا اک جیتا جاگتا نمونہ، ان کی مجلس میں مدرسہ کے اساتذہ، طلباء اور شہر کے لوگ بھی جمع رہتے اور رات بارہ بارہ بجے تک یہ مجلس قائم رہتی۔ مولانا کی بات بات میں نکتہ ہر موقع پر اشعار اور لطائف و حکایات کا انبار ہوتا تھا۔ ملنے جلنے اور ساتھ رہنے والوں کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ رہتے اتنی بے تکلفی کے ساتھ کہ نہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم میں اور ان میں عمر کے اعتبار سے ایک دو نسل کا بُعد ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑے عالم اور ان کے مقابلہ میں ہم جاہل محض ہیں۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں، نیازمندوں اور خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کی باتیں اتنی دلچسپی اور انہماک سے سنتے تھے کہ گویا اک چھوٹا اپنے کسی بڑے کی بات سن رہا ہے۔ میں اس زمانے میں جامعہ ڈابھیل کی مسجد میں طلبہ کو گھیر گھار کر اول فول تقریریں کرتا تھا مولاناؒ میری ہر تقریر میں تشریف لاتے صف اول میں بیٹھتے اور اتنی بشاشت کے ساتھ میری ادھر اُدھر کی باتیں سنتے کہ گویا کوئی بڑا مقرر تقریر کر رہا ہے۔ ان کی مجلس کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ اس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں ہو سکتی تھی جب وہ کسی دوسرے کو غیبت کرتے پاتے تو فوراً ٹوک دیتے اور منع فرما دیتے تھے۔

تفسیر و حدیث کی مسند درس پر ان بزرگ کو پایا تو علم و فضل کے بحر ذخّار نظر آئے تفسیر و حدیث کے اونچے اونچے مسائل کو چند لفظوں میں یوں سلجھا دیتے تھے کہ دوسرے گھنٹوں کی تقریر سے بھی اسے اس طرح ادا نہیں کر سکتے تھے یہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہیؒ تھے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے شاگرد اور ان کے علمی و باطنی کمالات کی آخری یادگار، زہد و تقوی کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ اور مشرقی تہذیب و تمدن کی ایک دم توڑتی ہوئی شمع۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے انتقال کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جامعہ ڈابھیل کے صدر مدرس بنا دئے گئے تھے اور مولانا عبدالرحمٰنؒ تفسیر و حدیث کے اعلی استاذ کی حیثیت سے ڈابھیل بلائے گئے تھے۔ راقم الحروف کو دو ڈھائی سال مولاناؒ کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا جوں جوں ان کی سیرت کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا اسی طرح ان کی طبیعت کی نیکی، ان کی فطرت کی پاکبازی، ان کے علم و فضل اور وسیع اخلاق پر اعتماد بڑھتا گیا۔ مولانا مرحوم اپنی طبیعت کی معصومیت اور مزاج کے سدھلوٹ کے اعتبار سے اس دور کے نہیں اس سے بہت پہلے کے انسان تھے۔

وہ قدیم تاریخ کا ایک صفحہ تھے جو مجسم و متشکل ہو کر سامنے آ گیا تھا ایک مستقل دور کی حیثیت رکھتے تھے جو اپنے وقت پر شروع ہوا اور اپنے وقت پر ختم ہو گیا۔ حضرت نانوتویؒ کے نام و ذکر ان کے علوم اور ان کے کارناموں سے انھیں عشق تھا دنیا جہان کی باتوں کو گھیر گھار کر مولانا نانوتویؒ پر ختم کر دیتے تھے اور کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں مولاناؒ کا ذکر نہ آتا ہو سچ یہ ہے کہ بچپن کی ناسمجھیوں میں مولانا نانوتویؒ کے مقام کا ایک نامعلوم اثر مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ہی کی صحبت میں قائم ہوا۔

ایسے پاکباز اور سادہ دل انسان قدرت کی ایک گراں پایہ امانت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے وجود اور کمالات کی روشنی میں گم کردہ راہ لوگوں کو اپنے مقاصد اصلی کی منزل تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔

مولانا فریدیؒ کا بڑا احسان ہے کہ آج کی صحبت میں انھوں نے یہ تذکرہ چھیڑا ؎

ساقی قدحے کہ دور گلزار گذشت ☆ مطرب غزلے کہ وقت گلزار گذشت

اے ہم نفس! از بہر دل زار بگوئی ☆ افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت

''آزاد کی کہانی'' ''نقد و نظر کی کسوٹی پر رسالہ ''الفرقان'' کے سابق مدیر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مقالہ اور مقالہ نگار کے متعلق لکھتے ہیں:

''جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی سے ناظرین ''الفرقان'' واقف ہیں انھیں مسلمانان ہند کی دینی اور روحانی تاریخ سے خاص شغف اور دلچسپی ہے۔ ''الفرقان'' کے پچھلے بیس سالہ فائلوں میں، ان کے قلم سے بزرگوں کے کتنے ہی تراجم وتذکرے اوران کے ملفوظات ومکتوبات کے ترجے نکل چکے ہیں جوان کے اسی شغف کا عملی ثبوت ہیں پھران کے اس شغف کو سلسلہ مجددی اور خاندان ولی اللہی کے بارے میں کچھ اور بھی خصوصیت کا درجہ حاصل ہے۔

اور ہندوستان کے طول وعرض میں اہل حق کی راہ کو عزیز رکھنے والا کون مسلمان ہے جوان ہر دو خانوادوں کی ممنونیت کا احساس اپنے اندر نہ پاتا ہو؟ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''مولانا آزاد کی کہانی'' (بروایت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی) جب ان کے سامنے آئی جس میں ''مولانا آزاد کی زبانی'' ان کے والد ماجد کی طرف سے خاندان ولی اللّٰہی کے پاک وشفاف دامن پر بہت سے داغ دھبّے لگائے گئے ہیں اور مولانا کے والد کے نانا کو اس خاندان کا شاگرد بتاتے ہوئے اس کے مسلکِ حق کا سرگرم مخالف دکھایا گیا ہے پھر یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات گویا اپنے دور میں یکتائے روزگار اور مرجع انام تھے تو مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے ان کے حالات وواقعات (مندرجہ ''کہانی'') کی تحقیق کا ارادہ کیا اور اس کے نتیجہ میں یہ مفصل تبصرہ تیار ہو گیا جو پیش کیا جارہا ہے:

''مولانا آزاد نے (بروایت ملیح آبادی صاحب) اگرچہ شاہ شہیدؒ وغیرہ پر لگائے ہوئے اپنے والد کے بعض الزامات کو خود ہی بہتان تک قرار دے دیا ہے اور اختلاف مسلک میں اپنے والد کی تائید نہیں کی ہے مگر چونکہ نہ الزامات کی کوئی باقاعدہ تردید کی گئی اور نہ ان کے مسلک کی غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا مزید برآں کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے والد اور والد کے نانا دونوں حضرات کی بے پناہ علمیت اور پاکبازی وروشن ضمیری کا سکّہ قارئین کے قلوب پر جمنا لازمی ہے جس کے بعد خاندان ولی اللّٰہی کے مخالف مسلک کو قدرتی طور پر وہ علمی اور روحانی وزن حاصل ہوتا ہے جس سے وہ آج تک محروم رہا ہے اس لئے اس کتاب پر ایک تحقیقی تبصرہ کی ضرورت تھی، ہمیں خوشی ہے کہ یہ کام مولانا فریدی امروہی جیسے اہل کے حصہ میں آیا اور انھوں نے تحقیق و

کاوش کا حق ادا کر دیا۔

علاوہ اس خاص پہلو کے خالص علمی وادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ ''تبصرہ'' ایک گراں قدر خدمت کی حیثیت رکھتا ہے جس کی داد اہل نظر ہی دے سکتے ہیں اور وہی اس کی ضرورت سمجھ سکتے ہیں''۔

مونس مہجوراں جو حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے حالات پر مشتمل ہے، کی دریافت پر مرتب ''تاریخ دیوبند و تاریخ دار العلوم دیوبند'' سید محبوب رضوی مرحوم رقمطراز ہیں:

''مونس مہجوراں کا مخطوطہ مدرسہ صولتیہ ''مکہ مکرمہ'' کے کتب خانہ میں موجود ہے یہ مصنف کا اصل مخطوطہ ہے اس کی دریافت کا سہرا راقم سطور کے صدیق مکرم مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی کے سر ہے فریدی صاحب نے ''مونس مہجوراں'' کے ضروری مقامات کے اقتباسات لیکر ان کو ماہنامہ ''تذکرہ دیوبند'' بابت نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع کرادیا ہے''۔

یہ ہیں مولانا سید ازہر شاہ قیصر اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور سید محبوب رضوی کی مولانا فریدیؒ اور ان کی تحقیق و جستجو کے متعلق آرا جو حقیقت پر مبنی ہیں درحقیقت مولاناؒ فریدیؒ کی ذات والا صفات علم و تحقیق سے عبارت تھی آپ نے علم وادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ (ان شاء اللہ)

آپ کا مشغلہ تمام عمر درس و تدریس اور قلم سے مربوط رہا مولاناؒ ایک صاحب طرز ادیب و محقق تھے سفر بھی اکابر کی غیر مطبوعہ تحریروں کی تلاش میں ہوتا تھا اگر یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں جگہ پر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا نانوتویؒ، مولانا محدث امروہیؒ، شیخ الہندؒ یا مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تحریر ہے اور ابھی تک شائع نہیں ہوئی تو پھر کیا تھا بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی اور جب تک ان تحریروں کو حاصل کر کے شائع نہ کرا دیتے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے اس سلسلہ کی ایک قلمی تحریر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نادر مکتوبات کی ہے جو مولانا سید مرتضی حسن چاند پوریؒ کے کتب خانہ میں تھی آپ نے مولاناؒ کی زندگی میں ان مکتوبات پر سرسری نظر ڈالی تھی مولانا چاند پوری کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا انور صاحب سے حاصل کر کے پہلے ان مکتوبات کو نقل کیا پھر ترتیب دے کر مکتوب الیہم

پر حواشی تحریر کئے مولانا فریدیؒ مکتوبات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے متعلق اپنے مضمون ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اوران کا خاندان ایک سرسری جائزہ ایک اجمالی نظر'' میں ارقام کرتے ہیں:

''شاہ محمد عاشقؒ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مکاتیب کے جمع کرنے کی طرف توجہ فرمائی، شروع میں ان کے صاحبزادے شاہ عبدالرحمٰن، شاہ صاحب کے خطوط و مکاتیب جمع کرتے رہے ان کی وفات کے بعد خود شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے اس کام کو بڑی محنت و جانفشانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مجموعہ کے ''سیاسی مکتوبات'' احقر کے اردو ترجمہ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی سلمہ کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو چکے ہیں بقیہ دو سو سے زائد علمی اور دینی مکتوبات احقر کے ترجمہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ عنقریب شائع ہونے[1] والے ہیں ان خطوط کے مطالعہ سے بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زندگی کے حالات پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی ایسی معلومات سامنے آئیں گی جو ان خطوط کے علاوہ ان کی تصنیفات میں کہیں نہیں ملتیں''۔

اسی طرح قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے غیر مطبوعہ مضامین جو اس وقت کے حالات کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے تھے اور ان مضامین کے مجموعہ کا نام ''فرائد قاسمیہ'' رکھکر مولانا سید عبدالغنی پھلاودیؒ نے جمع کیا تھا مولانا پھلاودیؒ کے پوتے مولانا سید عبدالمغنی مرحوم سے حاصل کر کے اس پر سولہ صفحہ کا محققانہ مقدمہ تحریر کر کے شائع کرادیا یہ احقر نے صرف دو نمونے قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں خود اس مجموعہ میں کئی مقالے غیر مطبوعہ ہیں ان کے علاوہ اور بھی مضامین ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اپنے معاونین کا شکریہ ادا نہ کیا جائے خصوصاً مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا زین العابدین سہارنپور اور حافظ جنید اکرم فاروقی امروہی کا کہ ان حضرات نے میری درخواست پر اپنی گراں قدر آراسے مقالات فریدی کو مزین کیا۔ نیز کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ اردو کے منتظم جناب شمیم احمد کا بھی مشکور ہوں۔

احقر نے آخر میں مولانا فریدیؒ کا سوانحی خاکہ بھی پیش کردیا ہے تا کہ مولانا کے حالات سے یک گونہ

---

[1] یہ مکتوبات شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت سے شائع ہو چکے ہیں۔

واقفیت ہو جائے مقالات کی ترتیب میں اگر احقر سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہوتو قارئین سے درخواست ہے کہ نشاندہی کر کے خاکسار کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس خامی کو دور کردیا جائے۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن ☆ تابماند نام نیکت برقرار

خاکپائے حضرت فریدیؒ
محب الحق پروہی استاذ جامعہ اسلامیہ
عربیہ جامع مسجد، امروہہ

ایک صاحب کرامت محقق

مفسر قرآن مولانا حافظ قاری سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی

مولانا نسیم احمد فاروقی فریدیؒ کو میں نے صاحب کرامت محقق تحریر کیا ہے کیونکہ مولانا نے اپنے لئے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تحریر وانشاء کا مشکل ترین موضوع تھا۔

خدا کی آخری مقدس کتاب قرآن مجید کتب سابقہ میں ایک تحریری معجزہ ہے اور حضرت حق تعالی نے اپنے کلام مقدس کے اسی پہلو (تحریر وادب کی بلاغت) سے مکہ کے اہل زبان اور مدعیانِ ادب وشعر کے سامنے بطور چیلنج پیش کیا اور ان اہل زبان کو قرآن کی تحریر اور قرآن کے بلیغ تحقیقی ادب کا جواب دینے سے قاصر کردیا۔

صاحب قرآن رسول محترم ﷺ کو اللہ تعالی نے ''النبی الامی'' بنایا تاکہ قرآن کریم کے کلام حق ہونے میں کسی صاحب عقل سلیم کو شبہ نہ رہے۔

یہ امت وارث کتاب (سورۂ فاتحہ) قرار دی گئی ہے اس لئے اس امت نے اپنے ماننے والوں میں بڑے بڑے اصحابِ تحریر وقلم علماء تیار کئے، جنھوں نے کتاب الٰہی اور اس سے تعلق رکھنے والے علوم وفنون کی تحریری خدمت کا وہ حق ادا کیا جس کی مثال دوسری امتوں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

مولانا فریدیؒ کا خاندان نسباً فاروقیت کا شرف رکھنے کے ساتھ علم روحانیت اور طریقت کے میدان میں بھی بڑے بڑے شہسوار رکھتا تھا اور ان شہسواروں میں مولانا نسیم احمد فریدیؒ کا خاص درجہ تھا۔

مولانا نسیم احمد صاحبؒ پر تصوف و روحانیت کا غلبہ تھا اس لئے ان کے تحقیقی و تحریری ذوق نے تصوف سے متعلق نادر چیزوں کو اپنی تحقیقی کاوش کا موضوع بنایا اور اس سلسلے میں بڑی بڑی بیش قیمت تصوفی کتابیں وجود میں آئیں۔

جیسا کہ ان کی تصنیفات کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس ناچیز کا آپ سے واسطہ امروہہ کے جلسوں میں پڑتا تھا اس موقع پر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تمہارے تفسیری ذوق پر رشک آتا ہے اور وہ بھی ولی اللہی خاندان کے فارسی اور اردو تراجم کی تحقیق کا ذوق جو خداتعالیٰ نے خاص طور پر تمہیں عطا کیا ہے اور تم سے ولی اللہی خاندان کے قرآنی علوم کے رموز اور لطائف کے ظاہر کرنے کی خدمت لی۔

میں نے تو مولاناؒ کی معذوری کا دور امروہہ کی مسجد (جھنڈا شہید) میں فقر و درویشی کی شان کے ساتھ دیکھا ہے اور مولانا محب الحق صاحب کی خدمت (پڑھنا اور لکھنا) اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مولانا فریدیؒ کے مقبول مسترشد ہونے کا یقین حاصل کیا ہے کیونکہ مولانا محب الحق صاحب جیسا بے لوث خادم خداتعالیٰ کی خاص دین ہی ہوسکتا ہے، ورنہ موجودہ دور پر غرض پسندی کا غلبہ ہو چکا ہے اخلاص نام کی کوئی چیز دور دور نظر نہیں آتی۔

اکابر دین کے باہمی علمی اختلافات کے بیان کرنے میں عام طور پر نزاکت کا احساس نظر نہیں آتا۔ مولانا باوجود تحقیقی مزاج رکھنے کے جس میں فکری آزادی لازمی ہے اسلاف کرام کی عظمت کے قائم رکھنے کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اس ناچیز نے جب مولانا زید میاں فاروقی مجددیؒ کی کتاب ''مولانا محمد اسماعیل'' اور ان کی کتاب ''تقویت الایمان'' کے جواب میں ''مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور ان کے ناقد'' کتاب تحریر کی تو اس میں حتمی طور

پر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ کے درمیان اُس اختلاف کا بھی ذکر کیا جو مجد
صاحبؒ کے نظریہ قیومیت سے محدث صاحبؒ اور قوامیت پیدا ہو گیا تھا۔

یہ مسئلہ بڑا نازک تھا اس لئے مولاناؒ نے مسودہ میں سے اس مضمون کو حذف کرادیا اور اس ناچیز نے
مولانا فریدیؒ کے حکم کی تعمیل کی۔

ایک خاص بات مولانا فریدیؒ کی یہ بھی بیان کردوں جو موجودہ دور میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور و
یہ ہے کہ:

یہ ناچیز مولانا فریدیؒ کے اندر اسلاف کی صفت (امت سازی) کی جھلک بھی دیکھتا تھا اخلاقی طور پر جس
صفت کو قدر افزائی کی صفت کہا جاتا ہے سماجی طور پر یہ صفت امت سازی کی ہے جماعت کے مختلف بلند اوصاف
رکھنے والوں کو متحد رکھنا اور سب کو اپنی اپنی جگہ پر اعتماد میں رکھنا قوم کے اندر اتحاد قائم رکھنے کی فطری تدبیر ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف صلاحیت رکھنے والے صحابہؓ کو مختلف القاب عطا فرمائے کسی کو صدیق کسی کو
فاروق کسی کو بمنزلہ ہارون اور کسی کو حواری رسول وغیرہ کے القاب دے کر امت مسلمہ کو بنیان مرصوص بنادیا۔

مولانا فریدیؒ میں چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کا بڑا وصف تھا اس ناچیز کی تقریر سن کر فرمایا کرتے تھے کہ
مجھے تمہاری تقریر میں مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ کی تقریر کا مزا آجاتا ہے وہی دلی کے چٹخارے وہی لوچ و
لچک نرمی اور گرمی جو سحبان الہندؒ کی تقریر کا رنگ تھا اسی کی یاد تمہاری تقریر دلادیتی ہے۔

میں کیا کہوں کہ خود تھک کر گھر بیٹھ گیا ہوں ورنہ چل پھر کر مولاناؒ کا یہ بیش قیمت علمی سرمایہ چھپوانے
کے لئے اصحاب خیر سے درخواست کرتا۔

بہر حال مولاناؒ کے وہ بیش قیمت مضامین مولانا محب الحق صاحب شائع کرنے کی کوشش کر رہے
ہیں یہ موصوف خود ایک فقر و زہد کی دنیا کے آدمی ہیں۔

دیکھئے کس اللہ کے بندے کو اس معاملہ میں تعاون کرنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ جو کام شیخ فریدیؒ

انجام دے گئے ہیں اس کے لئے اب امت میں ایسے لوگ پیدا ہونے مشکل نظر آتے ہیں۔
امیر خسروؒ نے کہا ہے:

خوں شد دل خسرو زنگہداشتن راز ☆ چوں ہیچ کسے محرمِ اسرار ندارم

اخلاق حسین قاسمی
لال کنواں دہلی۔۶
۲۷؍اگست ۲۰۰۵ء

کلماتِ چند

مولانا زین العابدین اعظمی استاذ شعبہ تخصّص فی الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کا ذکر خیر اوران کی تحقیقات کا تذکرہ اپنے بزرگوں سے طالب علمی ہی کے زمانے سے سنتا چلا آرہا تھا اور ''مکتوبات اکابر دیوبند'' کا مسودہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے زمانے میں جناب دفتری نورالحق صاحب عثانی مرحوم کے واسطے سے پڑھ چکا تھا اوران کے ایک خاص معتقد جناب حکیم محمد اسحاق صاحب حیدرآبادی کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ یہ مکتوبات مسودہ کی شکل میں جناب مفتی نسیم احمد صاحب فریدی کے مبارک قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور پھر دفتری صاحب کے حکم سے میں نے اور حکیم صاحب نے مل کر اس مسودہ کا مقابلہ اکابر کے اصل مکتوبات سے کیا جو خاص انھیں کے قلم کے مکتوبات تھے جن کی تصحیح ہم دونوں نے کی یہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے. پھر دیوبند سے فراغت کے بعد جب مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں تدریسی خدمت میرے ذمہ آئی تو وہاں مفتی صاحبؒ کے کئی درسی ساتھی مولانا عبدالباری قاسمی مرحوم اور مولانا شمس الدین حسینی مرحوم سے ملاقات ہوئی اوران بزرگوں سے بھی مفتی صاحبؒ کی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں گمان غالب یہ ہے کہ ایک آدھ مرتبہ مدرسہ احیاء العلوم میں بھی مفتی صاحب کو دیکھا لیکن آپ سے تفصیلی ملاقات ۱۳۹۰ھ میں ہوئی ربیع الاول کا مہینہ تھا اور انگریزی حساب سے ۱۰؍تا ۱۲؍مئی ۱۹۷۰ء میں سخت گرمی میں امروہہ میں ایک عالمی اجتماع ہونے والا تھا اس وقت میں سات چلہ والی جماعت

میں وقت لگا رہا تھا اکابر نظام الدین کے حکم اور مشورہ سے اس اجتماع کی محنت کے لئے ایک جماعت کے ساتھ امروہہ بھیج دیا گیا ایک ہفتہ قیام کر کے عربوں کی ایک جماعت اور ان کے ساتھ کچھ مقامی ساتھیوں کو لگا کر میرے ساتھ بھوپال روانہ کیا گیا مولانا نسیم احمد صاحب فریدیؒ کی اخلاص بھری کوشش اس اجتماع میں دیکھنی نصیب ہوئی جماعتوں کی ترتیب مساجد امروہہ میں ان کا نظام بنانے اور ان کی نصرتوں اور سخت گرمی میں ان جماعتوں کے ساتھ وقت گذاری کی مشقتوں کے دیکھنے کا موقع وہیں میسر ہوا۔

یہ چند کلمات مولانا محبّ الحق صاحب مدّ ظلّہ کی فرمائش پر لکھ دئے اللہ تعالی ہم لوگوں کو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشیں اور مولانا محب الحق صاحب کو مفتی صاحبؒ کے علوم کو شائع کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

زین العابدین الاعظمی

شعبہ تخصص فی الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (یو، پی)

تعارف

مولانا حافظ قاری جنید اکرم فاروقی امروہی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ ایک جیّد عالمِ دین روشن ضمیر بزرگ اور بہترین صاحب قلم تھے ان کی ذات والا صفات علم وآگہی کا خزانہ اور اہل علم وادب کا مرکز و مرجع تھی وہ دن بھر کتنے ہی علمی، ادبی اور [illegible] معاملات سلجھاتے تھے اہل علم ان کے پاس علمی نکات سمجھنے آ رہے ہیں اہل قلم اپنی نگارشات سنا رہے ہیں [illegible] اپنے [illegible] سن رہے ہیں طلبہ اخذ علم کر رہے ہیں عوام اپنے مسائل اور استفتاء لے کر آ رہے ہیں [illegible] سے لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ سب کو مستفید و مستفیض کر رہے ہیں ساتھ ہی [illegible] جاری ہے بصارت زائل ہو چکی ہے لیکن بصیرت کامل ہے علم زبان وقلم پر [illegible] اور ذرا سی دیر میں ان کے وسیع مطالعہ عمیق فکر و دقت نظر کا احساس [illegible]

لیجئے ذوق صحیح سلامتی فکر اور خداداد ذہانت کے بل پر بات کی تہ تک پہنچ جانا اور صحیح نکتے کو پکڑ لینا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

تحقیق ان کی عادت اور نقد ونظر ان کا مزاج تھا ان کے سیکڑوں عالمانہ اور محققانہ مضامین اور متعدد کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہو کر علمی حلقوں سے دادِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نادر ونایاب مکتوبات کی اشاعت ہے جو تقریباً دو صدیوں سے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے بہت سے اہل نظر کی رسائی ان تک ہوئی لیکن ان کی تیز روشنی نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا انھوں نے ان مکتوبات پر سرسری نظر ڈالی اور نظر انداز کر دیا دراصل خطِ شکست نے بھی حوصلوں کو شکست اور دلوں کو پست کیا تھا حضرت مفتی صاحبؒ اس میدان کے مرد تھے اور وہی اس مئے مردافگن کے حریف ثابت ہوئے انھوں نے دلجمعی کے ساتھ ان مکتوبات کو پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مکتوبات ہیں اور پھر انھوں نے دن رات سردی گرمی کا احساس کئے بغیر انھیں نقل کیا کرمِ خردہ مقامات پر صحیح الفاظ بٹھائے پھر ان کا ترجمہ کیا اس تمام عرق ریزی وجگر کاوی میں ان کی بینائی متاثر ہو گئی اور بالآخر وہ بصارت سے محروم ہو گئے لیکن اہل ذوق کو انھوں نے بصیرت عطا کر دی کیا کیا جواہر ان قلمی مکتوبات کے صدف میں پوشیدہ تھے جنھیں انھوں نے آب وتاب دے کر اس سلکِ مروارید کو عام کر دیا۔ ع

راز ہائے کہ نہاں بود بہ بازار افتاد

مولانا محب الحق صاحب فارغ التحصیل عالم دین ہیں حضرت مفتی صاحبؒ کے تربیت یافتہ اور شاگرد ہیں۔

زوالِ بصارت کے بعد مفتی صاحبؒ ان سے کتب ورسائل پڑھوا کر سنتے اپنے مضامین کا املا کراتے خطوط لکھواتے یہیں سے گویا مولانا محب الحق صاحب کے اندر بیٹھا ہوا قلم کار انگڑائیاں لینے لگا مفتی صاحب کی وفات (۱۸/اکتوبر ۱۹۸۸ء) کے بعد وہ باقاعدہ لکھنے لگے ان کے قلم کا مرکز ومحور بالخصوص اپنے استاذ کی

شخصیت ان کے مکتوبات ومقالات ہیں اب وہ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں خصوصاً وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے حالات ملفوظات اور مکتوبات ''فیضانِ نسیم'' کے نام سے شائع کر چکے ہیں اب انھوں نے رسائل میں بکھرے ہوئے مفتی صاحبؒ کے مضامین یکجا کرنے اور انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے پہلی جلد ''مقالاتِ فریدیؒ'' آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں تیرہ مقالے ہیں ان میں تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی ہیں اور تعارفی وسوانحی بھی کیونکہ یہ ایک بلند پایہ محقق اور ناقد کے قلم سے ادا ہوئے ہیں اس لئے اہل علم وقلم کے لئے ان کی حیثیت مستند حوالے اور اہم ماخذ کی ہے بلکہ ان کے مطالعے سے نقد ونظر کے سلیقے کا اندازہ ہوتا ہے بالخصوص مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب ''مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی'' پر ''مولانا آزاد کی کہانی نقد ونظر کی کسوٹی پر'' زبردست تحقیقی وتنقیدی مقالہ ہے جسے پڑھتے ہوئے بار بار روح وجد میں آجاتی ہے اور دل کہتا ہے:

دعوئے نقد ونظر ہو جسے اس کو یہ دکھا ☆ دیکھ اس طرح سے کرتے ہیں محقق تحقیق

زیرِ نظر کتاب میں جن شخصیات کے سوانحی مضامین ہیں ان کی شخصیتیں زبردست علم وفضل بے نظیر تقدس وتقویٰ اور بے مثال کردار وعمل کی حامل ہیں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت محدث امروہیؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسرِ قرآن امروہیؒ، مولانا محمد صدیق صاحب قاسمی مرادآبادیؒ حافظ محمد ضامن فاروقی شہید تھانویؒ وغیرہ ایسی پاکیزہ شخصیات اور ایسے مقدس نفوس ہیں جن کی سیرتوں کا مطالعہ سیرت سازی کے عمل میں کامل اثر رکھتا ہے مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدیؒ نے ان زندہ جاوید ہستیوں کے فیض کو جاری اور باقی رکھنے کی سعی محمود فرمائی ہے اور اب یہی کوشش مولانا محب الحق صاحب کی بھی ہے وہ اپنے استاذ ومربی اور مخدوم کے فیضان کو منضبط ومربوط اور جاری وساری رکھنے میں اسی طرح کوشاں ہیں جس طرح امام ابو یوسفؒ نے امام اعظمؒ کے فیضان کو عام کیا تھا۔

فجزاه عند ربه خير الجزاء.

جنید اکرم فاروقی امروہی

20/8/05

مولانا مفتی نسیم احمد فاروقی فریدی امروہیؒ

امروہہ شمالی ہندوستان کی ایک قدیم مردم خیز بستی رہی ہے جس کو بڑے بڑے علماء وفضلا، صوفیاء و اولیاء، اطبّا وشعراء اور صاحبانِ علوم وفنون کا مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس شہر کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ یہاں تقریباً تمام مروّجہ سلاسلِ طریقت کے مشائخ نے اپنے اپنے عہد میں چشمہ ہائے فیوض وہدایت سے مخلوق کو سیراب کیا ہے۔ یہاں ہر دور میں بڑے بڑے باکمال علماء ہوئے اور بعض خاندانوں میں مسلسل کئی پشتوں تک علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح بعض خاندانوں کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ اس میں نسلاً بعد نسلٍ بڑے بڑے ذی علم اور حاذق اطبّاء پیدا ہوتے رہے۔ جنھوں نے خدمت خلق کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ فن شاعری میں بھی امروہہ نے کافی نام پیدا کیا۔ شمالی ہند کے پہلے مثنوی گو شاعر ''اسمٰعیل'' امروہوی اور مشہور صاحب دواوین شاعر ''مصحفی'' کے وطن ہونے کا بھی شرف امروہہ ہی کو حاصل ہے۔ یہاں ہر دور میں باکمال شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں فخر زمن، سید العلماء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ نے اپنے وجودِ باجود سے اس خطۂ خاک کو شرفِ تقدس بخشا۔ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ آپ ہی کی مساعیٔ جمیلہ سے وجود میں آیا جس سے ہزاروں تشنگان علوم فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ حضرت محدث امروہیؒ کے فیض یافتگان میں بڑے بڑے علماء، حفاظ وقُراء، اطبّاء اور مشائخ ہوئے جنھوں نے امروہہ کا نام روشن کیا۔ اسی سلسلۃ الذهب کی ایک کڑی حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ تھے۔ حضرت موصوفؒ جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نہایت متقی، عبادت گذار، نیک طینت، درویش صفت عالم تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ کو تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف، ادب اور شاعری میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ مولانا فریدیؒ ۱۲؍رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ موافق ۶؍ستمبر ۱۹۱۱ء کو امروہہ میں متولد ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے واسطے سے حضرت امیر المومنین سیدنا عمر ابن خطاب فاروق اعظمؓ خلیفۂ ثانی تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت سید شاہ ابن بدر چشتیؒ

کی اولاد میں تھیں۔ جن کا سلسلہ نسب حضرت علی رضاؒ کے واسطے سے جگر گوشۂ رسولؐ شہید کربلا سیدنا حضرت امام حسینؓ سے متصل ہوتا ہے۔

مولانا فریدیؒ نے ایک ایسے علمی و دینی گھرانے میں آنکھیں کھولیں جس میں علم و فضل اور فقر و دین کی کئی پشتوں تک مسلسل اور مربوط روایات ملتی ہیں۔ آپ کے یہاں پرانی قدروں کا احترام اور مشرقی تہذیب کا اہتمام تھا۔ آپ دل و دماغ کی نادر خوبیوں سے آراستہ تھے۔ آپ نہایت بااخلاق، پرخلوص و بامروّت، منکسر مزاج و متواضع، فراخ دل اور علم دوست تھے۔ آپ کے اندر انسانی ہمدردی اور شفقت و محبت بھی بے پناہ تھی۔

مولانا فریدیؒ شروع ہی سے ذہین و ذکی اور علم کے شوقین تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت والدہ ماجدہ اور بڑے بھائیوں کے زیر اہتمام ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قرآن مجید اور دینی کتب سے شروع ہوئی۔ پھر پرائمری اسکول سے جونیر اسکول تک ہندی اور انگریزی میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو علوم مشرقیہ سے گہری دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ نے منشی، منشی کامل، مولوی فاضل اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے۔ پھر عربی شروع کی اور جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ میں حضرت مولانا سید رضا حسنؒ، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر امروہیؒ وغیرہ علماء سے جلالین شریف اور مشکوٰۃ شریف تک پڑھ کر بقیہ علوم کی تحصیل و تکمیل کے لئے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر سند فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوریؒ، حضرت مولانا مفتی ریاض الدین افضل گڑھیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی ثم کراچیؒ، آپ کے اساتذہ میں تھے۔ آپؒ نے لاہور جاکر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تفسیر کی سند بھی حاصل کی۔ فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے ''مدرسہ اشفاقیہ بریلی'' میں دو سال تک بخاری شریف کا درس دیا۔ پھر اپنی مادر علمی جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ میں بحیثیت مدرس و مفتی علمی خدمات انجام دیں اور تاحیات اسی درسگاہ سے وابستہ رہے۔ آپ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا

محمد زکریا قدس سرہٗ، حضرت مولانا فتح محمد میواتیؒ اور حضرت حافظ مقبول حسن گنگوہی ثم دہلویؒ سے بلا طلب اجازتِ بیعت اور خلافت حاصل تھی مگر آپ نے اپنی کسرِ نفسی تحریری و تصنیفی مشغولیات اور بعض ذاتی حالات کی بناء پر بیعت کرنے کا سلسلہ جاری نہیں رکھا۔ آپ ایک جید عالم اور مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز ادیب اور باکمال شاعر بھی تھے۔ آپ نے پچاس سال سے زائد عرصے تک برصغیر کے مختلف موقر رسالوں میں علمی و تحقیقی مضامین لکھے۔ مضمون نگاری اور شعر و شاعری کا یہ سلسلہ تا حیات جاری رہا۔

اس خادم دین اور خادم علوم اسلامیہ نے ۵ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ موافق ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۸ء یوم سہ شنبہ کو وفات پائی اور بقول مومن خان مومن دہلویؒ ۔

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہوگئے ☆ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

ذوق دہلویؒ کے شعر میں دو لفظوں کی ترمیم کے ساتھ ۔

زندہ قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوق ☆ اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

خاکپائے حضرت فریدیؒ

محب الحق امروہہ

مقالات فریدی

حضرت شیخ عبدالحق حقّی محدث دہلویؒ

نسب نامہ

حضرت شیخ عبدالحق حقی ابن حضرت شیخ سیف الدین سیفی قادری ابن شیخ سعد اللہ ابن فیروز شہید ابن ملک موسیٰ ابن ملک معزالدین ابن آغا محمد ترک بخاریؒ۔ حضرت شیخ محدث دہلویؒ نے ''اخبار الاخیار'' میں اپنا نسب نامہ یہیں تک تحریر فرمایا ہے آگے کو معلوم نہ ہوسکا۔ آغا محمد ترک بخارا سے بعہد سلطان محمد علاء الدین خلجی جماعت کثیر کے ساتھ دہلی آئے اور گجرات وغیرہ کی تسخیر کرنے پر مامور ہوئے۔

پیدائش اور بچپن کے حالات

حضرت شیخ محدث دہلویؒ محرم ۹۵۸ھ میں تولّد ہوئے۔ آپ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں عہد طفولیت کے بہت سے واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت بچپن ہی سے صلاحیت پسند واقع ہوئی تھی۔ کھیل کود میں آپ نے اپنا عزیز وقت ضائع نہیں فرمایا۔ اپنے بزرگ والد سے (جو کہ حضرت شیخ امان اللہ پانی پتی قادری کے مرید تھے) تقویٰ وطہارت کو ورثہ میں پایا تھا۔ در حقیقت حضرت شیخ کے کمالات علمیہ وثمرات روحانیہ میں ان کے والد ماجد کی تربیت کو بہت بڑا دخل ہے۔

حضرت شیخؒ اپنے شغف علم کا ذکر فرماتے ہوئے ایک جگہ (اخبار الاخیار میں) تحریر فرماتے ہیں کہ ماں باپ میرے نہ کھیلنے پر بہت کڑھتے تھے لیکن مجھے لطف تحصیل علم میں ہی آتا تھا۔

برخلاف اور بچوں کے ان کے ماں باپ ان کو کھیلنے سے روکتے ہیں اور وہ پڑھنے سے جی چراتے ہیں۔ سیر وتفریح، وقت پر کھانا، دوست احباب سے ملنا جلنا رات کو وقت پر سونا غرض یہ کہ دنیا کا کوئی عیش شوق علم کے باعث میسر نہ تھا۔

تحصیل علم

حضرتؒ نے اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی دیگر اساتذۂ دہلی سے بھی تعلیم پائی ہوگی۔ جن کے اسماء معلوم نہ ہو سکے۔ ۲۲ سال کی عمر میں سوائے علمِ حدیث کے تمام علومِ نقلیہ وعقلیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ بعد فراغ ایک سال میں قرآن شریف حفظ فرمایا۔ زمانۂ تعلیم میں جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ خود فرماتے ہیں ''گاہے در اثنائے مطالعہ کہ وقت از نیم شب درمی گذشت والدم قدس سرہٗ مرا فریاد می زد کہ بابا چہ می کنی۔ من فی الحال درازمی شدم تا دروغ نشود ومی گفتم خفتہ ام چہ می فرمایند باز برمی نشستم ومشغول می شدم وچند بار در دستار وموئے سر آتش چراغ در گرفتہ باشد۔ ومرا تا رسیدن حرارتِ آں بہ حجرۂ دماغ خبر نہ

چہ دردہائے چراغے کہ در دماغ نرفت | کدام بادۂ محنت کہ در ایاغ نرفت
کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام | چہ خار خار کہ در بستر فراغ نرفت
بحیرتم زدلِ خود کہ عمر رفت ولے | زکنجِ غم کدہ ہرگز بصحن باغ نرفت

ہندوستان میں تعلیم حاصل کر چکنے اور نکاح ہو جانے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق اور علم حدیث کے حصول کا ذوق دامنگیر ہوا۔ چنانچہ آپ ۹۹۶ھ میں دہلی سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ آمد و رفت، قیام وتعلیم اور حج وزیارت میں چار سال کا عرصہ لگا ۹۹۹ھ کے آخر میں آپ اپنے وطن مالوف (دہلی) واپس آئے۔ علمائے حرمین شریفین سے آپ نے صحاح ستہ کا درس حاصل کیا۔ اور حضرت مولانا عبدالوہاب متقیؒ قطب مکہ معظمہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی اور اس بزرگ کے فیض صحبت وفیض درس سے روحانی وعلمی منافع حاصل کر کے ہندوستان میں محدث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ غالباً آپ سے پہلے ہندوستان میں کوئی عالم محدث کے لقب سے شہرت یافتہ نہیں ہوا تھا۔ مشکوٰۃ شریف پڑھ کر آپ کو امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کرنے کا خیال تھا۔ لیکن آپ کے استاذ حضرت عبدالوہاب متقیؒ نے آپ کو سمجھایا اور امام اعظمؒ کے فضائل ومناقب بیان فرمائے جس کے باعث آپ حنفیت پر قائم رہے۔ چنانچہ آپ نے ''فتح المنان فی تائید مذہب النعمان'' ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ جس میں حنفیوں کے مسائل ضروریہ کو مدلل طریقہ سے تحریر فرمایا ہے۔

سلوک وتصوف

حضرت شیخؒ کمالات معنویہ میں بھی یگانہ روزگار تھے۔آپ کے والد نے وصیت فرمائی تھی کہ بیٹا فقط ملائے خشک نہ بنے رہنا۔غالباً اس وصیت کی تعمیل میں آپ نے تزکیہ نفس کا شروع ہی سے التزام رکھا۔فن تصوف میں کتابیں لکھیں۔اولیاء اللہ کا ایک مستقل تذکرہ اخبار الاخیار لکھا جو شائع ہو چکا ہے اور نہایت مقبول و مروج ہے۔آپ حسب ذیل چار بزرگوں سے بیعت تھے:(۱) اپنے والد ماجد حضرت شیخ سیف الدین قادریؒ مرید شیخ امان اللہ پانی پتی قادریؒ سے طریقۂ قادریہ میں۔(۲) اٹھائیس سال کی عمر میں حضرت سید موسیٰؒ سے (جن کا مزار سید موسیٰ پاک شہیدؒ کے نام سے اُچہ نواح ملتان میں ہے) بیعت ہوئے۔یہ بزرگ حضرت غوث اعظمؒ کی اولاد میں سے تھے۔(۳) حضرت مولانا عبدالوہاب متقیؒ قطب مکہ معظمہ سے مکہ معظّمہ میں بیعت ہوئے۔یہ بزرگ قادریہ سلسلے کی شاذلیہ شاخ میں بیعت تھے۔علاوہ ازیں سلسلۂ چشتیہ میں بھی بیعت تھے۔(۴) حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ سے طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت ہو کر ذکر و مراقبہ اور دیگر نقشبندی خصوصیات حاصل کیں۔ان چار بزرگوں سے عالم ظاہری میں بیعت ہونے کے علاوہ عالمِ باطنی یعنی خواب میں حضرت غوث اعظم محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بیعت ہوئے۔مرید ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ نے فارسی زبان میں بشارت دی ''بزرگ خواہی شد'' اس بیعت کا ذکر کتاب زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار کے حاشیے پر حضرت شیخؒ نے کیا ہے۔

حضرت شیخؒ اس بشارت کے علاوہ کئی دفعہ سرور کائنات روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے عالم رویا میں مشرف ہوئے ہیں۔

شعروشاعری

حضرتؒ کو شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا۔حقی تخلص فرماتے تھے۔ایک نعتیہ قصیدہ ہندوستان میں تالیف فرما کر مدینہ منورہ میں روضہ مطہرہ پر جذب وکیف کے عالم میں پڑھا۔اس کا ایک وجد آور شعر سنیے۔

خرابم درغم ہجر جمالت یارسول اللہ ☆ جمالِ خودنمارحمے بجان زار شیدا کن

اس شعر کے متعلق اپنی کتاب زادالمتقین میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب قصیدہ کی اس بیت پر پہنچا اس کو اتنا پڑھا کہ حالت گریہ طاری ہوگئی اور رونے لگا۔ پھر فرماتے ہیں کہ غالباً یہ شعر مقبول وموجب حصول مقصود ہوگیا ہو۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ۔

حقی کجا وصحبت کس کز خیالِ دوست ☆ از وے بخود چومردمِ دیوانہ عالمے

ایک رباعی اور پڑھ لیجئے:

حقی ز پئے قصہٗ وافسانہ شدی ☆ چوں مردم روزگار فرزانہ شدی

درویش ترا ز ذکر شاہان چہ غرض ☆ مزون سخن گشتی ودیوانہ شدی

تصنیفات

حضرت شیخؒ نے زمانہ طالب علمی میں اور قبل از سفر حرمین شریفین بھی کئی کتابیں تالیف وتصنیف فرمائی تھیں لیکن بعد واپسی ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۵۲ھ تک (تا وصال) سلسلۂ تصانیف وتوالیف کو با قاعدہ جاری رکھا۔ اور عربی وفارسی زبان میں بڑی بڑی ضخیم اور معرکتہ الآرا کتابیں تحریر فرمائیں۔ حضرت شیخ نے ایک مستقل رسالہ اپنی تالیفات کی فہرست کا لکھا ہے۔ اس کا نام ''تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف'' ہے۔ اس فہرست میں ۴۸ کتابوں کا اندراج ہے۔ ایک کتاب اڑسٹھ رسائل کا مجموعہ ہے جس کا نام ارسال المکاتیب والرسائل الی ارباب الکمال والفضائل ہے یہ رسالے ایک ہی جلد میں ہیں۔ حضرتؒ نے ان کے متعلق فرمایا کہ ''ایں ہمہ رایک صحیفہ سازند'' اس حساب سے معہ فہرست کے ۵۰ کتابیں ہوئیں لیکن آخر فہرست میں حضرتؒ نے اپنی تصانیف کی میزان کل دی ہے۔ اس میں رسائل کے اڑسٹھ ہی تعداد محسوب فرماتے ہیں۔ اس صورت میں اڑتالیس کتابیں مندرجۂ فہرست اڑسٹھ رسائل اور ایک رسالہ فہرس التوالیف کل ۱۱۷ کتابیں ہوتی ہیں۔ آخر فہرست میں تحریر فرماتے ہیں:

ہنوز سلسلۂ سخن دراز است ودر فیض الٰہی باز یکجا رسد ویکجا رساند۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصانیف کا سلسلہ اس فہرست کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بعد میں کتنی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ صاحب مراۃ الحقائق یعنی منشی برکت علی صاحب جو کہ حضرت شیخؒ کی اولاد و احفاد سے ہیں فرماتے ہیں کہ کتب خانہ مولوی انوار الحق دہلوی میں گیارہ ایسی کتابیں موجود ہیں جو فہرست میں درج نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ۱۲۸ کتابیں ہوئیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی اور تصنیفات ہوں واللہ اعلم بالصواب۔ حضرت شیخؒ نے فہرست میں جو کتابیں درج فرمائی ہیں ان کتابوں کی سطریں پانچ لاکھ ہیں اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ بھی مرتبۂ قبولیت کو پہونچ جائے تو الحمد للہ ورنہ سب ہیچ ہیں مقصود رضائے حق اور عطائے حق ہے۔

اللہ اللہ کیسے کیسے صاحب کمال اور ذی علم حضرات دہلی کی سرزمین پر گذر چکے ہیں! مولانا حالیؒ نے دہلیِ مرحوم کے مرثیے میں سچ فرمایا ہے ۔

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک ☆ دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

آج نہ وہ علم رہا نہ وہ علم کا ذوق نہ وہ صاحب کمال رہے نہ وہ صاحب تصانیف۔ موجودہ زمانے میں بھی جو چند بزرگ ہندوستان میں رہ گئے ہیں آئندہ خدا جانے علم و عمل کا کیا حشر ہو۔

کتب خانہ شیخ

حضرت شیخؒ کی اولاد میں ایک صاحب مولوی انوار الحق صاحب دہلویؒ ہیں جن کی حیات کا پتہ سنہ ۱۳۱۹ھ تک صاحب مراۃ الحقائق کے بیان سے چلتا ہے۔ ان کی تحویل میں جو کتب خانہ تھا اس میں سوائے تیرہ کتب کے جو بزمانۂ جنگ حریت ۱۸۵۷ء ضائع ہوگئیں۔ باقی تمام تصانیف شیخؒ موجود ہیں۔ ان تیرہ کتب غیر موجودہ کے اسماء یہ ہیں: (۱) آداب المطالعہ والمناظرہ (۲) اسماء الاستاذین (۳) افکار الصافیہ (۴) انتخاب المثنوی (۵) بناء المرفوع (۶) ترغیب اہل السعادات (۷) تعلیق الحاوی (۸) حاشیۃ الفوائد (۹) حسن الاشعار (۱۰) رسالہ نورانیہ سلطانیہ (۱۱) صحیفۃ المودۃ (۱۲) فصول الخطب (۱۳) نکات العشق۔

خدا معلوم ان کتابوں کی نقل بھی کہیں موجود ہے یا نہیں۔ اگر ان کتابوں میں سے کوئی کتاب کسی

صاحب کی نظر سے گذری ہو تو خاکسار راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔

کتب خانۂ مولوی انوار الحق صاحب دہلویؒ میں جو کتابیں حضرتؒ کی ہیں ان میں سے اکثر اسی عہد کی لکھی ہوئی ہیں۔ چند کتابوں پر حاشیہ بعض بعض جگہ حضرت شیخؒ کے قلم خاص سے لکھا ہوا ہے اور ایک کتاب انوار الجلیہ تو از اول تا آخر حضرتؒ ہی کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ہے۔ ان کتابوں میں سے بعض طبع بھی ہو گئی ہیں مگر اکثر کتب ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

کثرت مشاغل

منشی محمد امین مصنف ''شاہجہان نامہ'' نے حضرت شیخؒ کے جو کچھ حالات لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے'' بالفعل ۱۰۴۷ھ میں حضرت شیخؒ کی عمر نوے برس کی ہوگئی ہے۔ باوجود اس کے آپ کے حواس ظاہری و باطنی سلامت ہیں۔ عبادات، اوراد، ذکر، تلاوت قرآن شریف اپنے بچوں اور شاگردوں کی تعلیم اور کتابوں کی تصنیف و تصحیح میں ایام جوانی کی طرح مشغول ہیں۔''

وفات

حضرت شیخؒ نے ۲۱/۲۲ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کی درمیانی شب میں چورانوے سال دو ماہ کی عمر پا کر وفات پائی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ کے احاطۂ مزار کے قریب مدفون ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا نور الحقؒ صاحب دہلوی شیخ ثانیؒ نے حسب وصیت ایک کتبہ مزار پر نصب کرایا جس میں مختصر حالات زندگی درج فرمائے۔

اولاد

حضرت شیخؒ کے غالباً تین صاحبزادے تھے جن میں بڑے شیخ ثانی مولانا نور الحق صاحب دہلوی تھے۔ یہ نہایت ذی علم، صاحب تصنیف اور باپ کی نظروں میں عزیز تھے۔ چنانچہ حضرت شیخؒ نے وصیت نامہ میں ان کو اپنا وجود ثانی تحریر فرمایا ہے۔ حضرت شیخؒ کے جانشین بھی ہوئے آپ کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا

لیکن توجہ علم دین کی طرف زیادہ منعطف رہی۔ حکومت برطانیہ سے پہلے پہلے حضرت شیخ کی اولاد میں صاحب تصانیف اور متبحر علماء ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت خاندان شیخ میں میراث پدر کی طرف کتنی رغبت ہے۔ اس کا حال نہیں معلوم البتہ مراۃ الحقائق کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ۱۳۱۹ھ تک حضرت شیخ کے اخلاف میں ۹۲ ذکور خورد و کلاں موجود تھے۔ جن کے مختصر حالات زندگی بھی لکھے گئے ہیں۔ لیکن میراث شیخ کو تلاش کیا ان میں ایک تو مولوی انوار الحق صاحب دہلوی کو عالم و فاضل پایا اور دوسرے مولوی محمد مظہر الحق ابن محمد وحید الحق کو دار العلوم دیوبند کا فارغ التحصیل دیکھا۔ باقی سب کے سب یا تو انگریزی کی انتہائی تعلیم پائے ہوئے ملے یا اردو فارسی کے جاننے والے۔

افسوس کے اب بزرگوں کے قلمی کارنامے اخلاف کی بے توجہی کی وجہ سے فنا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ شکسپیر اور برکلے کی تصانیف کے شوق میں ان کے جواہر پاروں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اسلاف نے خون پسینہ ایک کرکے جن کتابوں کو اعلیٰ مضامین اور خوشخط حروف میں لکھا تھا وہ کتابیں دیمک کی خوراک بنی ہوئی ہیں۔ ہم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ان کتابوں کو دھوپ دے دیں یا حفاظت کی غرض سے ورق گردانی کرلیں۔ انقلاب زمانہ اسی کو کہتے ہیں۔

اعتمادے نیست بردورِ جہاں بلکہ ایں گردونِ گرداں نیز ہم

امروہہ کے چند اکابر خاندان چشتیہ صابریہ

آخر شعبان میں دیوبند حاضر ہوا تھا وہاں صاحبزادہ سید محمد ازہر شاہ قیصر[1] سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ میرا مضمون اُن بزرگوں کے حالات پر ہوگا جن کا تعلق میرے وطن امروہہ سے ہے۔ میں رمضان ہی میں اس وعدے کی تکمیل کر دیتا لیکن رمضان میں یہ مضمون مرتب نہ ہو سکا۔ شوال میں مدرسہ کے مشاغل سامنے آئے اور یہ کام معرض [illegible] میں [illegible] صاحبزادے کے والا نامجات یاددہانی اور تقاضے سے [illegible] توجہ دلاتے رہے۔ مجبوراً وقت نکال کر وعدہ پورا کرنا پڑا۔

[1] [illegible] حضرت علامہ انور شاہ محدث کشمیری کے [illegible] تھے۔ آپ کی وفات ۲ نومبر ۱۹۸۵ء میں [illegible]

سب سے پہلے یہ عرض کردوں کہ اس مضمون کا محرک اول یہ خیال ہوا کہ چونکہ ہمارے اکابر علماء دیوبند جہاں علم حدیث میں بواسطۂ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت امام بخاریؒ سے تعلق رکھتے ہیں وہاں صحیح مسلک حنفیت اور طریقۂ اہلِ سنت و جماعت پر قائم رہتے ہوئے اُن کا روحانی رشتہ حضرت خواجہ اجمیریؒ سے بھی متصل ہوتا ہے اور وہ۔ ع

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

کے پورے پورے مصداق ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُن کے متوسلین ان بزرگان دین سے بھی واقف ہوں جو روحانی زنجیر کی مقدس کڑیاں ہیں۔ سب سے زیادہ اچھا تو یہ ہوتا کہ میں حضرت خواجہ اجمیریؒ سے لے کر بعد کے تمام حضرات سلسلہ کا تذکرہ لکھتا، لیکن میری سہل پسند طبیعت نے صرف ان بزرگوں پر اکتفاء کرلیا جن کا تعلق امروہہ سے ہے یوں بھی امروہہ سے اوپر کے حضرات بہت معروف و مشہور ہیں اور اُن کے حالات آسانی سے کتب سیر سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میں نے اُن بزرگانِ امروہہ کے حالات مرتب کرنے میں امکانی محنت کی ہے۔ مقاصد العارفین قلمی (مصنفہ حضرت شاہ عضدالدین جعفری امروہیؒ) مفتاح الخزائن (مرتب نثار علی بخاریؒ) انوار العارفین (مؤلفہ حافظ محمد حسین مرادآبادیؒ) نخبۃ التواریخ (مولوی آلِ حسن نخشی امروہیؒ) شمائم امدادیہ (مترجمہ محمد مرتضیٰ خاں قنوجیؒ) ''قصائد قاسمی'' تذکرۃ الکرام (مؤلفہ مولوی محمود[1] احمد عباسی) مقدمہ مآثر الکرام (ڈاکٹر عبد[2]الحق) بیاض شاہ حاتمؒ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالباری امروہیؒ قلمی) اجوبتہ الفوائد قلمی (مؤلفہ بہلول ابنِ مرزا خاں برکی ثم جالندھری) شجرات نظم ونثر (مرتبہ حکیم شبیہ[3] احمد صدیقی امروہی) اور خاندانِ شاہ عضدالدین صاحب امروہیؒ کی چند دستاویزیں اور مختلف یادداشتیں سامنے رکھ کر اور ان میں تلاش وجستجو کرکے اس مضمون کو مرتب کررہا ہوں۔ کوشش کرونگا کہ ہر بزرگ کے حالات میں ضروری باتیں آجائیں زیادہ تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ جن بزرگوں کا اس مضمون میں مستقلاً تذکرہ کیا جائے گا۔

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو یہ سب صاحبان بقید حیات تھے۔ عباسی صاحب کا انتقال ۱۲ر مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں ہوا۔ وہیں کی سکونت اختیار کرلی تھی۔ [2] بابائے اردو عبدالحق کا ۱۹۶۱ء کراچی میں انتقال ہوا۔ [3] حکیم شبیہ احمد صاحب صدیقی کا انتقال ۷ محرم ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۴ر جولائی ۱۹۵۹ء میں حیدرآباد میں ہوا اور وہیں تدفین ہوئی۔ زبدۃ الحکماء کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ملی تھی۔ (محب الحق)

اُن کے اسماء حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت شاہ محمدی فیاض جعفری ہرگامی ثم امروہیؒ (۲) حضرت شاہ محمد حامد جعفری ہرگامی ثم امروہیؒ (۳) حضرت شاہ عضدالدین جعفری امروہیؒ (۴) حضرت شاہ عبدالہادی صدیقی امروہیؒ (۵) حضرت شاہ عبدالباری صدیقی امروہیؒ۔

حضرت شاہ محمدی فیاض جعفری ہرگامی ثم امروہیؒ

شیخ عیسیٰ ہرگامیؒ کے فرزند تھے۔ محمدی نام ہے اور فیاض دہر بعد کو لقب ہوا۔ نسباً جعفری الزینبی ہیں۔ ۱۴ر شوال ۱۰۲۱ھ کو عالمِ وجود میں آئے، قطعہ ذیل کے آخری مصرعے سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے:

در جہاں آفتاب پیدا شد ☆ ذرہا در ہواش شیدا شد
سال تاریخ جلوہ اش بوجود ☆ قدوۃ الکاملین ہویدا شد

اُن کے تین بھائی اور تھے شاہ محمد حامدؒ، شاہ عبدالخالقؒ، شاہ عبدالجلیلؒ یہ سب بھائی باکمال اور اہل اللہ تھے۔ ہر یک از یشاں آراستہ بکمال حال وقال بودہ۔ (نخبۃ التواریخ)۔

شیخ عیسیٰ ہرگامیؒ کا دستور تھا کہ جہاں کوئی درویش سُن پاتے اس کی خدمت میں جاتے، اُس کے پاس کھانا لیجاتے اور اُس کی دعا حاصل کرتے تھے۔ راتوں کو بھوکوں، درماندوں، غریبوں کی خبر گیری کرتے اور پوشیدہ طریقہ پر اُن کے گھروں میں روٹیاں اور زرِ نقد پہنچاتے تھے۔ جس کسی درویش سے دعا کی استدعا کرتے تو یہ خاص مقصد پیش کیا کرتے تھے کہ ''اولادِ من بمرادِ حقیقی و مدعائے نفس الامری فائز گردند و بصلاحیت وتقویٰ و علم معنی معروف و بعقل معاد موصوف باشند'' یعنی میری اولاد مرادِ حقیقی کو پہنچ جائے اور وہ صلاحیت وتقویٰ اور علم سلوک میں معروف اور عقل معاد سے موصوف ہو۔

کیسا اچھا مقصد اور کیسی اچھی دعا تھی اور کس قدر کامیاب ہوئی کہ آج تک دنیا ان کے صاحبزادوں کے تقویٰ اور علم معنی سے راہ یاب و فیض یاب ہو رہی ہے اور نہ صرف وہ عقل معاد سے موصوف ہوئے بلکہ بعد کو

آنے والا گروہ کثیر (جن میں ہندوستان اور حجاز و مصر وغیرہ کے متوسلین شامل ہیں) آخرت کی فکر میں منہمک ہو کر مطلوب حقیقی سے ہمکنار رہوا۔

مقاصد العارفین اور مفتاح الخزائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ محمدی فیاضؒ نے بالغ ہونے تک علم کی طرف توجہ نہیں کی، بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے والد کو اس کا بڑا غم تھا اور یہ کسی طرح اپنی آزاد مزاجی سے باز نہیں آتے تھے، آخر ایک دن اُن کے باپ نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ کے خوب تنبیہ کی اور خوب ڈانٹا۔ بس اُس دن سے اُن کی غیرت جوش میں آئی، علومِ عربیہ کی تحصیل میں کوشش کی اور تھوڑے ہی عرصے میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ بعدہٗ علم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور زبدۃ المحققین شیخ کبیر محبّ اللہ الٰہ بادی قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں پہنچے اور بیعت ہوئے، چودہ سال تک اُن کی خانقاہ میں رہے اور اعلیٰ مدارج روحانی پر فائز ہوئے، پیر کو اس مرید پر کتنا اعتماد تھا اور مرشد نے اپنے اس فیض یافتہ کا کیا مرتبہ سمجھا تھا اس جملے سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ شاہ عضد الدینؒ کی زبانی سنیے:

روزے شیخ بکمال التفات فرمود که محبّ الله اگر پیر خودراندیدے و محمدی رابدیں کمال که دارد یافتی ارادت بوے آوردے (مقاصدلعارفین)	ایک دن شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادیؒ نے بکمال التفات فرمایا کہ اگر محبّ اللہ (میں) اپنے پیر کو نہ دیکھتا اور محمدی کو اس کمال پر جو وہ رکھتا ہے پاتا تو اسی سے مرید ہو جاتا۔[1]

[1] کچھ اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے بھی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے بارے میں ''ضیاء القلوب'' میں بضمن کلمات پند و نصائح تحریر فرمایا ہے:

''ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہٗ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند اگر چہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من و من بمقام اوشاں شدم و صحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زماں نایاب اند (ضیاء القلوب مطبع مجتبائی ص ۱۰۱) (فریدی)

حضرت شیخ محب اللہ آلہ بادیؒ کے اور بھی چند خلفاء تھے لیکن جس قدر سلسلہ کا شیوع شیخ محمدی فیاضؒ سے ہوا اور کسی سے نہیں ہوا آپ نے ع

رو بردرِ محبوبے شو محرمِ اسرارے

کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ طویل عرصہ تک اپنے شیخ کے قدموں سے جدا نہ ہوئے۔ چودہ سال، کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ اپنے والد صاحب سے ملنے کے لئے اپنے وطن (ہرگام ضلع سیتاپور) آئے تھے، پھر والد سے ملاقات نہ ہوسکی، ان کے والد اپنے بیٹے کے غلغلۂ کمال، شہرۂ فضل اور دولت معنیٰ کی بہم رسانی کو سُن سُن کر خوش ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں سجدۂ شکر ادا کرتے تھے، والد کے انتقال کے بعد وطن پہنچے، لیکن چونکہ ان کا مستقر خلافت اکبر آباد (آگرہ) تھا اس لئے وطن میں قیام نہیں فرمایا۔

۱۰۵۸ھ میں پیر و مرشد کا وصال ہوگیا ۱۰۶۰ھ میں یہ آگرہ پہنچے کثیر تعداد میں شہر کے سربرآوردہ اشخاص اور عمال سلطنت حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، اس کے چند سال بعد محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اس وقت حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کا دریائے ارشاد و ہدایت آگرہ میں بڑی تیزی سے موجیں مار رہا تھا اور اُن کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ یہ ترقی دیکھ کر، گندم نما جو فروش قسم کے صوفیوں کو حسد پیدا ہوا اور ان حاسدین نے آپ پر دہریت اور بے دینی کا اتہام لگا کر بادشاہ کو بدظن کرنا شروع کیا۔ آخر کار یہ فتنہ بڑھتا چلا گیا آپ نے ایسے موقع پر مناسب خیال کیا کہ کچھ عرصہ کے لئے آگرہ کو خیر باد کہہ دیں اور ہندوستان کا ایک طویل سفر کریں۔ چنانچہ آپ آگرہ سے روانہ ہوکر دہلی، پانی پت، کرنال، گنگوہ ہوتے ہوئے مرادآباد تشریف لائے۔ جس شہر اور قصبہ میں کسی صاحبِ کمال کی شہرت سُنتے وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ مرادآباد میں معلوم ہوا کہ امروہہ میں قدوۃ الواصلین سید عبدالحکیم قدس سرہٗ خلیفہ حضرت شیخ عبدالمجید قدس سرہٗ کا وجود گرامی قابل ملاقات ہے۔ چنانچہ امروہہ آئے۔ امروہہ آکر شاہ ولایتؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور پھر سید عبدالحکیمؒ سے ملاقات کی، آپس میں خوب راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، یہاں پر بہت سے اکابران کی جانب متوجہ ہوئے اور حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے، آپ یہاں سے آگرہ پہنچے۔ اس کے بعد دوبارہ امروہہ

آنا ہوا۔

تیسری مرتبہ ۱۱۷۱ھ میں سید عبدالحکیم امروہیؒ کی خبر وفات سُن کر امروہہ تشریف لائے۔ اب کی مرتبہ زیادہ عرصہ آپ نے قیام فرمایا۔ اس دفعہ جمیع اکابر واصاغر نے جو آپ کے حلقہ بگوش تھے مل کر یہ درخواست پیش کی کہ ''حضرت والا قصبہ امروہہ میں رشتۂ مناکحت قائم کرلیں اور یہیں سکونت پذیر ہو جائیں'' یہ درخواست قبول ہوئی۔

شیخ فیض اللہؒ برادر حقیقی وخلیفہ سجادہ نشین شاہ عبدالمجید امروہیؒ کی دو صاحبزادیاں تھیں ان میں سے ایک حضرت شیخؒ کے نکاح میں آئیں اور کچھ عرصہ بعد دوسری صاحبزادی حضرت شیخؒ کے بھائی شاہ محمد حامدؒ والد شاہ عضد الدینؒ کو منسوب ہوئیں۔ اس طرح ہرگام کے ایک جعفری خاندان کے دو بزرگوں کے امروہہ سے وابستہ ہونے کی صورت پیدا ہوئی۔

حضرت شیخؒ نے اس رشتۂ مناکحت کی بنا پر امروہہ میں سکونت اختیار کر لی اور ایک مسجد اور چند مکانات تعمیر کرائے چنانچہ امروہہ کا ایک پورا محلہ محمدی سرائے کے نام سے موسوم ہے۔

اس رشتہ کے بعد سے آپ کا معمول تھا کہ کچھ عرصہ امروہہ کچھ عرصہ دہلی اور کچھ دنوں اپنے مستقر الخلافت (آگرہ) قیام فرماتے تھے اور سیر وسیاحت میں بھی رہتے تھے۔

حاسدین کی فتنہ انگریزی

حضرت شیخؒ کی روز افزوں شہرت اور قبولیت کو دیکھ کر حاسدین کی رگ حسد پھر جوش میں آئی اور انھوں نے اپنی آتش حسد کو تیز سے تیز تر کر دیا، حضرت شیخ توحید وجودی کے قائل تھے اور یہ عقیدہ صرف قال تک محدود نہ تھا بلکہ ان کا حال تھا۔ وہ شیخ محب اللہ الہٰ آبادیؒ کے دیرینہ صحبت یافتہ اور برگزیدہ خلیفہ تھے اور شیخ الہٰ آبادیؒ کی یہ خصوصیت مشہور ومعروف ہے کہ وہ اپنے وقت کے شیخ اکبر ثانی تھے جیسا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس خصوصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے

بحقِ بحرِ مواجِ معانی ☆ محب اللہؒ محی الدینؒ ثانی

حاسدین کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ وجودی مسلک کی نازک باتوں کو توڑ مروڑ کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیں۔ مگر اس کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ داراشکوہ سے ساز باز کا الزام بھی لگایا۔ نافہمی اور حسد و بغض سے مجبور ہو کر بادشاہ وقت سے باتیں لگائیں اور خوب اچھی طرح شیخ کے خلاف پروپگنڈہ کر کے ایک طوفان عظیم برپا کر دیا۔

حج بیت اللہ

اس موقع پر حضرت شیخ نے زیارت حرمین شریفین کا قصد کیا۔ چنانچہ ۱۰۹۰ھ میں آپ روانہ ہوئے دو سال آپ مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے دو حج ادا کئے، بعدہٗ مدینۃ الرسول پہنچے ۱۰۹۵ھ میں ہندوستان واپس آئے۔

اس سفر میں آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ہمراہ تھیں، زمانہ قیامِ مکہ میں ایک فرزند پیدا ہوئے جن کا نام محمد مکیؒ رکھا گیا۔ قیام مدینہ کے زمانہ میں بھی ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام نامی روشن محمد مدنیؒ رکھا۔

حجاز سے واپسی پر پھر وہی فتنہ

واپس آنے پر مخالفین کی فتنہ انگیزی اور دراندازی بدستور باقی رہی بلکہ اور زیادہ بڑھ گئی: اس مرتبہ رسالہ تسویہ مصنفہ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ بھی معرض بحث میں آیا۔ عالمگیرؒ جو ایک دیندار اور پابند شرع بادشاہ تھے، ان کے مزاج کو برہم کرنے کے لئے اچھے اچھے سامان بہم پہنچائے گئے مگر واہ رے استقلال کہ قدم ذرا نہیں ڈگمگایا اور مخالفین کے تمام تیروں کا نشانہ اپنے سینۂ بے کینہ کو بنایا۔

رسالہ تسویہ پر ہنگامہ

اس موقع پر مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے مقدمہ مآثر الکرام کی عبارت بحذف چند سطور پیش کر دی جائے تاکہ اس تاریخی واقعہ سے ناظرین کو یک گونہ آگاہی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے "تسویہ" کی ایک عبارت کو پیش کر کے جو بحث کا دروازہ غلط طریقہ پر کھولنا چاہا ہے میں اس وقت اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔

"آزاد نے حسب عادت میر سید محمد الترمذی کے تذکرے میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کی کتاب

تسویہ کا اچٹتا ہوا ساذکر کردیا ہے، لیکن اس کتاب کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور اس لئے ہم اُسے یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں، اس سے ایک تو یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ اورنگ زیب انار اللہ برھانہٗ کو جزئیات پر بھی ایسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر، دوسرے یہ معلوم ہوگا کہ بعض باخدا لوگ ایسے بھی موجود تھے کہ وہ اورنگ زیب جیسے سخت گیر اور پر جلال شہنشاہ کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، تیسرے اس سے دینیات کے ایک معرکۃ الآرا مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہٰ آبادیؒ کی تصنیف سے ہے جو ایک درویش اور صوفی تھے۔

جب یہ رسالہ (جو عربی زبان میں ہے) شاہ اورنگ زیب کی نظر پڑا تو انکار عظیم کیا، شیخ محب اللہ اس زمانہ میں رحلت کر گئے تھے، لیکن اُن کے مریدوں میں سے دو شخص پایۂ تخت میں موجود تھے۔ ایک میر سید محمد جو ملازم شاہی اور امرائے دربار میں سے تھے، دوسرے شیخ محمدی فیاضؒ جو لباس درویشی و زہد میں تھے، اوّل بادشاہ نے میر سید محمد سے "تسویہ" کی اس عبارت کی شرح دریافت کی "سید نے شیخؒ کی مریدی سے انکار کر دیا"۔ بعدازاں شیخ محمدی فیاضؒ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تمہیں شیخ کی مریدی کا اقرار ہے تو احکامِ شرع سے اس رسالہ کے مقدمات کو مطابق کر کے بتاؤ اور اگر مطابق نہیں کر سکتے تو اس کی مریدی سے استغفار کرو اور کتاب کو آگ میں ڈال دو۔

شیخ محمدی فیاضؒ نے جواب دیا کہ "نہ مجھے اُن کی مریدی سے انکار ہے نہ استغفار کی ضرورت لیکن جس مقام سے کہ شیخؒ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہے جس وقت میں اس رتبہ کو پہنچ جاؤں گا تو آپ کی درخواست کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجوں گا اور اگر بادشاہ نے اس رسالہ کا جلانا ٹھان لیا ہے تو اس فقیر متوکل کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے، حکم دیا جائے کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں دستیاب ہوں آگ میں جھونک دی جائیں۔ بادشاہ اس جواب کو سنکر ساکت رہ گئے۔

(مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴۔۱۵۔۱۶ بحوالہ مرآۃ الخیال قلمی کتب خانہ آصفیہ دکن ص ۶۶ و مآثر الامراء جلد سوم ص ۶۰۶ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کلکتہ)

وفات

عالمگیر بادشاہ نے ایک مدت تک شیخ کو دہلی میں محبوس رکھا بعدازاں قلعہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں مقید کر دیا۔ ۳/رجب ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۶۷ء میں وفات پائی اور تابوت آگرہ لایا گیا اور وہاں دفن کئے گئے، حضرت شاہ عضدالدینؒ نے قطعہ تاریخ لکھا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ع

گفت بگوش دل من کس زغیب ☆ قطب زماں رفت سوئے لامکاں

آپ کے مزار کی نشان دہی کرتے ہوئے صاحب تذکرۃ الکرام لکھتے ہیں۔

"مزار شریف محلّہ ہینگ منڈی آگرہ میں لب سڑک واقع ہے پہلے یہاں عالیشان عمارت اور خانقاہ بنی ہوئی تھی امتداد انقلابات زمانہ سے تمام عمارت مسمار ہوکر مزار بھی ایک مکان کے اندر آ گیا تھا۔"

"صاحبِ بوستان خیال" لکھتے ہیں: چند سال ہوئے شاہ بخاریؒ نے مکان مذکورہ خرید کردالان واحاطہ بنوادیا ہے۔"

اولاد

حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کے جیسا کہ اوپر لکھا گیا دو صاحبزادے تھے جو بزمانہ قیام حجاز عالمِ وجود میں آئے تھے۔(۱) شیخ محمد مکی (۲) شیخ روشن محمد مدنی

طب کی مشہور کتاب قرابادین جلالی (جو مطبع نولکشور میں طبع ہو چکی ہے) کے مؤلف مولوی حکیم جلال الدین امروہیؒ (شاگرد حکیم علوی خاں دہلویؒ) شیخ محمد مکیؒ کے صاحبزادے اور شیخ محمدی فیاضؒ کے پوتے تھے۔

مریدین وخلفاء

آپ سے جن بزرگوں نے استفادہ کیا اُن کی تعداد کثیر ہے لیکن اُن میں اہم شخصیتیں یہ ہیں (۱) آپ کے برادرِ ثانی حضرت شاہ عبدالجلیل جعفریؒ جو پہلے شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ سے بیعت ہوئے، ان

کی وفات کے بعد تکمیل سلوک آپ سے کی۔ (۲) آپ کے برادر سوم حضرت شاہ محمد حامد جعفریؒ (۳) آپ کے برادر زادے حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفریؒ تھے۔

عادات وخصائل

آپ کی مجلس میں خدا اور رسول ﷺ اور آیات واحادیث اور اقوال بزرگان کا ذکر ہوتا دنیاوی اذکار بہت کم ہوتے۔ سائل کے سوال کو پورا کرنا سب سے مقدم خیال کرتے ہر شخص کا جواب عام فہم اور اسی کی زبان میں دیتے، ہمیشہ دوزانو بیٹھتے اور احترام قبلہ کا خیال رکھتے، کبھی کشف وکرامات کا تذکرہ زبان پر نہ لاتے اہل دل کو بہت دوست رکھتے اور اہل علم کا بہت احترام فرماتے۔ جو لوگ آپ کو صاحب قال کہتے اور صاحب حال نہ کہتے ان سے بہت خوش ہوتے اور فرماتے "الحمد للہ کہ لوگ مجھے صفت کلام سے متصف کرتے ہیں، ہر نماز کے لئے تجدید وضو کرتے اور نصف شب کے بعد طاعتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے، نماز باجماعت ادا فرماتے، اکثر خود ہی امامت کرتے، ہمیشہ صرف ایک وقت کھانا تناول فرماتے اور وہ بھی محض اس لئے کہ قوت وتوانائی باقی رہے۔ (تذکرۃ الکرام ص ۱۰۶)

حضرت شاہ محمد حامد جعفری امروہیؒ

سید عیسیٰ جعفری ہرگامیؒ کے صاحبزادے، شاہ محمدی فیاضؒ کے برادر حقیقی ہیں۔ ۹ ربیع الثانی ۱۰۲۹ھ کو ہرگام میں پیدا ہوئے، مولانا سید عظمت اللہ بن مولانا فضل اللہؒ سے جو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اخذ علوم کیا، اپنے بھائی شاہ عبدالجلیل سے بھی پڑھا باطنی علوم کا سرمایہ حضرت شیخ محب اللہ الٰہ آبادیؒ کے فیض صحبت سے حاصل کیا، رموز تصوف میں ایک رسالہ آپ کی تصنیف ہے۔

۱۰۷۳ھ میں اپنے بڑے بھائی حضرت شاہ محمدی فیاضؒ سے امروہہ آکر مدارج سلوک طے کئے اور ان کے مجاز وخلیفہ ہوئے، شیخ فیض اللہ علوی امروہیؒ کی دختر سے عقد نکاح ہوا۔ اس رشتہ کی وجہ سے امروہہ میں آپ نے سکونت اختیار کی۔ حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفریؒ آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

حضرت شاہ محمد حامدؒ امروہہ سے ہر سال اپنے بھائیوں شاہ عبدالجلیل وشاہ عبدالخالقؒ سے ملنے ہرگام جایا کرتے تھے ۱۱۱۸ھ میں وہیں گئے ہوئے تھے کہ انتقال فرمایا، دخل الجنۃ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ایک ضروری تصحیح

ہمارے تمام اکابر شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے لے کر مرشدنا وشیخنا شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ تک کے مطبوعہ شجروں میں حضرت شاہ محمدی فیاضؒ اور حضرت شاہ عضدالدینؒ کے درمیان شاہ محمد مکیؒ ایک نام ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہ عضدالدینؒ کے پیرومرشد ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ عضدالدین صاحبؒ براہِ راست حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کے بھی خلیفہ ہیں اور اپنے والد ماجد حضرت شاہ محمد حامدؒ سے بھی بیعت ہیں، اس لئے یہ درمیانی نام شاہ محمد حامد ہونا چاہئے نہ کہ شاہ محمد مکیؒ، اس کے متعلق حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے خاندان کے ایک فرد حکیم شبیہ احمد صاحب صدیقی امروہی نے شجراتِ نظم ونثر میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ''شجرات خاندان حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ وحضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ میں عموماً حضرت شیخ محمدی فیاضؒ کے اسم گرامی کے بعد حضرت محمد مکیؒ کا اسم مبارک ہے جس سے مراد فرزند حضرت شیخ محمدی فیاضؒ ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کے بعد آپ کے برادر خورد حضرت شاہ محمد حامد ہرگامیؒ کا اسم گرامی ہونا چاہئے جو حضرت شیخ عضدالدینؒ کے والد بزرگوار ہیں یہ ہردو (حضرت شاہ محمد حامد پدر اور حضرت شاہ عضدالدینؒ فرزند) حضرت شیخ محمدی فیاضؒ کے مرید وخلیفہ مجاز تھے جس کی تصدیق خود حضرت شیخ عضدالدینؒ کی تصنیف ''مقاصد العارفین'' سے ہوتی ہے، اندریں صورت اگر شیخ محمدیؒ اور شیخ عضدالدینؒ کے درمیان کوئی واسطہ نہ رکھا جائے تب بھی درست ہوسکتا ہے، مگر والد بزرگوار کا واسطہ رکھنا باعث خیر و برکت واولیٰ ہے۔'' (شجرات مطبوعہ ص ۶)

میں نے ذاتی طور پر تحقیق کی ''مقاصد العارفین'' قلمی، انوار العارفین، مفتاح الخزائن، ملفوظات وحالات شاہ عبدالہادیؒ کا مطالعہ کیا سب سے آخر میں حضرت شاہ حاتمؒ خلیفہ حضرت شاہ عبدالباریؒ کی قلمی بیاض دیکھی جو میرے رشتہ کے ماموں مولانا[1] شاہ سلیمان احمد صاحب چشتی سجادہ نشین حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے پاس موجود و محفوظ ہے اور جس کے متعلق غالب خیال یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالباریؒ کے زمانۂ حیات ہی میں وہ بیاض مرتب ہوگئی تھی۔ اس میں جہاں شجرۂ بیعت درج ہے صاف طریقہ پر بجائے شاہ محمد مکیؒ کے شاہ محمد حامدؒ لکھا ہوا ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ سلسلہ امدادیہ کے شجروں میں بجائے شاہ محمد مکیؒ کے حضرت شاہ محمد حامدؒ کا نام نامی درج فرمایا جائے۔

میں اس امر کو اپنے اکابر کے سامنے رکھنے میں یک گونہ شرم محسوس کرتا تھا، لیکن چونکہ یہ ایک تحقیقی بات تھی اور اس کا تعلق امروہہ سے ہے اس لئے میں نے اس کا اظہار ضروری سمجھا۔ سہواً ایک نام میں غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے اور بعد کو ہر وقت اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

شاہ عضدالدینؒ کا نام مبارک ہمارے اکابر کے یہاں مدتوں شاہ عزیز الدینؒ مشہور چلا آیا اور بعد کو اس کی تصحیح ہوئی جیسا کہ بیاض یعقوبی، نیز ضیاء القلوب مطبوعہ مجتبائی کے ۱۰۲ کے حاشیہ پر بایں الفاظ اس کا ذکر ہے:

> ''ان کا (شاہ عضدالدینؒ کا) نام پہلے عزیز الدین مشہور تھا۔ حضرت شاہ رحمٰن بخش صاحبؒ کے (جو شاہ عبدالہادیؒ کی اولاد سے ہیں، علاقے داروں سے معلوم ہوا کہ آپ کا نام عضدالدین ہے۔ لہٰذا سلسلوں میں بھی یہی نام لکھا گیا کہ وہ قرابت دار اور سلسلہ میں داخل تھے ان کو تحقیق ہوگی۔''

علاوہ ایں شیخ محمد مکیؒ کی عمر اپنے والد کی وفات کے وقت ۱۳۔۱۴ سال کی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اس عمر میں اپنے والد ماجد سے سلوک کی منازل کیسے طے کی ہونگی؟ پھر حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کے خاندان کی دستاویزات اور کاغذات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنے والد ماجد کے سجادہ نشین دوسرے صاحبزادے شیخ روشن محمد مدنیؒ تھے۔ اس لحاظ سے بھی شیخ محمد مکیؒ سلسلہ کے اندر نہیں آتے ہیں، لامحالہ یہ شاہ محمد

[1] مولانا شاہ سلیمان احمد صدیقیؒ نے جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ میں جملہ علوم کی تحصیل و تکمیل حضرت محدث امروہیؒ سے کی۔ ۲۳/رجب ۱۳۸۱ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔ (محب الحق)

حامدؒ ہیں۔ جن کے بجائے شیخ محمد مکیؒ کے نام کا اندراج سہواً ہو گیا ہے، حضرت شاہ عضدالدین ہرگز شیخ محمد مکیؒ سے بیعت نہیں تھے بلکہ بہت ممکن ہے کہ خود شیخ محمد مکیؒ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ عضدالدینؒ سے اخذ فیض کیا ہو، کیونکہ یہ عمر میں بھی اُن سے بہت بڑے تھے اور ان کے والد شاہ محمدی فیاضؒ سے براہ راست خلافت حاصل کر چکے تھے۔

حضرت شاہ عضدالدین محمد جعفری امروہیؒ

حضرت شاہ محمد حامد ہرگامی ثم امروہیؒ کے فرزند دلپند ہیں جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت شاہ محمد حامدؒ ۱۰۷۳ھ میں اپنے برادر بزرگ حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کے تعلق سے امروہہ آئے اور یہیں عقدِ نکاح کے بعد متوطن ہو گئے تھے۔ ۲۴/رجب ۱۰۷۷ھ کو شاہ عضدالدین محمدؒ امروہہ میں پیدا ہوئے۔

تحصیل علوم

فارسی و عربی کی تحصیل و تکمیل کے بعد سنسکرت زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہزاروں مشکلات اختیار کر کے بالآخر اُس میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ مؤلف تذکرۃ الکرام اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اُس زمانے میں کسی مسلمان کا سنسکرت زبان سیکھنا اور برہمنوں کا اپنی مقدس زبان کا کسی مسلمان کو سکھلانا آج کی بہ نسبت جس قدر دشوار تھا اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں.....مگر اس نوجوان جویائے علم کا عزم راسخ مُشکلات پر غالب آیا......اجودھیا اور بنارس کا سفر اختیار کیا۔ پنڈتوں سے سنسکرت زبان سیکھی اور عرصے تک مقیم رہ کر ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ سے واقفیت تام حاصل کی۔'' (تذکرۃ الکرام ص۱۲۲)

تصانیف

مقاصد العارفین[1]، دیوان عضدی اور ایک کتاب سدسرور بزبان سنسکرت آپ کی تصنیفات ہیں۔ مگر

---

[1] مقاصد العارفین کو ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مرحوم نے ایڈٹ کیا اور مقدمہ لکھا جسے نواب زادہ شوکت علی خان (ٹونک) نے شائع کیا۔ (محب الحق)

افسوس ان میں سے کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔ اب یہ کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی ہیں۔ مقاصد العارفین جو علم عقائد وتصوف میں ایک بیش بہا اور معرکۃ الآرا کتاب ہے اُس کا صرف ایک نسخہ ایک صاحب کے پاس امروہہ میں موجود ہے وہ بھی نہ معلوم دست بردِ زمانہ سے کس طرح محفوظ رہ گیا۔

اس کتاب کے مطالعہ کی سعادت احقر کو حاصل ہوئی ہے۔ بڑے اعلیٰ پایہ کی کتاب ہے، اس سے مصنف کے مبلغِ علم کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کو چند سال کی محنت کے بعد ۱۱۲۴ھ میں ختم کیا۔ اس تصنیف میں کس قدر عرق ریزی کرنی پڑی اُس کو خود ہی فرماتے ہیں:

هزار بار فرورفته ام بقصر محیط ☆ رسیده تا بکف این چند گوهران بسیط

''اس کتاب کی تصنیف کا سبب والد ماجد تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ محمدی فیاضؒ کی توجہ سے جو فیض حاصل کیا تھا اُس کی معاونت سے بعد وفاتِ شیخ چند مقدمات صوفیہ تحریر فرمائے تھے۔ اُن مقدمات کی شرح کا کام اپنے صاحبزادے کے سُپرد فرمایا۔ ۱۱۱۱ھ میں یہ کام سامنے آچکا تھا اور اس کے کرنے کا عزم بھی کیا لیکن بعض وجوہ سے عرصے تک یہ کام پورا نہ ہو سکا بالآخر والد گرامی کی تاکید مزید اور تحریک قوی سے مجبور ہو کر ۱۱۱۵ھ میں باقاعدہ اس کو شروع کر کے ۱۱۲۴ھ میں اختتام کو پہونچایا۔''

دیباچہ کتاب میں اسی حقیقت کو ظاہر فرما رہے ہیں:

''امابعد می گوید فقیر عضد الدین محمد امروہی ابنِ شیخ حامد ابنِ شیخ عیسیٰ ہرگامی کہ چوں والد گرامی مرا در خدمت شریف مجلس عالی قبلہ گاہ ارشاد پناہ شیخ محمدی ابن شیخ عیسیٰ ہرگامیؒ بیشتر ایام صحبت حاصل بود وانچہ معانی عالیہ از زبان آں قبلہ ظاہر می شد بر آئینہ صافی ضمیر پدر بزرگوار و دیگر آئینہ داران محفل آں آفتاب معرفت عکس انجلا می گرفت بعد وفات شیخ والدم سطور چند در تحقیق بعضے مقدمات صوفیہ نوشتہ بود۔ در سن یکہزار و یک صد و یازدہ (۱۱۱۱ھ) بایں کمترین حوالہ نمود تا بعبارت منضبط آں مقدمات را واضح نماید

ایں کمترین بحکم وصینا الانسان بوالدیہ احسانا۔ لاچار آمدہ عزم برآں گماشت کہ بزبان قلم آورد...... چوں والد مرا تاکید فرمود ناچار سن یکہزار و یک صد و پانزدہ کتابت کردم (۱۱۱۵ھ) و مقاصد العارفین نام نہادم و در سن یکہزار و یک صد و بست و چہارم اختتام یافت (۱۱۲۴ھ)''

دیوان عضدی کا بھی کوئی نسخہ اب امروہہ میں باقی نہیں ہے۔ احقر نے اس دیوان کے آخری ورق کی زیارت کی ہے جو مرادآباد سے ایک صاحب کو دستیاب ہوا تھا۔ اُس کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ کلام نظم پر بھی بڑی قدرت حاصل تھی۔ بعض غزلیں حافظ شیرازیؒ کی بعض غزلوں پر لکھی ہیں۔ عضدیؒ تخلص تھا۔ چند اشعار ایک قصیدے کے جو حمد پروردگار جل شانہ میں لکھا ہے نقل کرتا ہوں:

چہ یارا ذرۂ خاکی کہ نامش برزباں آرد — دریں پستی خیال، خود بر اوج آسماں آرد
خداوندے کہ در یک دم دو حرف کاف و نون او — ہزاراں کلمۂ قدرت بر اوراق عیاں آرد
کراتاب ثنائے او کہ گوید وصفِ توحیدش — اگر گوید ہماں باشد کہ عجز اندر بیاں آرد
ہمائے فرّ اجلالش شکار پشہ نتواں شد — کجا مور ضعیف آخر کہ کوہے در دہاں آرد

آپ کے اقوال و کرامات

اِس عنوان کے تحت مناسب سمجھتا ہوں کہ مؤلف تذکرۃ الکرام کی عبارت بجنسہ پیش کردوں:

''تعبیر رویاء میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ واقعات کے بارے میں جب کبھی پیشنگوئی کرتے پوری ہوتی۔ حاجی رفیع الدینؒ[1] (مرادآبادی) اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۶۰ھ میں مجھے امروہہ جانے کا اتفاق ہوا۔ شاہ عضد الدین محمدؒ کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا۔ اُن ایام میں روہیلوں کا تسلط ملک کٹھیر

[1] حاجی رفیع الدین فاروقی مرادآبادیؒ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے جوابات اور اپنے سوالات کو اسولہ واجوبہ کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔ تذکرہ بھی اُن کی ایک نایاب تصنیف ہے جواب واقعی نایاب ہوگیا ہے۔ خود اُن کے وطن میں باوجود تلاش کے اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔ معلوم ہوا ہے کہ نواب شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (فریدی)

(روہیلکھنڈ) کے اس حصہ پر ہو گیا تھا اور اُن کے جبر و تشدد کا ہر جگہ چرچا تھا۔ شاہ صاحبؒ کی مجلس میں بھی مخلوق خدا کی عام پریشانی کا تذکرہ ہونے لگا۔ اس وقت آپ نے مجھے (حاجی رفیع الدین مرادآبادی کو) مخاطب کر کے فرمایا کہ روہیلوں پر پھاگن کے مہینے میں آفت آئے گی۔ میں نے عرض کیا کس پھاگن میں؟ فرمایا امسال یا آئندہ کسی سال مگر پھاگن کے مہینے میں"....حاجی صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "بعد وفات شاہ صاحب سندھیا اور دوسرے سرداران قوم مرہٹہ نے شاہ عالم بادشاہ کو ساتھ لے کر ضابطہ خاں سے جنگ کی۔ پھاگن کے چند ہی دن گزرے تھے کہ ضابطہ خاں کو شکست ہوئی اور یہ ملک روہیلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔"

"ایک مرتبہ ایک جوگی جو کیمیا سازی میں مہارت رکھتا تھا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے تقدس و کمالات دیکھ کر گرویدہ ہو گیا۔ ایک دن اس نے اکسیر جس کے ذریعہ سے سونا بناتا تھا ایک بیل میں رکھ کر پیش کی اور سونا بنا کر بھی دکھلایا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے قبول کرنے سے ہر چند انکار کیا مگر جوگی کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ بیل اس کے ہاتھ سے لے کر خانقاہ کے طاقچہ میں رکھ دیا کئی سال بعد وہ جوگی پھر حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ بیل خاک و گرد میں آلودہ بدستور اُسی جگہ رکھا ہے اُٹھا کر دیکھا تو اکسیر بھی اُسی طرح موجود ہے۔ اُس نے دریافت کیا کہ اس کو کام میں کیوں نہ لایا گیا آپ نے فرمایا کہ بھائی ہمیں اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آگ جلانے اور تانبا گلانے کی فرصت کہاں؟ موت ہر وقت سر پر سوار ہے۔ مگر ہمارے پاس تمہاری اس اکسیر سے زیادہ قیمتی اکسیر موجود ہے جوگی نے اس اکسیر کا نسخہ معلوم کرنا چاہا آپ نے فرمایا: "قناعت" (تذکرۃ الکرام ص ۱۲۴، ۱۲۵)

وفات

۲۷ رجب ۱۱۷۲ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۷۵۹ء کو تقریباً سو برس کی عمر پا کر واصل بحق ہوئے۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے: قطعہ

کرد رحلت چو شاہ عضد الدینؒ ☆ بست و ہفتم رجب ز دارِ فنا
سالِ تاریخ او چو پرسیدم ☆ گفت ہاتف کہ شد بامرِ خدا

۱۱ ھ ۷ ۲

آپ کا مزار جامع مسجد، امروہہ کے قریب ہے مزار کے قریب ہی آپ کی خسپوش خانقاہ ہے جو کچی اینٹوں[1] کی بنی ہوئی ہے۔

اولاد اور خلفاء

آپ کی اولاد میں درویشی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اب سے پچاس ساٹھ برس بیشتر حضرت شاہ قیام الدین[2] جعفریؒ جو کہ صاحب جذب و حال بزرگ اور اس خاندان کے سجادہ نشین تھے۔ اُن کے کشف و کرامات کے سیکڑوں واقعات زبان زد خاص و عام ہیں۔

ان کو حضرت مولانا سید احمد حسنؒ محدث امروہی اور مولانا عبدالغنی صاحبؒ پھلاودی سے بہت زیادہ ربط تھا کبھی کبھی مدرسہ میں تشریف لے آتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

اُن کے جنازہ کی نماز حضرت محدث امروہیؒ نے ہی پڑھائی تھی۔ آج اس خاندان کا چشم و چراغ ایک نوعمر لڑکا یادگار ہے[3]۔

حضرت شاہ عضد الدینؒ کے مرید و مجاز بہت سے تھے مگر سب میں افضل و اشہر حضرت شاہ عبدالہادیؒ ہیں۔

حضرت شاہ عبدالہادی صدیقی امروہیؒ

آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ محمد حافظ ہے۔ آپ امروہہ محلہ قریشی میں ۱۴/رجب ۱۰۸۴ھ موافق ۱۶ جلوس عالمگیری بروز چہار شنبہ پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب اکتیس واسطوں سے حضرت محمد بن ابی بکر صدیقؓ سے متصل ہوتا ہے۔

بچپن اور آغاز شباب

مفتاح الخزائن میں ہے کہ آپ کے والد ماجد شیخ محمد حافظ سے (جو کہ رؤسا امروہہ میں سے تھے)

---

[1] اب پختہ عمارت بنی ہوئی ہے۔ [2] جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ کے دارالحدیث کی بنیاد حضرت محدث امروہیؒ نے آپ سے رکھوائی تھی۔ [3] نوعمر لڑکے سے مراد معین الدین جعفری عرف بابو میاں مرحوم ہیں جن کا انتقال ۸/رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۶/مئی ۱۹۸۷ء میں ہوا۔ اس وقت محمد مطلب جعفری سجادہ نشین ہیں۔ (محب الحق)

منقول ہے کہ شاہ عبدالہادیؒ چار سال کے تھے کہ ایک دن حضرت شاہ محمدی فیاضؒ بتقریب ضیافت ان کے والد کے مکان پر تشریف لائے فراغت طعام کے بعد نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب اُٹھے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگے۔ چونکہ حضرت شاہ محمدیؒ کی بصارت ظاہری کچھ کم ہو گئی تھی علاوہ ازیں استغراق بھی تھا۔ اس لئے سمت قبلہ سے کچھ ہٹ کر کھڑے ہوئے حضرت شاہ عبدالہادیؒ نے باوجود صغرسن کے اُن کا ہاتھ پکڑ کر صحیح طریقہ پر متوجہ قبلہ کر دیا۔ حضرت شیخ نے اس بات سے خوش ہو کر فرمایا:

''شیخ محمد حافظ خلف الصدق شما متقدائے عصر گردد عالمے را در طریقِ حق دستگیری نماید''۔

دادا پیر کے یہ الفاظ جو کہ متضمن بدعائے خیر تھے کس قدر مقبول ہوئے اُن کے مقتدائے عصر ہونے اور طریق حق میں دستگیری و رہنمائی کرنے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

قاسم العلوم و المعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے شجرۂ منظومہ میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کی اسی خصوصیت کا اظہار فرمایا ہے۔

بعبد الہادیٔ ہادیٔ پیراں ☆ امیر و دستگیرِ دستگیراں

تعلیم و تربیت

اُسی وقت سے ترک و تجرید کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ والد بزرگوار نے اس خیال سے کہ حصول علم معنوی سے حصول علم صوری ضروری ہے۔ ایک معلم کے پاس بٹھایا۔ مفرح القلوب اور گلستان کے دو باب تک پہونچے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ اتفاق سے معلم صاحب مکتب سے اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہوئے تھے اور سوائے حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے مکتب میں کوئی موجود نہ تھا۔ ناگاہ ایک درویش سائلوں کے لباس میں نمودار ہوا جس کو دیکھ کر آپ پر ایک قسم کا ہراس غالب ہوا۔ اُس درویش نے کھانے کی کوئی چیز منہ میں سے نکال کر آپ کو دی اور کہا کہ اس کو کھالے، آپ نے خوف کی وجہ سے بے تامل اس کو کھالیا۔ اس کے بعد وہ درویش نظروں سے غائب ہو گیا۔ اُس کا کھانا تھا کہ آثارِ وحشت آپ پر طاری ہو گئے۔ صحرانوردی کی ٹھان لی اور آشنا و بیگانہ سے بیگانہ ہو کر مسلسل تین شبانہ روز لاپتہ رہے۔ تلاش کر کے گھر لایا گیا۔ اُس کے بعد آپ کا یہ

معمول ہو گیا کہ دن بھر جنگل میں رہتے رات کو کسی وقت گھر آ جاتے۔ سولہ سال کی عمر تک یہی حالت رہی۔ والد ماجد نے یہ حال دیکھ کر اُن کی شادی کر دی تا کہ آثار وحشت کم ہوں۔ لیکن وارفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آخر کار پرگنہ شیر کوٹ کے ایک موضع کا انتظام کاشت آپ کی حسب خواہش آپ کے سپرد کیا گیا۔ وہاں پر آپ نے اپنی سیر چشمی اور سخاوت کے جوہر دکھائے اور محتاجوں کی رفع ضرورت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ یہاں پر بھی باوجود فراغت اور تنہائی کے آپ کے جوش دروں میں سکون پیدا نہیں ہوا۔ شاہ یتیم صحرائیؒ ایک مجذوب نواح امروہہ میں رہتے تھے اُن کی ہمراہی میں صحرانوردی میں مصروف ہو گئے اور ذوق وشوق کی کیفیات حاصل کیں۔ ایک دن شاہ یتیم صحرائیؒ نے اپنے پیران عظام کا سلسلہ بیان کر کے ان کو ہدایت کی کہ تم شاہ عضد الدین سے بیعت کر لو اُن کا سلسلہ اور میرا سلسلہ پانچ واسطوں کے بعد حضرت شاہ نظام الدین بلخیؒ پر ایک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ حضرت شاہ عضد الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے بیعت ہوئے اور انہیں کی صحبت اقدس میں رہنے لگے۔ یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن آدھی رات کا وقت تھا اپنے مرشد کے پاؤں داب رہے تھے اسی حالت میں عرض کیا کہ حضرت دعا فرمایئے کہ جاذبہ رحمت الٰہی مجھے قید خودی سے نجات دیدے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میاں تم بار علائق اپنے سر پر رکھتے ہو اور حرص کرتے ہو ہم جیسا بننے کی۔ یہ سُنکر نہایت لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت! میری تو یہ تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے سگانِ کوچہ حضرت کی مانند بنا دے۔ پیر و مرشد کے دل میں یہ الفاظ گھر کر گئے کمال عنایت سے آپ کو نوازا اور اپنا خلیفہ اور نائب مطلق بنایا۔

آپؒ کا ظاہری علم اگرچہ مختصر ہے مگر آپ کو علم لدنی حاصل تھا۔ وہ علم جو اولیاء اُمت محمدیہ کو منجانب

---

[1] حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ جن کے ذریعہ حضرت شاہ عبد الباریؒ کا نام عرب وعجم میں شہرت پذیر ہوا۔ اتفاق دیکھئے کہ اُن کی درسیات بھی مختصر ہیں۔ قرآن شریف حفظ کیا بعدہ مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ اُسی زمانہ میں چند مختصرات فارسی تحصیل فرمائے۔ کچھ صرف ونحو استاذ عصر سے حاصل کی اور مولانا رحمت علی تھانویؒ سے تکمیل الایمان شیخ عبد الحق دہلوی کی قرأت کی۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۰) اس کے باوجود علم لدنی کا حامل تھے

ایک شخص نے قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پوچھا کہ حضرت مخدوم عالم حاجی امداد اللہ صاحب عالم بھی ہیں اس کے جواب میں فرمایا کہ عالم ہونا کیا معنی ہمنے اُن کی ذات پاک کو عالم گر فرمایا ہے۔ نیز آپ کی آیات میں لکھتے ہیں ... اس وقت ... باقی اگلے صفحہ پر

اللہ نصیب ہوتا ہے۔ علم سینہ کی مدد سے آپ عجیب عجیب رموز و معارف بیان فرمایا کرتے تھے۔ سچ ہے

صد خانہ پر از کتاب کارے ناید باید کہ کتاب خانہ در سینہ بود

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ جو کہ علم باطنی کے ساتھ علم ظاہری میں بھی درجہ کمال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ سنبھل تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کا قیام اُس زمانے میں موضع براہی (پرگنہ سنبھل) میں تھا۔ آپ نے سنبھل پہنچ کر حضرت مرزا صاحبؒ سے ملاقات کی۔ دورانِ ملاقات میں حضرتؒ نے کلام پاک اور بعض احادیث کے جو مطالب بیان فرمائے ان کو سنکر مرزا صاحبؒ کو آپ سے خاص اُنس ہو گیا۔ ایک مرتبہ مرزا صاحبؒ دہلی سے موضع براہی بھی تشریف لائے۔

شاہ عالم بادشاہ کی عقیدت

نواب امین الدولہ سنبھلی اور مرزا اکبر علی خاں کو آپ سے بہت عقیدت تھی ان حضرات نے آپ سے شاہ عالم بادشاہ کی طرف خاص توجہ فرمانے کی استدعا کی اُس زمانے میں بادشاہ بہت متفکر تھے سلطنت زیر و زبر ہو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بادشاہ میرے نصائح پر عمل کریں گے تو کیا عجب ہے کہ حالات درست ہو جائیں اور سلطنت مضبوط ہو جائے اور اگر ان نصائح پر عمل پیرا نہ ہوں گے تو اس سے زیادہ تباہی و بربادی ہوگی۔

صاحب مفتاح الخزائن[1] نے اس سلسلہ کی مراسلت اور شاہ عالم کے دو خط (جن میں اظہارِ عقیدت

گذشتہ سے آگے ...... مکہ معظمہ میں زیارت حضرت ایشان سے شرف اندوز ہوا بوجہ تہیدستی دین و دنیا کچھ نہ پیش کر سکا۔ بجز اس کے کہ ان ہی اوراق سیاہ مسودہ کو پیش کر کے رسم پیش کش بجالایا ...... یہ تمام نور افشانی بدولت اسی شمس العارفین (حاجی صاحبؒ) کے ہیں اور اس جگہ بھی مثل زبان و دست و قلم واسطہ ظہور مضامین مکنونہ دل عرش منزل حضرت ایشاں ہوا ہوں۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۸)

راقم مسکین (مؤلف شمائم امدادیہ) نے اکثر زبان حق ترجمان سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا جیسے مولانا روم کو زبان حضرت شمس تبریز قدس سرہٗ کی بنایا تھا۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۸) فریدی

[1] یہ کتاب ۱۲۲۸ھ میں نثار علی بخاری بریلوی مصنف نشاۃ رنگین نے حضرتؒ کے خلیفہ نزہت شاہ کی فرمائش پر ترتیب دی۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں برکات عبدیہ خوارق بادیہ کے نام سے یہ کتاب حافظ ممتاز الرحمٰن صاحب مرحوم نے شائع کر کے مفت تقسیم کی۔ فریدی)

وعرض مدعا ہے) من وعن درج کردئے ہیں۔

نواب دوندے خاں کی عقیدت

نواب دوندے خاں آپ کے کمالات کا شہرہ سنکر ملاقات کے مشتاق تھے۔ آپ کو بسولی بلانے کی ہر چند کوشش کی لیکن آپ وہاں تشریف نہیں لے گئے پھر سید علی اعظم خان امروہی کے اصرار پر تشریف لے گئے۔ قیام بسولی کے زمانہ میں دوندے خان درد قولنج میں مبتلا ہوئے۔ سخت تکلیف تھی اطباء ومعالجین علاج وتدابیر کرتے کرتے عاجز آگئے۔ آپ حسب درخواست نواب کی محلسرائے میں تشریف لے گئے۔ جیسے ہی نواب دوندے خاں کے بالمقابل ہوئے درد کا پتہ نہ تھا۔

لکھنؤ کا سفر

ایک مرتبہ بعض معتقدین کی درخواست پر آپ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اکبری دروازہ میں آپ کا قیام ہوا۔ لکھنؤ میں بندگان خدا جوق در جوق آپ سے نیاز حاصل کرنے آئے وہاں لوگ آپ کی خدمت میں نذریں گذارتے تھے لیکن آپ استغناء کے باعث اُن کی رقوم قبول نہیں فرماتے تھے، واپس کردیتے تھے۔

آپ کا قیام کہاں کہاں رہا

آپ امروہہ میں بہت کم رہے اپنے پیر ومرشد کی حیات ہی میں صحرائے حاذق پور میں قیام پذیر رہتے تھے۔ بعد عالم رویاء میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان (کہ آبادی میں رہکر خلق اللہ کی نصائح ومواعظ کے ذریعہ رہنمائی کرو) کے بعد آپ موضع براہی چلے گئے۔ مدتوں وہاں رہے۔ پھر مولانا محمد احسن خاں عباسیؒ کی استدعا پر آپ بریلی شریف لے گئے وہاں مولانا کے مکان میں قیام رہا بعدہٗ قاضی شیخ الاسلام صدیقیؒ وغیرہ اکابر شہر بریلی کی درخواست پر موضع کھائی کھیڑہ (نزد بریلی) کی سکونت اختیار کی وہیں ۴؍ رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ بروز جمعہ قریب دوپہر آپ کا وصال ہوا۔ آپ وہیں دفن کئے گئے تھے ع

''عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا''

یکم شوال ۱۱۹۰ھ کو تابوت مبارک اعزا و مریدین امروہہ لے آئے ۸ر شوال سن مذکور کو بمقام امروہہ اپنے صاحبزادے شیخ ظہور اللہ صدیقی کے باغ میں قیامت تک کے لئے محو استراحت ہوئے۔

آپ کے خلفاء

آپ کے خلفاء بکثرت تھے۔ صاحب نخبۃ التواریخ لکھتے ہیں:

''خلفاء و مریدانش راحدے نیست''

چند خلفاء کے نام درج کرتا ہوں: (۱) آپ کے ہر دو نبیرگان شاہ عبدالباریؒ (۲) وشاہ دوست محمدؒ (۳) شاہ محمد قاسم فاطمیؒ (۴) شاہ محمد مکمل مرادآبادیؒ (۵) حاجی محمد اکبر شاہ صاحبؒ (۶) نزہت شاہ بریلویؒ (۷) مولوی شاہ ظہور اللہ مرادآبادیؒ (۸) شیخ نور لاہوریؒ (۹) شاہ حسینؒ ولایتی (۱۰) بشارت علیؒ ساکن سیتل تحصیل نواب گنج ضلع بریلی (۱۱) مولانا محمد احسن خاں عباسیؒ ساکن بریلی محلہ قاضی ٹولہ آپ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں عہدۂ قضاء پر ممتاز اور بلند پایہ فقیہ و محدث تھے۔ (۱۲) قاضی شیخ الاسلامؒ (۱۳) مولانا صدر الشریعہؒ یہ ہر دو حضرات بریلی کے ساکن نسباً صدیقی اور صاحب علم و عرفان تھے۔ (۱۴) جمن شاہؒ، نو مسلم تھے حضرت کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے اور باطن کی تکمیل کی۔ (۱۵) شاہ عنایتؒ، نو مسلم تھے۔ حضرتؒ کی عنایت سے اعلیٰ مدارج ولایت حاصل کئے۔ (۱۶) مولانا حاجی رفیع الدین خاں فاروقیؒ ساکن مرادآباد عالم و فاضل مفسر و محدث تھے۔ اولاً حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفریؒ سے ارادت تھی پھر حضرت شاہ عبدالہادیؒ سے بیعت ہوئے۔ اپنے تذکرے میں ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ عبدالہادی قریشیؒ امروہی..... بامن بسیار مہربان بود۔''

اولاد

آپ کے ایک صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادے کا اسم گرامی شیخ ظہور اللہ ہے۔ اگرچہ یہ میدانِ درویشی میں گامزن نہیں ہوئے تھے لیکن ان کے دو صاحبزادے حضرت شاہ عبدالباریؒ اور

حضرت شاہ دوست محمدؒ کاملانِ وقت سے تھے۔ اول الذکر سلسلہ عالیہ امدادیہ کے ایک فرد ہیں۔ آگے ان کا ذکر مفصل آرہا ہے۔

ایک خاص واقعہ کا ذکر

صاحب مفتاح الخزائن نے لکھا ہے کہ ابتدائے سلوک میں حضرتؒ کو حقّہ کا بہت شوق تھا ایک دن اپنی ہمشیرہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور اپنی بھانجی سے حقّہ بھر کر لانے کی فرمائش کی۔ ہمشیرہ کی زبان سے اُس وقت بیساختہ نکلا کہ ''ابھی تک باوجود فقیری کے 'حکومت وفرمائش' کی بو دماغ سے نہیں گئی۔ اگر ایسا ہی تھا تو باپ دادا کی ریاست کو کیوں چھوڑا؟'' (یہ فرمائش ریاست میں ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں) ہمشیرہ کے ان کلمات ونصائح کا آپ پر اس قدر اثر پڑا کہ آپ نے یہ عہد کرلیا کہ ہرگز کسی سے خدمت نہیں لیا کریں گے۔ چنانچہ آپ کسی سے فرمائش کر کے خدمت نہیں لیتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ مریدین ذخیرہ برکات جمع کرنے کے لئے ازخود خدمت کریں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی کام منظور وملحوظ ہوتا تو خدام وحاضرین کے قلوب پر اپنی توجہ ڈال کر اُن کو سعادت اندوزی کا موقع عنایت فرمادیتے تھے۔ آپؒ اپنی ہمشیرہ کا ذکر خیر اکثر فرمایا کرتے تھے اور ان کی نصیحت کو تمام عمر نہیں بھولے۔ آپ نے حقہ بھی ترک کردیا تھا اس کی وجہ مفتاح الخزائن میں یہ لکھی ہے کہ آپ ایک رات سرورِ کائنات ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عبدالہادی حقہ را ترک کن''۔

بس اُس دن سے امتثال امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقّے کو چھوڑ دیا اور مدت العمر اس کی طرف التفات نہیں کیا۔

آپ کے کرامات وخرق عادات

صاحب مفتاح الخزائن نے آپ کی بہت سی کرامات لکھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے

''ازانجا کہ کرامات وخرق عادات آنحضرت بحد تواتر وتوالی رسیدہ اگر شمہ ازاں بقید

قلم و تحریر درآید دفتر ہا باید پرداخت" یعنی آپ کی کرامات اس کثرت سے ہیں کہ اُن میں کا تھوڑا سا حصہ بیان کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں"۔

کلماتِ طیبات

اب میں حضرتؒ کے چند اقوال و ملفوظات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں مفتاح الخزائن سے ماخوذ و منتخب ہو کر پہلی مرتبہ یہ اقوال سامنے آرہے ہیں عام تذکرہ نویسوں نے اس حصے کو نظر انداز کر رکھا تھا۔

آیئے اب اُن کی کچھ باتیں سنئے:

(۱) ایک دن آپ نے فرمایا: کہ برکاتِ فقیر ہر وقت منقسم ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی فقیر کی محض دلی توجہ سے کشادِ کار ہو جاتا ہے یعنی زبان خاموشی سے کام کرتا ہے اور بسا اوقات اُس کو زبان سے کہنے کی حاجت ہوتی ہے۔ کبھی نگاہ سے کام چل جاتا ہے اور کبھی ہاتھ پاؤں کو حرکت میں لانے کی ضرورت واقع ہوتی ہے۔ اس آخری صورت کی تشریح میں ایک واقعہ بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بریلی میں ایک بیمار کے لئے جس سے اطباء عاجز آگئے تھے آپ نے دعاء کی وہ مستجاب نہ ہوئی آخر آپ بریلی سے چل کر ایک موضع میں پہونچے اور وہاں سے ایک باغ میں پہنچ کر مشغول دعاء و توجہ ہو گئے۔ انجام کار اللہ تعالیٰ نے بیمار پر فضل فرمایا اور اُس کو شفا ہو گئی۔

(۲) بریلی کی اقامت کے زمانے میں آپ کے صاحبزادے شیخ ظہور اللہ بریلی آئے اور یہ قصد تھا کہ میں اپنی معاش کے بارے میں حضرت سے عرض کروں گا کہ جس ملازمت پر میں ہوں اُس سے بقدر حاجت یافت نہیں ہوتی۔ پہلے اس سے کہ وہ اپنے دل کی بات کہیں حضرت نے فرمایا کہ:

"عجیب بات ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ مرتبہ و مال میں حافظ رحمت خاں (والئ

بریلی) اور نواب دوندے خاں (والئی بسولی) اور دیگر نوابوں کی مانند ہو جائے۔ وہ اپنے سے کم درجے کے آدمیوں اور اپنے سے زیادہ غریبوں کو دیکھ کر شکر الٰہی ادا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو ایمان، اطمینان، صحت و تندرستی عزت و آبرو اور اولاد دے رکھی ہے۔'' صاحبزادے یہ کلمات سن کر خاموش ہو گئے۔

(۴) ایک مرتبہ مولوی غلام عمر صاحب ساکن بریلی موضع کھائی کھیڑہ میں حضرتؒ کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ اُس وقت حضرتؒ اپنا لباس خود اپنے ہاتھ سے دھو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خادم نے عرض کیا کہ مولوی صاحب آج ہی بریلی واپس ہونے کا قصد رکھتے ہیں اور دن تھوڑا رہ گیا ہے۔ حضرتؒ یہ سن کر اُٹھے اور مولوی صاحب موصوف سے ہمکلام ہوئے۔ مولوی صاحب نے مسئلہ وحدت الوجود کا بیان شروع کر دیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس قسم کی باتوں سے توبہ کرنی چاہئے۔

چنانچہ انھوں نے تین مرتبہ استغفار پڑھی، بعدہٗ حضرتؒ نے فرمایا کہ تاوقتیکہ یہ حالت و کیفیت طاری نہ ہو جائے یہ مسئلہ منکشف نہیں ہوتا۔ توحید وجودی کے مسائل کا زبانی جمع خرچ کرنا محض کفر[1] و زندقہ ہے۔ مولوی صاحب نے اس کو تسلیم کیا اور رخصت ہو کر

---

[1] آیئے اس موقع پر ایک اہم خط و کتابت کا ذکر کر دیا جائے۔ مولوی عبدالعزیز صابری امروہی مرحوم نے جن کا حضرت مولانا نانوتویؒ سے تحریری مناظرہ ہوا ہے اور مناظرہ عجیبہ کے نام سے شائع ہو گیا ہے، حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کو ایک خط لکھا جس میں یہ شکایت لکھی: ''(مولانا) مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم معتقدان وحدت الوجود، وحدت الموجود کو ملحد و زندیق کہتے ہیں اور اُن کے مرید شاگرد (مولانا) مولوی احمد حسن صاحب (امروہی) کا بھی یہی مقولہ ہے اور اقوال ضیاء القلوب کو محتاج تاویل جانتے ہیں اور ان تاویلوں کا واقف اپنے سوائے دوسروں کو نہیں جانتے اور (مولانا) مولوی رشید احمد صاحبؒ و (مولانا) مولوی محمد یعقوب صاحب بھی اسی مسلک پر ہیں۔ باوجود اس کے آپ سے اجازت حاصل کی ہے اور مشرب اہل چشت کا رکھتے ہیں۔ خلاف مشائخ چشت گفتگو کرتے ہیں۔''

حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کا جو جواب دیا ہے اُس کا کچھ اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں: ''نکتہ شناسا! مسئلہ وحدت الوجود حق و صحیح ہے اس مسئلہ میں کوئی شک و شبہ نہیں فقیر و مشائخ فقیر اور جن لوگوں نے فقیر سے بیعت کی ہے سب کا اعتقاد یہی ہے۔ مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم اور مولوی رشید احمد و مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی احمد حسن صاحب وغیرہم فقیر..... بقیہ اگلے صفحہ پر

بریلی واپس آ گئے۔

(۴) آپ نے فرمایا کہ: ابتدائے سلوک میں میرے دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ احکام شریعت اور احکام طریقت میں مغائرت اور مخالفت ہے، اسی خیال پر تھا کہ ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں ایک محتاج بُڑھیا میرے پاس آئی میں نے اُس کو اجازت دے دی کہ گنّے کے کھیت میں سے (جو میری ملکیت تھا) گنّے لے کر اپنی حاجت روائی کرے۔ میں نے ملازموں کو بھی کھیت کی نگہداشت کی سخت تاکید کر دی تھی۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اُس بُڑھیا کو ملازم (گنّے توڑنے کی وجہ سے) گرفتار کر کے لائے چونکہ اس بُڑھیا عورت اور اُن ملازمین میں سے ہر ایک کا فعل میرے ہی حُکم کے مطابق تھا اس لئے میں کسی کو بھی منع نہ کر سکا (ہر ایک نے مطابق حُکم کام کیا) اُس وقت یہ خطرہ جو مدّت سے جما ہوا تھا میرے دل سے دور ہوا اور یہ بات منکشف ہوئی کہ ہر دو طریق کے حاکم

بقیہ سے آگے...... کے عزیز ہیں اور فقیر سے تعلق رکھتے ہیں کبھی خلاف اعتقادات فقیر و خلاف مشرب مشائخ طریق خود مسلک اختیار نہ کریں گے۔ سوائے اس کے اس مسئلہ کے چھپانے میں یہ فائدہ ہے کہ اسباب ثبوت اس مسئلہ کے بہت نازک اور نہایت دقیق ہیں فہم عوام بلکہ فہم علماء ظاہر کہ اصطلاح عرفا سے عاری ہیں قوت اس کے ادراک کی نہیں رکھتا اور علماء کا کیا ذکر ہے بلکہ جن صوفیوں کا سلوک ہنوز ناتمام ہے اور مقام نفس سے نکل کر مرتبہ قلب تک نہیں پہنچتے۔ اس مسئلہ سے نقصان اُٹھاتے ہیں۔

معارف آگاہا! اسی احتیاط کی وجہ سے احباب فقیر مثل فقیر اس قیل و قال سے زبان کو روکے ہیں اور بیان سے پرہیز کرتے اور پوچھنے والوں کو تاویلات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ انکار اس مسئلہ کا نہ ہو جاوے، بہت سے جاہلوں نے اس مسئلہ کو مسلک بنا کر محفلوں میں اپنی شیخی کی گرم بازار کر رکھی ہے اور خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے گروہوں کو گمراہ کرتے ہیں جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ پس اس قیل و قال سے کیا فائدہ اگر توفیق ہو تو آدمیوں کو طلب حق و ترک تعلق دنیا و کثرت ذکر و فکر کی تحریص دلاوے اور اس میں کوشش کرے جب اس محنت سے تزکیہ نفس و تصفیہ قلب حاصل ہو جائے گا خود ضرورت اس مراقبہ کی جو ضیاء القلوب میں لکھا گیا ہے۔ پیش آوے گی اور اللہ خود رہبری فرمانے والا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا غرض ہدایت کرنے سبیل معرفت سے تجلی ذاتی ہے قلب سالک پر تاکہ حقیقت مسئلہ وحدۃ الوجود کی منکشف ہو جاوے۔ یہ راہ چلنے کی ہے کہنے اور بتانے کی نہیں ہے کہنے سے جاننے تک اور جاننے سے دیکھنے اور ہونے تک بڑا فرق ہے۔ خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے احباب کو اور آپ کو اور آپ کے احباب کو اس راہ میں لغزش سے محفوظ رکھے۔ شمائم امدادیہ ص ۵۷ تا ۶۱ (فریدی)

حق جل مجدہٗ ہیں اور مغائرت اعتباری ہے حقیقی نہیں ہے۔

⑤ ایک مرتبہ قناعت پر بات چلی۔ حضرتؒ نے اس بارے میں ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک مسافر درویش ایک مفلس کے مکان پر وارد ہوا۔ اُس غریب نے جو کچھ روکھی سوکھی روٹی حاضر تھی پیش کر دی۔ روٹی چونکہ خشک اور بے نمک تھی اس مسافر کو نمک کی خواہش پیدا ہوئی۔ میزبان کی طرف اشارہ نمک لانے کے لئے کیا وہ غریب مکان کے اندر گیا، اپنی لڑکی سے دریافت کیا نمک ہے؟ نمک وہاں کہاں تھا۔ مجبور ہو کر اپنے وضو کا لوٹا گروی رکھ کر بقال کی دوکان سے نمک لایا اور اُس مسافر کے سامنے رکھا۔ اُس وقت اُس مہمان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ دیکھیئے توکل اس کو کہتے ہیں کہ میں خشک روٹی نمک کے ساتھ کھانے پر قناعت کر رہا ہوں۔ لڑکی سن رہی تھی اُس نے ہنس کر کہا کہ اے شیخ اگر تو مزۂ قناعت اور لذت توکل سے آشنا ہوتا تو ہمارا لوٹا بقال کی دوکان پر نہ جاتا۔ مسافر نے یہ سن کر شرم سے گردن جھکائی۔

⑥ فرمایا دعائے فقیر تین خاصیتیں رکھتی ہے۔ (۱) خاصیت تخم (۲) خاصیت درخت (۳) خاصیت ثمر یعنی دعائے فقیر کے ظہور کی تین حالتیں ہیں۔

ایک وہ دُعا ہے جو تخم کی مانند ہے اُس کا ظہور کچھ مدت کے بعد ہوتا ہے جیسا کہ تخم مدت معہودہ کے اندر نشو ونما پاتا ہے۔ دوسری وہ دُعا ہے کہ درخت کی طرح ہے کہ تھوڑی مدت میں اُس سے حصولِ ثمرات کی اُمید ہو جاتی ہے۔

تیسری وہ دعا ہے جو ثمر کی مثل ہے اُس کا ثمرہ فوراً مرتب ہوتا ہے اور ان تینوں دعاؤں کو تین صورتوں پر رکھا جائے وہ دعاء جو حکم ثمر رکھتی ہے اُس شخص کے حق میں ہوتی ہے جو خود دعاء کی استدعاء کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے حق میں کی ہوئی دعا کو مستجاب کر دیتا ہے اور جو دعا درخت سے مناسبت رکھتی ہے۔ وہ دعا کرنے والے کی اولاد کے حق میں کی

ہوئی دعا ہوتی ہے کہ بعد کچھ زمانہ کے ظہور کرتی ہے اور وہ دعا جو تخم کے مشابہ ہے وہ ہے جو اپنی اولاد کی اولاد کے لئے کی جاتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ فقیر کامل کی دعاء ضائع اور معطل نہیں ہوتی۔

(۷) فرمایا کہ طالب کو راہ طلب میں رہبر عشق درکار ہے تا کہ وہ اُس راہ میں جدو جہد کر سکے اگر بوئے عشق اپنے اندر نہیں رکھتا اور یہ دولت خداداد اُس کو میسر نہیں ہے تو اُس کی کوشش محض بے سود ہے۔اس کے بعد ایک مثال بیان فرمائی کہ ایَک لڑکا اپنے باپ سے خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اُس کو آلات سپاہ گری اور اسلحہ جنگ خرید کر دیئے جائیں اور ایک گھوڑا بھی خرید دیا جائے تا کہ سپاہیوں اور جنگ آوروں میں شامل ہو سکے۔یہ سب چیزیں حسب خواہش مہیا ہو سکتی ہیں لیکن دلیری اور شجاعت اُس کے اندر نہ ہو اور چاہے کہ یہ کہیں سے پیدا کر دی جائے یہ ممکن نہیں۔شجاعت کسب سے یا بازار سے بکتی ہوئی نہیں ملتی۔یہ ایک جوہر ذاتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ دل میں پیدا فرماتا ہے (اور یہی سپاہی کے لئے ضروری ہے) ایسے ہی فقیر کے لئے عشق وذوق ضروری ہے کہ یہی وصول مقامات کا وسیلہ ہے۔

⑧ ایک دن مکاروں کا ذکر ہو رہا تھا۔آپ نے فرمایا کہ مکاروں کی جدو جہد بمقابلہ اُن لوگوں کے جو صحیح مسلک پر گامزن ہیں زیادہ ہے اور کیوں نہ ہو اُن کی بات بغیر اس جدو جہد کے رواج پذیر نہیں ہو سکتی۔دیکھ لو۔چور کی بیداری اور آگاہی مال والوں سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے تا کہ وہ اپنی بیداری کے ذریعہ دوسروں کا مال و متاع چرا کر حاصل کر سکے۔

⑨ فرمایا کہ آدمی کو اپنے زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہئے، مدار نجات حسن خاتمہ پر ہے۔

⑩ فرمایا ہر کسی کو چاہئے کہ اپنے پاؤں اپنے دائرہ عمل سے باہر نہ رکھے ایسا کرنا ترکِ ادب اور محل خوف ہے۔

حضرت شاہ عبدالباری صدیقی امروہیؒ

بعبد الباری شیخ طریقت ☆ چراغ دین احمد شمع ملت (مولانا نانوتویؒ)

حضرت شاہ عبدالباریؒ ابن شیخ ظہور اللہ نبیرۂ حضرت شاہ عبدالہادی صدیقیؒ ۸ر رجب المرجب سنہ ۱۱۶۰ ہجری بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ سال کی عمر تک بجز دربار شاہ عضد الدینؒ کی حاضری کے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ بچوں کے ساتھ لہو ولعب کا مطلق شوق نہ تھا۔ تعلیم کس سے پائی کیا کیا پائی یہ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ۲۲ر سال کی عمر تھی کہ جدّ امجد نے ان کو اور ان کے بھائی شاہ دوست محمد کو حاذق پور (نزد سنبھل) میں طلب کر کے اشغالِ باطنی میں مشغول کیا۔ چونکہ نازک طبع تھے اس لئے آپ کے لئے ریاضت بھی سہل تر تجویز فرمائی۔

جدّ امجد ان کو لباس فاخرہ پہناتے تھے۔ صاحب انوار العارفین لکھتے ہیں:

”وے حضرت را مجاہدات و ریاضات سہل تر امر فرمودند و لباس فاخرہ زیب بدن وے می نمودند کہ طبیعت عبدالباری بس نازک است متحمل ریاضات شاقہ نمی گردد۔“

آپ حسن صورت و حسن سیرت میں یگانۂ روزگار تھے۔ اپنے جدامجد کے سجادہ نشین ہوئے اور اپنے خلفاء کے سینوں کو نسبت چشتیہ سے معمور کیا۔ انوار العارفین میں ہے:

”سجادہ نشین جدامجد خود گشتند و از ہمت و قوت نسبت عشقیہ چشتیہ سینۂ خلفاء خود پر شور و پر زور ساختند حسن صورت و حسن سیرتش مشائخانہ بود۔“

مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ سے خرقۂ خلافت

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ امروہہ تشریف لاتے رہتے تھے یہاں پر شاہ ضیف اللہ نقشبندیؒ اور

دیگر حضرات مرید وخلیفہ تھے۔ اپنے مکتوبات میں کئی جگہ یہاں کے آنے کا تذکرہ فرمایا ہے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر از دہلی بسنبھل رسید و امروہہ و مرادآباد راہم دید...... مردم سنبھل و مرادآباد و امروہہ ہر سہ بلاد سماجت نمودند کہ اینجا باید بود۔" (کلمات طیبات ص ٦٦)

دوسرے مکتوب میں ہے:

"فقیر از سیر امروہہ و مرادآباد فارغ شدہ ست وقصد تماشائے شاہ جہان پور دارد۔"

(کلمات طیبات ص ۷۲)

ایک اور مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

"از سنبھل و امروہہ تا شاہ جہان پور در جمیع منازل دستہ دستہ و جماعہ جماعہ مردم از قوم روہیلہ اکثر و از مردم ہندی کمتر اخذ طریقہ علیہ نمودند و منور و متاثر گردیدند۔"

(کلمات طیبات ص ۸۸)

ایک مرتبہ حضرت مرزا صاحب شہیدؒ یہاں تشریف لائے اور سید اسد اللہ خاں عرف میر کلّو کے مدرسہ[1] میں قیام فرمایا۔ حضرت شاہ عبدالباریؒ نے اس موقع پر حضرت مرزا صاحب شہیدؒ سے استفادہ کیا۔ اس کی پوری تفصیل مؤلف تذکرۃ الکرام کی زبانی سنیے:

"حضرت شاہ عبدالباریؒ حاضر خدمت ہوئے، اس وقت حضرت مرزا صاحبؒ حاضرین کو توجہ دے رہے تھے، آپ بھی خاموش و مؤدبانہ حلقہ میں شامل ہو گئے کچھ دیر بعد حضرت مرزا صاحبؒ نے سر اُٹھا کر فرمایا کہ اس جلسہ میں چشتی بزرگ کون ہیں؟ حاضرین میں سے کسی نے عرض کی کہ شاہ عبدالباری نبیرۂ حضرت شاہ عبدالہادیؒ بغرض سلام حاضر ہیں بعد سلام و مصافحہ اُن سے دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بالآخر حضرت

[1] یہ مدرسہ محلہ گذری کی حوض والی مسجد میں پہلے بھی تھا اب بھی جاری ہے۔ (محب الحق)

مرزا صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کے جد بزرگوار کے مجھ پر بہت الطاف ہیں۔ اس لئے بمصداق ھل جزاءُ الاحسانِ الاالاحسان میرا فرض ہے کہ اُن کا نعم البدل کردوں۔ چنانچہ آپ نے خاص توجہ کے ساتھ آپ کو مختلف منازل کی سیر میں مصروف رکھا ہر منزل کا واقف رہ پایا بعد انفراغ ارشاد ہوا قدم شیخ عبدالباری در ہر مقام از ما یک قدم بیش بود حسب استدعائے شاہ عبدالباریؒ مرزا صاحبؒ خانقاہ شاہ عبدالہادیؒ میں تشریف لے آئے اور کئی ہفتہ قیام فرمایا۔ حضرت مرزا صاحبؒ طبعاً نہایت نازک اور لطیف الطبع تھے چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ جس دن حضرت مرزا صاحبؒ خانقاہ میں تشریف لائے شاہ عبدالباری صاحبؒ نے ایک چارپائی تیار کرائی تھی جس پر پہلی مرتبہ حضرت مرزا صاحبؒ نے استراحت فرمائی۔ صبح کو شب بھر نیند نہ آنے کی شکایت کی اور فرمایا کہ اس میں کان ہے ناپنے سے معلوم ہوا کہ واقعی خفیف سی کان موجود تھی۔

یہ متبرک چارپائی[1] اب تک اُسی حالت میں خاندان میں موجود ہے اور کان بھی نمایاں ہے۔ زمانۂ قیام میں حضرت مرزا صاحب نے شاہ صاحبؒ پر خاص الطاف فرمائے اور خلافت عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سے سرفراز کیا"۔ (تذکرۃ الکرام ص ۱۶۴۔۱۶۵)

دہلی واجمیر کا سفر

بعد وفات حضرت مرزا صاحبؒ آپ نے دہلی واجمیر کا سفر کیا۔ دہلی میں کچھ دن خانقاہ مظہریہ میں قیام ہوا۔ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور دیگر مشائخ عصر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ قطب الاقطاب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزارات پر حاضری دی۔ بعدہٗ اجمیر جا کر سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانے پر حاضر ہوئے۔ ایک مدت تک وہاں قیام رہا۔

---

[1] اب اس چارپائی کا صرف ذکر باقی ہے، نام ونشان مٹ گیا۔ (محب الحق)

شاہ عبدالرحمٰن لکھنویؒ کی آمد

شاہ عبدالرحمٰن لکھنویؒ نے ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں روحانی استفادے کے سلسلے میں ہندوستان کے مشہور مقامات کا سفر کیا تھا۔

چنانچہ آپ امروہہ بھی تشریف لائے اور مسلسل چھ ماہ خانقاہ شاہ عبدالباریؒ میں قیام فرمایا اور حضرت کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔ انوارالرحمٰن لتنویرالجنان (سوانحعمری شاہ عبدالرحمٰن لکھنویؒ) میں اس کا ذکر ہے۔

وفات

اوائل رجب ۱۲۲۶ھ میں بعارضہ تپ محرقہ تقریباً ایک ماہ اور چند یوم علیل رہ کر ۱۱رشعبان ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء جمعہ کے دن ۵ بجے صبح کو انتقال فرمایا اور اپنے جدامجد کے پائین مزار مدفون ہوئے۔

اولاد

حضرت شاہ رحمٰن بخش آپ کے اکلوتے صاحبزادے تھے، جو سلوک ودرویشی میں اپنے والد بزرگوار اور جدامجد کے قدم بقدم تھے۔ أعدوا لهم ما استطعتم.. الآیه پر عمل کا یہ عالم تھا کہ آخر وقت تک گھوڑا پالتے رہے اور برابر ورزش کرتے رہے۔

حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلویؒ کے اعلان پر آپ بنفس نفیس اُن کی ہمراہی کے لئے تیار ہوگئے تھے لیکن میراں حاتم علی صاحبؒ کے ایماء سے آپ کی قائم مقامی میں حاجی سید عبدالرحیم ولائیؒ کو منجانب خانقاہ پانصد روپے دیکر مع ایک خط کے روانہ کیا گیا۔ اس خاندان میں اس وقت شاہ سلیمان احمد صاحب چشتی سجادہ نشین[1] ہیں جو کہ حضرت محدث امروہیؒ کے خلقہ درس کے فیض یافتہ اور فارغ التحصیل ہیں۔

عادات وخصوصیات

حضرت شاہ عبدالباریؒ صاحب اخفاء کرامات کے لئے ہمیشہ دُعا کیا کرتے تھے۔ مہمان نوازی

---

[1] اب شاہ محمود الباری چشتی سجادہ نشین ہیں۔ شاہ سلیمان احمد صاحب کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ (محب الحق)

میں مشہور نزدیک و دور تھے۔ کلمات توحید وجودی کا اظہار بلاغلبۂ حال ناپسند کرتے۔ تلاوت قرآن آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ نماز نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ ادا فرماتے۔ امامت خود کرتے۔ شب وروز میں بکثرت نوافل پڑھتے۔ طالب کے لئے ذکر جہر کومفید اور مؤثر فرمایا کرتے۔ اکثر یہ رُباعی پڑھتے:

خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ ☆ دہ چیز بروں کن از درون سینہ

حرص وامل وغضب، دروغ وغیبت ☆ بخل وحسد وریا وکبر وکینہ

سر پر عمامہ باندھتے تھے، نیچا کرتہ پہنتے ایک رومال ہوتا تھا جس میں تسبیح ومسواک موجود رہتی۔ عطر کا استعمال بہت کرتے۔ ۵۰ سال کے بعد ریش مبارک میں مہندی لگایا کرتے تھے۔ صبح و شام حضرت شاہ عضدالدینؒ اور اپنے جد امجد کے مزارات پر حاضری آپ کے معمولات میں تھی۔

حضرت شاہ عبدالباریؒ کے خلفاء

آپ کے خلفاء کے اسماء یہ ہیں: (۱) میراں سید حاتم علیؒ ساکن ہزارہ (۲) حاجی سید عبدالرحیم ولایتی شہیدؒ (۳) حافظ خیرالدینؒ اخوندزادہ (۴) حاجی حافظ کلّن شاہؒ (۵) مولوی علی احمد صدیقی بریلویؒ ابن مولانا شیخ الاسلامؒ۔

ان خلفاء میں حاجی سید عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ ہمارے اکابر کے سلسلہ کے بزرگ ہیں، جو میاں جی نور محمد جھنجانویؒ کے پیر اور حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے دادا پیر ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آخر میں تھوڑا سا تذکرہ ان کا بھی کردوں یہ نسباً سادات حسینی سے تھے آبائی وطن افغانستان تھا۔ ابتداءً شاہ رحم علی صاحبؒ قادری سے بیعت کی۔ بعد اُن کی وفات کے حضرت شاہ عبدالباریؒ کی خدمت میں آکر بیعت ہوئے اور ریاضات ومجاہدات شاقہ کئے۔ قوی الجثہ اور فن حرب کے ماہر صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے ۱۲۴۴ھ میں اپنے مرشد زادہ شاہ رحمن بخشؒ کی قائم مقامی میں جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ جام شہادت نوش فرمایا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت سید عبدالرحیم شہیدؒ پر حضرت سید احمد صاحب رائے بریلویؒ کا بڑا گہرا

اثر پڑا تھا اور انہوں نے اپنا آخری قطرۂ خون راہِ خدا میں آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے بہا دیا۔ مگر اغلب یہ ہے کہ انہوں نے حضرت سید شہیدؒ صاحب کے ہاتھ پر صرف بیعت جہاد کی تھی۔ سلوک وارشاد سے اس بیعت کا کوئی تعلق نہ تھا۔ حضرت سید عبدالرحیم ولایتیؒ نے اپنے مرشد اول سے سلسلہ قادریہ کی خلافت حاصل کی تھی اور امروہہ آکر مرشد ثانی سے چشتیہ سلسلہ کا سلوک طے کیا اور اپنے مرشد کے انتقال کے بعد بھی ۱۲۴۴ھ تک امروہہ کی خانقاہ میں اُن کا قیام رہا۔ حضرت سید صاحبؒ کے اعلان پر یہیں سے بغرض رفاقت گئے تھے۔ اُس کے بعد جہاد وشہادت کی منزل تھی جو سید صاحبؒ کی رہنمائی میں طے ہوئی۔ چنانچہ ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوگئے۔

یوں تو سلسلہ امدادیہ کے تین بزرگوں پر حضرت سید صاحبؒ کے اثرات ہیں: (۱) حضرت سید عبدالرحیم ولایتی شہیدؒ (۲) حضرت نور محمد جھنجھانویؒ (۳) خود حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ

حاجی صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ ''میں تین سال کا تھا کہ سید صاحبؒ کی آغوش میں دیا گیا انہوں نے مجھ کو بیعت تبرک میں قبول فرمایا۔'' (شمائم امدادیہ ص ۹۹)

شاہ عبدالرحیم ولایتی کے بارے میں حاجی امداد اللہ مہاجرؒ کے ملفوظات

(۱) فرمایا کہ میرے دادا پیر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شیخ جان محمد صاحبؒ ولایت سے خدا کی طلب میں ہندوستان تشریف لائے اور حضرت رحم علی شاہؒ سے خاندان قادریہ میں بیعت کی۔ بعد اُن کے انتقال کے پھر طلب کا تقاضہ ہوا۔ پھرتے پھرتے امروہے پہونچے، وہاں حضرت شاہ عبدالباریؒ کی شہرت تھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے چند دن بعد شاہ عبدالباریؒ کو مطالعہ مثنوی شریف کی کیفیت ہوئی خدام سے کہا ''محمد جان سے کہہ دو کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی صاحب دہلوی کے یہاں ہے اور شاہ عبدالرحیم کو میرے پاس بُلا لاؤ'' جب شاہ عبدالرحیم صاحب حاضر ہوئے حضرت نے اُن پر اُسی کیفیت میں نظر ڈالی پہلے تو شاہ صاحبؒ کو حالت گریہ طاری ہوئی بعدہٗ قہقہ شروع ہوا۔ مگر دوسری حالت شاہ عبدالباریؒ کی بھی ہوئی۔ دونوں صاحب باغ میں تشریف لے گئے اُسی حالت میں شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا مقصد دلی حاصل ہوا۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۶۲)

(۲) فرمایا: کہ مومن خاں صاحب دہلویؒ (مشہور شاعر) فرماتے تھے کہ ایک بار چند حضرات شاہ

عبدالعزیز صاحبؒ سے حدیث شریف پڑھ رہے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے تذکرہ اکابرین کا کیا۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اب بھی کوئی ایسا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پرسوں ہمارے پاس فلاں حلیہ کا ایک شخص مسئلہ دریافت کرنے آویگا وہ مردِ کامل ہے اور سمت اور وقت بھی معین کر دیا۔ ہم لوگ روز موعود میں زینت المساجد میں کہ کنارے جمنا کے واقع ہے اُن کے اشتیاق میں بیٹھے تھے۔ وقت مقررہ پر دریا کے کنارے سے اُسی حلیہ کے ایک بزرگ صاحب نمودار ہوئے۔ ہم دوڑے اور زیارت سے مشرف ہوئے وہ شاہ عبدالرحیم صاحبؒ تھے۔ مومن خان صاحبؒ اس واقعہ کی وجہ سے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ (شمائم امدادیہ ص ۱۶۳)

وہ خانقاہ شاہ عبدالباریؒ جو مرجع خلائق اور مرکز رشد وہدایت تھی، جہاں بڑے بڑے درویش سفر کر کے قیام کی غرض سے آتے تھے۔ طالبین کا جمگھٹا رہتا تھا علم وعرفان کی نہریں بہتی تھیں۔ جہاں علاوہ سلوک ومعرفت کے مجاہدوں کی آواز پر لبیک کہنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جاتی تھی۔ افسوس کہ آج وہ خانقاہ ویران اور کھنڈر ہو گئی ہے۔ احقر نے بمشکل تمام بعض بزرگان خاندان سے اُس کے نشانات اور حدود معلوم کئے تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اعتمادے نیست بر دورِ جہاں ☆ بلکہ ایں گردونِ گرداں نیز ہم

آخر میں پھر عرض کر دوں کہ میں نے سلسلہ امدادیہ کے اُن چند بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے جو سرزمین امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں نے حالات لکھنے میں اختصار کا بہت خیال رکھا ہے پھر بھی کہاں تک اختصار کرتا۔ ہر ایک کا حال لکھنے کے لئے ایک دفتر درکار تھا۔ میں نے انتہائی کوشش سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے اور پورا پورا تعارف ان حضرات کا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا عشق، اپنے رسول کی محبت اور اتباعِ سنت کی پابندی کے ساتھ بزرگانِ دین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اوران کا خاندان

(ایک سرسری جائزہ ایک اجمالی نظر)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہندوستان کے ان عظیم الشان اکابر میں سے ہیں جن پر ارضِ ہند بجا طور پر فخر کرسکتی ہے اس عظیم شخصیت کے فیوض وبرکات ہندوسندھ میں تو تھے ہی تمام عالمِ اسلامی اور دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں وہ ایک طرف باکمال محدث اور فقید المثال فقیہ تھے تو دوسری طرف ایک ماہر رموز تصوّف محقق صوفی اور بلند پایہ مفکر ومتکلم بھی تھے ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا جن میں مولانا نوراللہ بڈھانویؒ، خواجہ امین اللہ ولی اللہی کشمیریؒ، شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، علامہ سید مرتضی بلگرامی ثم زبیدی صاحبِ ''تاج العروس شرح قاموس'' اور صاحبِ تصانیف کثیرہ الحاج نواب رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ جیسے حضرات بھی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ایک عبقری (پیدائشی باکمال) انسان تھے ان کا آبائی سلسلۂ نسب امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے اور ان کی ننھیال کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے متصل ہوتا ہے ان کی ددھیال اور ننھیال میں بڑے بڑے پاکیزہ نفوس اربابِ علم وعرفان اور اصحاب قلم وعلم گذرے ہیں۔

یہ بات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تقریباً تمام تذکرہ نویس لکھنا بھول گئے ہیں کہ وہ قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر میں ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے ان کے نانا شیخ محمد پھلتیؒ تھے جو ایک بلند معیار صوفی اور درویش تھے حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے بیعت اور مجاز تھے ان کی عفت مآب صاحبزادی ''فخر النساءؒ'' حضرت شاہ صاحبؒ کی والدہ ماجدہ تھیں شیخ محمدؒ کے صاحبزادے شاہ عبید اللہؒ پھلتی، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حقیقی ماموں اور خسر تھے ان کا مقام بھی مشائخ پھلت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ فاروقی بھی جامع کمالات بزرگ تھے انھوں نے

اپنے بھائی شاہ ابو الرضا محمدؒ اور خواجہ خوردؒ کے علاوہ مشہور ماہر علوم عقلیہ ''میر زاہد ہرویؒ'' سے بھی اخذ علوم کیا تھا انھوں نے سلسلۂ آدمیہ مجددیہ میں حافظ ''سید عبداللہ اکبر آبادیؒ'' سے اور سلسلۂ ابو العلائیہ میں خلیفہ ''ابوالقاسم اکبر آبادیؒ'' سے نیز سلسلۂ چشتیہ میں ''سید عظمت اللہ چشتی اکبر آبادیؒ'' سے فیض حاصل کیا تھا شاہ عبدالرحیمؒ کے والد شیخ وجیہ الدینؒ بھی بڑے دیندار، پابند وضع، ذی علم اور شجاع شخص تھے. ددھیال اور ننھیال کے علمی اور روحانی ماحول نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی سیرت پر بہت بڑا اثر ڈالا آپ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فاروقیؒ نے آپ کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا دس سال سے کم عمر تھی کہ حافظ قرآن مجید ہوئے اور اس کے بعد سولہ سال کی عمر تک تمام علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر لی.... فراغت کے بعد جبکہ آپ کے والد ماجد کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا تو ان کی جگہ سترہ سال کی عمر میں مسند نشین علم و معرفت ہوئے اور صدہا تشنگانِ علوم اور طالبانِ معرفت کو فیض یاب کیا آپ نے مدرسہ رحیمیہ کو ترقی دی اور دہلی کے اندر کارِ تعلیم و تدریس کو فروغ دیا اپنے والد کی وفات کے ۱۲/۱۳ سال کے بعد ۱۱۴۳ھ میں بغرض حج و زیارت و تحصیل علم و حصول حدیث آپ حجاز مقدس چلے گئے وہاں دو سال رہے اور شیخ ابو الطاہر مدنی کردیؒ وغیرہ جیسے مشہور و معروف محدثین سے اخذ فیض کیا آپ کے اندر جو خداداد ذہانت اور ذکاوت تھی اس کو دیکھکر وہاں کے اساتذۂ حدیث بہت خوش ہوئے اور انہوں نے آپ کی طبّاعی کا بڑے اچھے الفاظ میں اظہار کیا۔

حجاز مقدس سے واپس آکر بھی حضرت شاہ صاحبؒ درس دیتے رہے لیکن اب آپ کی مشغولیت تصنیف و تالیف میں زیادہ ہوگئی آپ کی تصانیف میں ''ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ البالغہ'' وہ دو بہترین کتابیں ہیں جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ان کے علاوہ بھی درجنوں کتابیں اور رسائل آپ نے تصنیف کئے ہر فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، خصوصاً تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف میں ان کو بڑا درک حاصل تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تصوف میں جو کتابیں لکھیں ان میں ایک محققانہ شانِ اجتہاد جھلک رہی ہے ''توحید وجودی'' اور ''توحید شہودی'' کے مسائل پر بھی آپ نے لکھا اور اس نزاع کو ''نزاعِ لفظی'' قرار دیا... تمام مشائخ طریقت سے حسن ظن پیدا کرنے کے

لئے آپ نے اپنی تصنیفات میں پوری پوری کوشش فرمائی۔ ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، قول الجمیل، ہمعات، ہوامع، تفہیماتِ الٰہیہ، خیر کثیر، بدور بازغہ اور قرۃ العینین'' وغیرہ کتابیں آپ کی بلندئی استعداد اور بلند پایہ بصیرت پر شاہدِ عدل ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا، جس کا نام ''فتح الرحمٰن'' ہے وہ بھی اتنا معیاری ہے کہ جس کی نظیر فارسی زبان کے کسی ترجمہ میں نہیں ملتی۔ اس فارسی ترجمہ اور اس کے فوائد میں جو رموز اور مصالح ہیں ان کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے قرآن مجید کی متعدد تفاسیر اور متعدد تراجم کا مطالعہ کیا ہو۔

آپ نے ''الفوز الکبیر'' اصول تفسیر میں ایک رسالہ لکھا جو حجم و ضخامت کے لحاظ سے کم اور معانی کے لحاظ سے بہت جامع اور پر مغز ہے۔ اس کا عربی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ اس رسالہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر قرآن کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مغلیہ دور کے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ان کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی نے اپنے زمانے کے بعض بادشاہوں کو بھی دعوت نظامِ عدل دی ہے اور ان کے سامنے انتظامِ ملک و مال کا نقشہ پیش فرمایا ہے۔ آپ کے وہ خطوط جو اس وقت کی سیاست کے آئینہ دار ہیں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو عقل معاد کے ساتھ ساتھ عقل معاش سے بھی کافی و وافی حصہ ملا تھا۔

آپ کے روحانی مسترشدین بھی کافی تعداد میں تھے جن میں حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی حیثیت سب میں ممتاز ہے۔ حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا تھے، تصوف و معرفت میں آپ کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ خلیفہ و مجاز تھے۔

آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ آپ کے تمام علوم ظاہری و باطنی کے حامل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد شاہ محمد عاشق پھلتیؒ اور شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے ذریعہ علومِ ولی اللّٰہی زیادہ سے زیادہ اشاعت پذیر ہوئے۔

شاہ محمد عاشق پھلتیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ماموں زاد بھائی بھی ہیں، برادر نسبتی بھی ہیں، شاگرد بھی

ہیں اور مرید وخلیفہ بھی..... وہ حجاز مقدس میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ حدیث کے درس میں بھی شریک رہے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی کتابوں کے مسودات کو جمع کیا اور بڑی لگن سے ان کی تبییض وترتیب میں حصہ لیا۔ یہ کام انھوں نے شاہ صاحبؒ کی حیات میں بھی کیا اور بعد کو بھی......وہ خود بھی صاحب تصنیف تھے۔ رسالہ ''سبیل الرشاد'' سلوک میں ان کا بہترین شاہکار ہے[1]۔

شاہ محمد عاشقؒ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مکاتیب کے جمع کرنے کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ شروع میں ان کے صاحبزادے شاہ عبدالرحمٰنؒ شاہ صاحبؒ کے خطوط ومکاتیب جمع کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد خود شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے اس کام کو بڑی محنت وجانفشانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مجموعہ کے سیاسی مکتوبات احقر کے اردو ترجمہ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی[2] سلمہ کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ''ندوۃ المصنفین'' اردو بازار جامع مسجد، دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو چکے ہیں...... بقیہ دو سو سے زائد علمی اور دینی مکتوبات احقر کے ترجمہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ عنقریب شائع ہونے والے ہیں[3]۔

ان خطوط کے مطالعہ سے بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زندگی کے حالات پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی ایسی معلومات سامنے آئیں گی جو ان خطوط کے علاوہ ان کی تصنیفات میں کہیں نہیں ملتیں۔

حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے بھائیوں کی تعلیم وتربیت میں بھی بڑا حصہ لیا۔

۱۱۷۶ھ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا وصال ہوا تو اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اپنے والد ماجد سے بھی بہت کچھ پڑھ چکے تھے مگر حضرت شاہ محمد عاشقؒ کی تربیت نے آپ کی علمی وروحانی استعداد میں جلا پیدا کی۔

---

[1] کتب خانہ قاضی شہر رامپور اور رضا لائبریری، رامپور میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (فریدی)۔ [2] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا، اس وقت نظامی صاحب بقید حیات تھے۔ ۵/دسمبر ۱۹۹۷ء میں وفات ہوگئی۔ ''تاریخ مشائخ چشت''''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات''''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ''''نگاہ فقر'' وغیرہ نظامی صاحب مرحوم کی تصنیفات میں سے ہیں۔ [3] شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت سے یہ مکتوبات شائع ہو چکے ہیں (محب الحق)۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زوجہ ثانیہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ پہلی زوجہ کے بطن سے شیخ محمدؒ تھے، جنھوں نے بڈھانہ ضلع مظفرنگر میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں وفات پائی اور بڈھانہ کی جامع مسجد کے ایک گوشہ میں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تین حقیقی بھائی اور تھے جن کے اسمائے مبارک یہ ہیں:

(۱) شاہ رفیع الدین عبدالوہابؒ (۲) شاہ عبدالقادرؒ (۳) شاہ عبدالغنیؒ۔

یہ سب بھائی علمی استعداد اور ذہانت وذکاوت نیز بلندی اخلاق اور پابندی شرع میں یگانہ روزگار تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے مسند علم وعرفان پر بیٹھ کر اپنے والد ماجد کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کی بہت بڑی تعداد چھوڑی۔ ان میں سے چند نمایاں شخصیتوں کے نام یہ ہیں:

ان کے تینوں چھوٹے بھائی، دو برادر زادے یعنی شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور شاہ مخصوص اللہؒ نیز دو نواسے یعنی شاہ محمد اسحٰق فاروقی محدثؒ (مہاجر) اور مولانا محمد یعقوب فاروقی محدثؒ (مہاجر) ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلویؒ مولانا مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلویؒ، رشید الملت مولانا رشید الدین دہلویؒ، مولانا کرم اللہ محدث دہلویؒ، مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کانپوریؒ، مولانا حسین احمد ملیح آبادیؒ وغیرہم حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے اجازت حدیث پانے والوں میں منجملہ اور اکابر کے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ بھی ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تصانیف اور رسائل بھی ان کی اعلیٰ واکمل علمی استعداد کی اطلاع دینے والے ہیں۔ ان میں "تحفہ اثناء عشری اور تفسیر عزیزی" کی تو نظیر نہیں ملتی۔ دیگر کتب بھی حقائق ومعارف سے لبریز ہیں۔ افسوس کہ آپ کے بہت سے مسوّدات اور خطوط انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہوگئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ۸۰ سال کی طویل عمر پائی۔ زندگی کے آخری کئی سال ظاہری بصارت جاتی رہنے سے اور دیگر امراض کے غلبہ کی بنا پر آپ درس وتدریس سے معذور ہوگئے تھے اور آپ کے بھائیوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے مسند درس کو سنبھال لیا تھا۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدا کی ہوئی تعلیمی وتدریسی، تالیفی اور تصنیفی سرگرمیوں میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

آپ کے سب سے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنیؒ تھے جو خود تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن اپنے صاحبزادے شاہ محمد اسماعیل شہید دہلویؒ کی وجہ سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے بھی دیگر تصانیف کے علاوہ اردو زبان میں قرآن کے ترجمے کئے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ان ترجموں میں بڑی لطافتیں اور بہت سی خوبیاں ہیں جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان ترجموں میں ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک بات یہ قابل ذکر ہے کہ ان چاروں بھائیوں میں عمر کے لحاظ سے جو سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے سب سے پہلے انتقال کیا اور سب سے بڑے نے سب سے آخر میں۔ درمیانی دو بھائیوں کا انتقال بھی اسی ترتیب سے ہوا یعنی شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا پہلے اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا بعد کو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعد ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ نے اپنے نانا کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ سے پندرہ سال پہلے ۱۲۵۸ھ میں وہ ہجرت فرما گئے تھے[1]۔

ان کے باکمال تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جن میں مفتی عبدالقیومؒ ابن مولانا عبدالحی بڈھانویؒ شاہ عبدالغنی فاروقی مجددی مہاجر مدنیؒ، قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ ''صاحب مظاہر حق'' نواب قطب الدین خاں دہلویؒ، مولا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مولانا عالم علی نگینوی ثم مرادآبادیؒ اور مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ وغیرہم بھی شامل ہیں۔

ان میں مولانا شاہ عبدالغنی فاروقی مجددیؒ کا سلسلۂ فیض بہت وسیع ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے انہی سے خانقاہ شاہ غلام علی میں درس حدیث حاصل کیا تھا۔

سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ، گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبند میں

---

[1] انشاء اللہ مستقبل قریب میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور ان کے بھائی حضرت شاہ محمد یعقوبؒ پر ایک مستقل مقالہ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ (فریدی) آسمانِ علم و عرفان کے دو درخشندہ ستارے کے عنوان سے ماہنامہ الفرقان ہی کے اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں اور آپ کے تلامذہ کے حالات کاروانِ اہلِ فضل و کمال کے عنوان سے ۱۴ رقسطوں میں شائع ہوئے ہیں۔ (محب الحق)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ میرٹھ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مراد آباد میں مولانا عالم علیؒ اور رامپور میں مولانا حسن شاہ محدث رامپوریؒ، بعدہٗ مولانا محمد شاہ محدثؒ نے درس حدیث کا سلسلہ تا دیر جاری رکھا۔ آخر میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا نانوتویؒ کے دو باکمال شاگردوں یعنی سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے ذریعہ تشنگانِ علمِ حدیث کو حوض ولی اللہی سے بڑی سیرابی وشادابی حاصل ہوئی۔ ان حضرات کے ذریعہ ہندوستان کے ہر ہر صوبے اور ہر ہر گوشے کے علاوہ بیرون ہند میں بھی فیوض ولی اللہی کا سلسلہ پھیلتا رہا۔

آخر دور میں ولی اللہی علمی خاندان سے تعلق رکھنے والے حضرات میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقی مفسر امروہیؒ، وقار المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم دہلویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد محدثؒ وغیرہم نے عرب وعجم میں اپنی تصنیفی وتدریسی خدمات سے ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کے افراد کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ ان کے تعلیمی مستفیدین کے علاوہ روحانی مسترشدین کا حلقہ بھی آفاق گیر ہے اور آج بھی دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ، مدرسہ شاہی مراد آباد کے علاوہ میرٹھ، مظفرنگر، گلاؤٹھی، خورجہ، سنبھل، علی گڑھ، نگینہ، بریلی، شاہ جہاں پور، مؤناتھ بھنجن، مبارک پور، سرائے میر، بنارس نیز بہار وبنگال، گجرات، علاقۂ حیدر آباد دکن، بھوپال، ٹونک، صوبۂ مدراس اور پاکستان کے تمام تدریس حدیث کے ادارے اور اہل حق کی مشہور درس گاہیں۔ یہ سب سلسلۂ ولی اللہی سے وابستہ ومربوط ہیں اور بقول شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا[1] دامت برکاتہم، برِ صغیر (ہندوپاکستان) میں اہل سنت والجماعت کا کوئی ایسا دینی وتعلیمی ادارہ اور تدریس قرآن وحدیث کا مدرسہ باوجود تفتیش وتلاش کے معلوم نہ ہوسکا جس کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سلسلہ سے نہ ہو۔

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو حضرت شیخ بقیدِ حیات تھے۔ آپ کا وصال یکم شعبان ۱۴۰۲ھ موافق ۲۴؍مئی ۱۹۸۲ء میں مدینہ منورہ میں ہوا اور جنت البقیع میں ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

ہندوستان میں علمِ حدیث انیسویں اور بیسویں صدی میں

ہندوستان میں علمِ حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ سلطنتِ مغلیہ کے قیام سے بہت پہلے جاری ہو چکا تھا۔ گجرات اور سندھ میں، دہلی اور اس کے اطراف سے زیادہ اس فن کی طرف توجہ تھی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ غالباً ہندوستان کے عہد اکبری و جہانگیری کے وہ پہلے محدث ہیں جنھوں نے حجاز مقدس میں حدیث پڑھی اور ہندوستان واپس آ کر تمام عمر حدیث وفقہ کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذاری۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ نورالحقؒ نے اپنے والد ماجد کی روایات کو زندہ رکھا اور ان کے ایماء پر چھ جلدوں میں بخاری کی شرح لکھی اور شمائل ترمذی کی شرح بھی کی۔ ان کے بعد شیخ دہلویؒ کی نسل سے مولانا سلام اللہ محدث رامپوریؒ نے علم حدیث کی خدمت کی اور محلّیٰ شرح مؤطا لکھ کر معلّمین حدیث کے واسطے بڑی آسانی بہم پہنچائی۔

شیخ عبدالحقؒ کے بعد حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ نہیں چلا۔ اس کے اسباب جو کچھ بھی ہوں۔ ہم اس سے قطع نظر کر کے آخر عہد مغلیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کی اولاد و احفاد اور تلامذہ نے علم حدیث کی ترویج و ترقی میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اورنگ زیب سے لے کر شاہ عالم تک دس گیارہ بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ ان میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ تقریباً چار سال کے ہوں گے کہ اورنگ زیب نے وفات پائی۔ بہادر شاہ اول اور جہاندار شاہ کے عہد میں آپ کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا۔ عہد فرخ سیر کے ختم پر ہندوستان کے اندر ان کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ فرخ سیر کے بعد تین بادشاہ اور ہوئے جو ایک ہی سال کے اندر اندر بادشاہت سے بے دخل ہو گئے۔ پھر محمد شاہ کا زمانہ آیا۔ عہد محمد شاہ کے وسط میں آپ حجاز گئے اور وہاں سے تقریباً دو سال کے بعد

مکہ و مدینہ کے علماء سے علم حدیث حاصل کر کے ہندوستان واپس ہوئے اور پرانی دہلی کے اُس مدرسہ میں جس میں شاہ عبدالرحیم دہلویؒ درس دیا کرتے تھے۔آپ نے بھی درس دینا شروع کیا۔اندازہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے پاس تعلیم حدیث حاصل کرنے کے لئے کثرت سے طلباء ملک کے گوشے گوشے سے آتے ہوں گے اور مدرسہ کا پرانا مکان طلباء کے ہجوم کے باعث یقیناً تنگ ثابت ہوا ہوگا۔محمد شاہ بادشاہ کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی کہ اس نے حضرت شاہ ولی اللہ کو بلا کر اندرون شہر دہلی ایک عالی شان مکان بنا دیا یہ مکان سکونت کے علاوہ ایک مستقل دارالعلوم بھی بن گیا۔اس مدرسہ کو مدرسہ رحیمیہ کہہ لیجئے یا دارالعلوم ولی اللّٰہی ۔بہرحال عہد محمد شاہ میں یہی وہ ادارۂ تعلیم حدیث ہے جس میں شاہ ولی اللہؒ نے اور شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے بعض تلامذہ نے اور بعد میں ان کے صاحبزادوں نے درس حدیث دیا۔

شاہ صاحبؒ کے صدہا شاگردوں میں شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، شاہ نور اللہؒ بڈھانوی، خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی کشمیریؒ، حاجی محمد سعید بریلویؒ، حاجی رفیع الدین فاروقیؒ مرادآبادی نمایاں شخصیات ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض شاگردوں نے دہلی میں رہ کر حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی حدیث کی تعلیم دی اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کی تکمیل میں بھی خاص طور پر حصہ لیا۔حاجی محمد سعید بریلویؒ کو حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے اپنے صاحبزادے کی تعلیم کے لئے بریلی بلا لیا تھا۔یہ مولانا نجم الغنی رامپوریؒ (مؤلف اخبار الصنادید و تاریخ اودھ وغیرہ) کے دادا تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی وفات کے وقت جو شاہ عالم ثانی کے ابتدائی عہد سلطنت میں ہوئی، آپ کے پانچ صاحبزادے موجود تھے۔ان میں سب سے بڑے شیخ محمدؒ تھے۔جو شاہ صاحبؒ کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔شاہ صاحبؒ کی دوسری بیوی سے چار فرزند تھے جن میں سب سے بڑے شاہ عبدالعزیزؒ تھے۔جو آپ کی وفات کے وقت ۱۶۔۱۷ سال کے تھے۔ان سے چھوٹے شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ تھے۔شاہ ولی اللہؒ کے وصال کے بعد تعلیم حدیث کا نظام شاہ عبدالعزیزؒ نے سنبھالا اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو اپنی نگرانی میں

تفسیر، حدیث، فقہ نیز جملہ علوم معقولات ومنقولات سے واقف کرایا۔ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے زمانہ میں حدیث وفقہ پڑھنے والے طلبہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے کھینچ کر آئے۔ جب تک شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کی بینائی برقرار رہی، خود درس دیا اور وفات سے تقریباً ۲۵۔۳۰ سال پہلے آپ نے اپنی بینائی جاتی رہنے کی وجہ سے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کو درس حدیث کا کام سپرد کردیا تھا۔ آپ کی تدریس کے ابتدائی دور میں آپ کے فیض تعلیم سے بڑے بڑے جید علماء، فقہا اور محدثین نمودار ہوئے۔ جن میں حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ بھی ہیں۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ گوناگوں صفات کے حامل تھے۔ وہ ایک بے نظیر محدث بھی تھے۔ با کمال فقیہ بھی، طبیب روحانی بھی تھے اور طبیبِ جسمانی بھی۔ وہ ایک مدرس بھی تھے اور مصنف بھی، شاعر و ادیب بھی تھے اور افتاء نویسی کے ساتھ بہترین انشاء پرداز اور نثر نگار بھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے تینوں بھائی ان کے سامنے ہی وفات پا گئے تھے۔ اس لئے ان کے بعد ان کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے مسند درس کو آباد کیا اور ۱۹۔۲۰ سال تک اپنے نانا کی مسند پر بیٹھ کر درس حدیث دیا۔ اس کے بعد وہ اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوبؒ مکہ کو ہجرت کر گئے۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالیؒ نے شاہ محمد یعقوبؒ کے حلقہ درس میں حدیث پڑھی تھی۔ شاہ محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد شاہ مخصوص اللہ ابن شاہ رفیع الدینؒ نے مدرسہ رحیمیہ کی تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ اس کے اہتمام کا بار بھی اپنے بھائی شاہ محمد موسیٰؒ کے ساتھ اٹھایا۔ شاہ عبدالحیؒ نبیرۂ شاہ نور اللہ اور شاہ محمد اسماعیلؒ نبیرۂ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی تقریر وتحریر کے ذریعہ علم حدیث کی اشاعت کی۔ شاہ مخصوص اللہؒ سرسید احمد خاں کے اساتذہ میں سے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہؒ نے جو شاہ صاحبؒ کے شاگرد بھی تھے، مشغلہ طب کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رکھا تھا۔ ان کی تصنیفات میں من جملہ ان کے ''تخریج احادیث ہدایہ'' بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگردوں میں ایک ممتاز شاگرد شاہ محمد عاشق پھلتیؒ ہیں۔ جنھوں نے شاہ صاحبؒ سے سندِ حدیث پانے کے ساتھ ساتھ مسند خلافت بھی حاصل کی تھی۔ اُن کو بہت سی خصوصیات حاصل تھیں اور وہ حجاز کے سفر میں بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اساتذۂ حرمین سے حضرت شاہ صاحبؒ نے جو کچھ درسی فائدہ حاصل کیا اس میں شاہ محمد عاشقؒ بھی شریک تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تقریباً تمام تصانیف کو شاہ محمد عاشقؒ ہی نے تسوید سے تبییض کی شکل میں تبدیل کیا ہے۔ خصوصاً مصفّٰی شرح موطا کی تبییض میں شاہ محمد عاشقؒ کی محنت کو بہت کچھ دخل ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ علاوہ دہلی کے مرکزی مدرسے کے شاہ محمد عاشقؒ کی خانقاہ پھلت ضلع مظفرنگر میں جہاں بہت سے تشنگان معرفت آتے اور بیعت ہوتے تھے۔ تشنگان علم حدیث بھی جوق در جوق آتے اور فیض یاب ہوتے ہوں گے۔ شاہ محمد عاشقؒ نے اپنے صاحبزادوں شاہ عبدالرحمٰنؒ اور شاہ محمد فائقؒ کو خود پڑھایا تھا۔ مکاتیب شاہ ولی اللہؒ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد عاشقؒ کو تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ تعلیم وتبلیغ سے بھی بہت کچھ تعلق تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگردوں میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی ہیں جو ''بیہقیِ وقت'' کہلاتے تھے۔ اس لقب سے علم حدیث میں ان کی امتیازی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے پانی پت کے اندر تدریس وتصنیف کا کام جاری رکھا۔ آپ کی علم حدیث میں ایک مبسوط کتاب ہے جو دو جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر وفقہ میں بھی آپ کی کئی تصانیف ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگردوں میں علامہ سید مرتضٰی ابن محمد بلگرامی ثم زبیدی بھی ہوئے ہیں۔ جنھوں نے حضرت شاہ صاحب سے اجازتِ حدیث حاصل کرنے کے بعد مولانا خیرالدین سورتیؒ اور حجاز میں، مصر، شام وغیرہ کے متعدد علماء سے اجازت حاصل کی تھی اور بعد میں مصر وغیرہ میں درس بھی دیا تھا۔ علماء جامعہ ازھر نے بھی آپ سے سند حدیث حاصل کی تھی۔ آپ نے ۱۴ ارسال تک مسلسل محنت کر کے ''تاج العروس شرح قاموس'' دس جلدوں میں لکھی اور احیاء العلوم کی شرح بیس جلدوں میں کی۔ آپ کی سو سے زیادہ تصنیفات وتالیفات ہیں جن میں سے چندفنِ احادیث میں بھی ہیں۔ مصر میں آپ کا

انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگردوں میں قاری امام الدین نخشبی امروہیؒ بھی ہیں جو حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے خلیفہ مجاز تھے اور علم تجوید میں مولانا قاری کرم اللہ محدثؒ کے شاگرد تھے۔ قاری امام الدینؒ امروہی علم تجوید وقرأت کے درس کے ساتھ ساتھ حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔ ہندوستان کے مشہور محدث قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ نے علم قرأت امروہہ آکر قاری امام الدین نخشبیؒ سے پڑھا تھا اور بخاری شریف کے چند پارے بھی یہاں پڑھے تھے۔

بعدہٗ دہلی جاکر شاہ محمد اسحاقؒ صاحب سے علومِ حدیث کی تکمیل کی۔ شاہ عبدالعزیز محدثؒ اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد قاری کرم اللہ محدث دہلویؒ فن قرأت، تجوید اور تمام علوم عقلیہ ونقلیہ میں عموماً اور علم حدیث میں خصوصاً مہارت تامہ رکھتے تھے۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ آپ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے سفر نامہ حجاز[1] ''ترغیب السالک الی احسن المسالک'' میں آپ کا تذکرہ بہت وقیع الفاظ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کے (مولانا کرم اللہ محدثؒ) فضائل کیا بیان کروں۔ دفتروں میں نہیں سما سکتے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت والا جامع علوم ظاہر وباطن تھے۔ فن حدیث میں ان کو جو مہارت حاصل تھی وہ کسی میں کم ہوتی ہے۔ حقائق ومعارف کے لحاظ سے ان کا جو مرتبہ تھا وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے فنِ قرأت وتجوید میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔''

مولانا کرم اللہ محدث دہلویؒ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے خلیفہ تھے۔ سورت میں آپ کا مزار ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ اور ان کے بھائیوں کے تلامذہ میں مرزا حسن علی لکھنویؒ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ جو فن حدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے اجازت یافتہ شاگردوں میں حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج

[1] اس سفر نامہ کا تلخیص وترجمہ مولانا فریدیؒ نے کیا ہے جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔ (محب الحق)

مرادآبادیؒ کا نام بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ ان کو اذکار و اوراد اور مریدین کی روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ درس حدیث کا بھی بہت موقع ملا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے محدثین اور صاحبان علم وفضل نے آپ سے سند حدیث اور اجازت حدیث حاصل کی ہے۔ چونکہ آپ کی سند اونچی تھی اس لئے آپ کی خدمت میں دور دور سے شائقین علم حدیث آتے تھے اور تلمذ کا فخر حاصل کرتے تھے۔

سلطنت مغلیہ کے آخر دور خصوصاً عہد بہادر شاہ ظفر میں ہندوستان کے اندر ایسٹ انڈیا کمپنی اوراس کے ارباب حل وعقد کے نظریات سیاست کا غلبہ ہو چکا تھا۔ انگریز ہندوستان کے باشندوں کو رنگ وروپ کے لحاظ سے ہندوستانی اور دماغ وخیالات کے اعتبار سے یورپین بنانا چاہتے تھے۔ اس بات کو ہندوستان کے مختلف مذاہب کے افراد نے عموماً اور مسلمانوں نے خصوصاً محسوس کیا۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں تقریباً پورے ہندوستان کے اندر آزادی حاصل کرنے کی تحریک بڑے پیانے پر شروع ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کا نمایاں حصہ تھا اور وہ انگریزوں کے مقابلے میں استخلاص وطن ہی کے خواہاں نہ تھے بلکہ مذہب اسلام کے تحفظ کے لئے بھی میدان میں آئے تھے۔ یہ تحریک پورے جوش وخروش کے ساتھ چل کر بالآخر ناکام ہوئی۔ انگریز پوری قوت کے ساتھ جذبۂ انتقام کے تقاضوں کو پورا کرنے لگا اور اس انتقام کا رخ براہ راست مسلمانوں کی طرف زیادہ تھا۔ بڑے بڑے علماء کو اس نے پھانسی پر لٹکایا، کالے پانی بھجوایا اور ان کے مکانات تک کھدوا کر پھینک دئے۔ جو علماء اور مشائخ انگریز کے پنجۂ انتقام سے بچ گئے تھے ان میں سے کچھ نے ہجرت کی راہ اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ جنھوں نے ''آگرہ'' میں پادری فنڈر کو شکست دی تھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے فرو ہونے پر مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے اور وہاں پر انھوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کر لیا تھا۔ اس وقت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے بھی مکہ معظمہ ہجرت کی۔ حافظ ضامن شہیدؒ اور بہت سے جانبازان حریت میدان ''شاملی'' میں شہید ہو گئے تھے۔

میدان شاملی میں انگریزوں کی فوج سے نبرد آزما ہونے والوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی تھے۔ اول الذکر نے مصلحتاً یہ طے کیا کہ اپنے آپ کو انگریز کے انتقام سے محفوظ

رکھنے کی کوشش کی جائے اور وہ روپوش ہو گئے۔ بالآخر ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی کے بعد وہ اپنے دینی و ملی، تعلیمی و تبلیغی کام میں مصروف ہو گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار کر لئے گئے اور چھ ماہ تک مظفر نگر جیل میں رہے۔ جیل سے چھوٹ کر انھوں نے اپنے وطن گنگوہ کے اندر مدرسہ وخانقاہ سے اپنا تعلق رکھا اور پوری عمر اسی میں گذار دی۔

۱۸۵۷ء کے بعد بھی عیسائی مشنریوں نے اپنا کام تیزی سے جاری رکھا اور ان مشنریوں کا سب بڑا حریف مذہب اسلام تھا۔ اس لئے سلسلہ ولی اللہی کے اُس وقت کے نمائندوں نے بڑی جدو جہد اور محنت و جانفشانی سے تعلیمی ادارے قائم کئے اور اپنی تحریروں وتقریروں، تصانیفات وتالیفات، مناظروں اور مباحثوں کے ذریعہ اپنے مذہبی امتیاز وانفرادیت کو برقرار رکھنے کی عظیم کوشش کی۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے تقریباً دس سال بعد دیوبند اور سہارنپور میں دو عظیم تعلیمی درس گاہوں کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس وقت میرٹھ کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور طلبہ کو دینی علوم، تفسیر و حدیث وغیرہ کا درس بھی دیتے تھے۔ وہ مدرسہ دیوبند کے خصوصی ممبر اور رکن اعظم بھی تھے۔ سہارنپور میں مولانا سعادت علیؒ نے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مدرسہ مظاہر علوم میں قرآن وحدیث کا سلسلۂ درس قائم کیا۔ اس مدرسہ میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ اور مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے اپنے اپنے وقت میں درس حدیث دیا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جو اس وقت بفضل الٰہی حیات ہیں[1] حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے خلیفہ اور شاگرد رشید ہیں۔ ''بذل المجهود''، شرح ابی داؤد مولانا خلیل احمد محدثؒ کی معرکۃ الآراء شرح ہے جس کی تسوید وترتیب میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بھی شریک رہے ہیں۔ مؤخر الذکر نے ''اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک'' کئی جلدوں میں لکھ کر عالم اسلامی میں شہرت دوام حاصل کی ہے۔

آگے چل کر دیوبند کا مدرسہ دار العلوم کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہم دار العلوم کی برطانوی عہد میں

---

[1] آپ کا وصال مدینہ منورہ میں کیم شعبان ۱۴۰۲ھ موافق ۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ جنت البقیع ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

درس حدیث کی سرگرمیوں کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ ان چند شخصیتوں کا اجمالی تذکرہ کریں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد فن حدیث کی ترویج و اشاعت اور تعلیم حدیث کی گرم رفتاری میں نمایاں حصہ لیا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے خانقاہ قدوسیہ (گنگوہ) میں رہ کر درس حدیث کا ایک مکمل نظام قائم کیا اور عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ملک کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے باکمال اور ذی استعداد طلبہ کھینچ کھینچ کر گنگوہ کی خانقاہ میں آتے رہے اور حدیث کا درس لیتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی تزکیۂ نفس کا بھی انتظام تھا۔ آپ کی تقاریر حدیث قلمبند ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا عالم علی محدث نگینوی ثم مرادآبادیؒ نے مرادآباد میں اور ان کے شاگرد مولانا حسن شاہ محدثؒ نے رام پور میں علم حدیث کے درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولانا حسن شاہؒ کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد شاہ محدث رام پوریؒ نے مدرسہ عالیہ رام پور میں کچھ عرصہ اور زیادہ تر اپنے مکان اور مسجد میں درس حدیث دیا۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے طالبان علم حدیث ان کے درس میں شریک ہونے آتے تھے۔ مولانا محمد شاہ محدثؒ کے شاگرد مولانا محمد منور علی رام پوریؒ نے ڈھاکہ میں درس حدیث کا نظام قائم کیا۔

لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے درس و تدریس اور تحریر و تصنیف کے ذریعہ علم حدیث کو اور فن رجال حدیث کو بہت ترقی دی۔ علامہ ظہیر احسن شوق نیمویؒ حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ کے ایک ایسے باکمال شاگرد ہیں جنھوں نے علم حدیث میں درجہ کمال حاصل کیا تھا اور جن کی قابلیت کا شہرہ عالم اسلام تک پہنچا ہے۔

مدرسہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں مولانا نانوتویؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ نے ۲۵۔۲۶ سال مسلسل تمام علوم دینیہ کا بالعموم اور علم حدیث کا بالخصوص درس دیا۔ اپنے وطن میں درس دینے سے پہلے وہ خورجہ، سنبھل، دہلی اور مرادآباد میں بھی مدرس رہے تھے۔ آپ

کے شاگرد رشید مولانا حافظ عبدالرحمٰن مفسر صدیقی امروہیؒ نے بھی آپ کے بعد تقریباً تیس سال تک اپنے استاد کے مدرسہ میں تفسیر و حدیث کے اسباق پڑھائے اور اطراف و اکناف ہند بلکہ بیرون ہند کے طلباء بھی اسی طرح جوق در جوق اور قطار اندر قطار آتے رہے جس طرح ان کے استاد مکرم کے زمانے میں آتے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن مفسر امروہیؒ نے چند سال مدرسہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں بھی درس حدیث[1] دیا تھا۔

دہلی میں میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے جن کی عمر خاصی طویل ہوئی، شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے اجازت یافتہ شاگرد ہونے کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی اور درس حدیث کا سلسلہ دیر تک قائم رکھا۔ مولانا عبدالعلی فریدی قاسمیؒ جو حضرت نانوتویؒ کے شاگرد تھے اور مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ اور مولانا محبوب الٰہی دیوبندیؒ نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔ مدرسہ عبدالرب دہلی میں دیگر علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ حدیث کا درس بھی مدتوں دیا ہے۔

مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیوں اور آزادی وطن کی پیہم کوششوں کے ساتھ ساتھ درس و افتا کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے درس حدیث سے بہت سے علماء نے بھی فائدہ اٹھایا۔

بھوپال میں نواب صدیق حسن خاںؒ نے فن حدیث میں بہت سی کتابیں لکھیں نیز مولانا عبدالقیوم بڈھانویؒ ابن مولانا عبدالحی بڈھانویؒ نے بھی بھوپال کے علمی ماحول میں درس حدیث کا افادہ عام کیا۔ ان سے بہتوں کو اجازت حدیث حاصل ہوئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ اور مولانا شاہ حلیم عطا سلونیؒ نے درس حدیث کے ذریعہ اشاعت فن حدیث کا کام انجام دیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کتاب سیرۃ النبی کی تکمیل کر کے اردو داں طبقے کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باحسن وجوہ روشناس کرایا۔

پانی پت میں قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ آخر دم تک درس حدیث میں مشغول رہے۔ اسی طرح ملک کے ہر صوبے اور ہر بڑے شہر میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے درس حدیث کا سلسلہ برطانوی

[1] امروہہ سے پہلے مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس دیا اور درمیان میں ریاست مینڈھو اور دارالعلوم دیوبند میں بھی۔ (محب الحق)

استعمار کے عہد میں بھی جاری رہا اور متعدد شاندار اور معرکتہ الآرا کتابیں فن حدیث میں شائع ہوئیں۔ دکن میں مولانا عبداللہ نقشبندیؒ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ تحریر و تقریر کے ذریعہ علم حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اب ہم تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس عظیم درس گاہ کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ تھے جو مولانا مملوک علی صدیقی نانوتویؒ استاد علمائے دہلی کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے تفسیر و فقہ کے ساتھ حدیث کا درس بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے دیا اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے باکمال شاگردان کے حلقۂ درس سے نکلے۔

مولانا محمد یعقوبؒ کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ مسند صدارت پر فائز ہوئے اور مدتوں دارالعلوم دیوبند کی بزم حدیث آپ کے انفاس قدسیہ اور آپ کی پُر مغز تقاریر سے شاد کام رہی۔ تا آنکہ حصول آزادی کی جدوجہد کے نتیجے میں آپ فرنگی جور و استبداد کا نشانہ بنے اور ''جزیرۂ مالٹا'' میں اسیر ہوئے لیکن وہاں بھی قرآن وحدیث کے درس کا کام جاری رکھا۔ وہاں سے رہا ہو کر ہندوستان آئے۔ مالٹا کی اسارت سے پہلے ''مکہ معظمہ'' میں آپ کا کچھ عرصہ تک قیام رہا اور وہاں بھی آپ نے بخاری شریف کا درس دیا۔

شیخ الہندؒ کا یہ آخری سفر ح ریشمی خطوط کی تحریک کے سلسلے میں تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی اس تحریک میں خاص مشیر تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے دست راست تھے۔ انگریز کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لئے شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا نے جو پروگرام بنایا تھا اس کی رو سے مولانا سندھیؒ کو افغانستان میں کام کرنا تھا لیکن ریشمی خطوط کا راز فاش ہونے پر شیخ الہندؒ مالٹا میں قید کر دیے گئے اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ طویل عرصے تک جلاوطنی کے عالم میں ہندوستان کے باہر رہے۔ مکہ معظمہ میں بھی آپ نے سکونت اختیار کی تھی اور وہاں درس قرآن وحدیث کا مشغلہ جاری رکھا تھا۔ کتب و علوم ولی اللّٰہی سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حجۃ اللہ البالغہ مولفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو اسرار حدیث میں بے نظیر کتاب ہے مولانا سندھیؒ

نے اس کو خاص طور پر اپنا مشغل راہ بنایا تھا۔ ہندوستان سے باہر وہ زیادہ تر اسی کتاب کے درس و مذاکرہ میں مشغول رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد مولانا انور شاہ محدث کشمیریؒ نے صدارت دار العلوم کا عہدہ سنبھالا اور بہت کامیابی کے ساتھ حدیث کا درس دیا۔ انھوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کے درس بخاری کو بعض باکمال شاگردوں نے لکھ لیا تھا اور عربی زبان میں منتقل کر کے اسے ''فیض الباری'' کے نام سے چھپوا دیا ہے۔ کچھ عرصہ تک آپ نے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ڈابھیل ضلع سورت میں بھی حدیث کا درس دیا اور دور دور سے طلباء علم حدیث وہاں پہنچ کر حلقہ درس میں شامل ہوتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حدیث کی مشہور کتاب مسلم کی شرح بھی لکھی تھی جس کا نام ''فتح الملہم'' ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیریؒ کے ڈابھیل چلے جانے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسن) دار العلوم کی مسند صدارت پر بصد وقار و تمکین رونق افروز ہوئے۔ آپ کے زمانے میں[۱] دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد پچھلے دور کے مقابلے میں بہت بڑھ گئی تھی۔ آپ نے ''مسجد نبویؐ مدینہ منورہ'' میں بھی برسوں تک درس حدیث دیا تھا اور دار العلوم میں بھی آپ کے درس کی مدت خاصی طویل رہی۔ تقریباً تیس سال تک دار العلوم کے بام و در آپ کی شاندار اور پُر شکوہ تقاریر حدیث سے گونجتے رہے۔ آپ کی تقریر حدیث کو ہر سال بہت سے ذی استعداد طلبہ اردو میں قلمبند کر لیا کرتے تھے اور مولانا علی احمد خیلی چاٹگامیؒ نے ''ہدیۃ المجتبیٰ'' کے نام سے اسے عربی زبان میں منتقل کیا ہے جس کا کچھ حصہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگردوں کی تعداد ہندوستان میں اور بیرون ہند میں بھی ہزاروں سے متجاوز ہے۔ آپ کے وصال کے بعد مولانا سید فخر الدین محدثؒ نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید تھے اس اہم کام کو انجام دیا۔ وہ دار العلوم دیو بند سے پہلے مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں شیخ

[۱] دار العلوم دیو بند سے پہلے جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ سلہٹ میں بھی حضرت مدنیؒ نے درس حدیث دیا۔ (محب الحق)

الحدیث تھے۔ دارالعلوم میں آپ کے زمانے میں طلبہ کی آمد ملک کے ہر گوشے سے غالباً پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی رہی، کم نہیں ہوئی۔ آپ کی ذہانت وفطانت اور فصاحت وبلاغت مسلمہ تھی اور حدیث کی شرح و تفسیر اپنی دلنشین تقریر میں اس انداز سے کرتے تھے کہ تمام شرکائے حلقہ درس کو اطمینان حاصل ہو جاتا تھا۔ آپ کی تقاریر کو بھی قلمبند کر لیا گیا تھا اور اس کی چند جلدیں "ایضاح البخاری" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

ساقی خم خانہ توحید ومعرفت جانباز معرکہ جہاد شاملی

شہید راہ حق حضرت حافظ محمد ضامن فاروقی چشتی تھانویؒ

بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن ☆ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(مرزا مظہر جانجاناںؒ)

بحمد اللہ امسال[1] حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ یاب ہوا اس سفر مقدس کے برکات میں سے یہ بھی ہے کہ مکہ معظمہ میں دوبار مدرسہ صولتیہ کا عظیم الشان کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا۔

مجھے عالی جناب شیخ سلیم مدظلہ[2] ناظم مدرسہ صولتیہ سے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کا کتب خانہ بھی اسی کتب خانے میں شامل ہو گیا ہے۔ اسی لئے دوبارہ بعد ایام حج مدرسہ صولتیہ کے کتب خانے کو دیکھا تا کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی زیارت سے مشرف ہو سکوں چونکہ حضرت حاجی صاحبؒ کی تمام کتابیں یکجا نہ تھیں اس لئے سب نہ دیکھ سکا انھیں کتابوں میں ایک کتاب ملی جو تصوف کے فن میں مطبوعہ تھی اور اس کے آخر میں ایک قلمی رسالہ تھا اور ایک مقام پر اس کتاب میں حضرت حاجی صاحبؒ کی مہر بھی لگی ہوئی تھی

اس قلمی رسالہ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے حالات میں ہے اس

[1] حضرت مولانا فریدی امروہیؒ نے ۱۹۶۱ء میں حج کیا تھا جو اس سال شمسی حساب سے مئی میں ہوا تھا اور یہ مضمون ماہنامہ تذکرہ دیوبند کے نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ [2] جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا تو مولانا محمد سلیم صاحب بقید حیات تھے۔ ۲؍شعبان ۱۳۹۷ھ موافق ۱۸؍جولائی ۱۹۷۷ء میں وصال ہوا اور جنت المعلیٰ ابدی آرام گاہ بنی۔ (محب الحق)

میں مؤلف کا نام محمد ضیاء الدین بن غلام محی الدین بن غلام مصطفےٰ انصاری رامپوری درج ہے یہ رام پور 'منہیاراں' ضلع سہارن پور کے مشہور بزرگ حضرت حکیم محمد ضیاء الدین صاحبؒ ہیں جو حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے مخلص و جاں نثار مرید و معتقد تھے اس رسالے کا نام ''مونس مہجوراں'' ہے۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ جہاد میں جب مرشد کامل حضرت حافظ صاحب تھانویؒ شہید ہو گئے تو راہ سلوک طے کرنے والے مرید مہجور کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی عجیب سراسیمگی قلق اور اضطراب کا عالم تھا۔ ان کے قلب و جگر کی کائنات پر فرقت حبیب کا صدمہ جانکاہ چھایا ہوا تھا اسی عالم یاس و حرماں اور کیفیت رنج و غم میں اپنے پیر و مرشد کے مختصر حالات لکھے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ داستان الم بھی ہے جس کو سن کر پتھر کا جگر پانی ہوتا ہے مؤلف نے غالباً اصل مسودہ ہی حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں مکہ معظمہ بھیج دیا۔

اس رسالے میں اگر چہ سوانح حیات کم ہیں مگر اتنے حالات بھی کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہیں۔ اس کے لفظ لفظ سے سوز دل آشکارا ہے جگہ جگہ غم انگیز فراقیہ اشعار ہیں۔ کرامات پیر و مرشد کا بھی ایک باب ہے تاریخ ہائے شہادت بھی درج ہیں۔ قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا لکھا ہوا مرثیہ بھی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا لکھا ہوا سراپائے حافظ صاحب بھی ہے۔ یہ سب قیمتی اور نادر سرمایہ ہے مگر حافظ صاحب شہید کا سن پیدائش، آپ کے ابتدائی حالات، تعلیمی کیفیات اولاد حتی کہ عمر کی مقدار تک اس میں موجود نہیں ہے دراصل حکیم صاحب کے پیش نظر اپنے مرشد کامل کی مفصل سوانح عمری لکھنا ہے بھی نہیں یوں سمجھیے کہ جو کچھ حالات آ گئے ہیں وہ ضمنی حیثیت سے ہیں، ان کا مقصود تو یاد مرشد میں اپنے نالہ ہائے دل کو سپرد قلم کرنا تھا اور بس۔

ہاں اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل ☆ لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے (فانی)

میں نے مناسب سمجھا کہ اس رسالے کو خاص ترتیب کے ساتھ ایک مضمون کی صورت میں مرتب کروں چنانچہ میں نے جلدی جلدی اس کتاب کے اہم مقامات کی نقل کی اور اس کے اکثر و بیشتر

حصے کو اپنے قلم کی گرفت میں لے آیا اور آج ناظرین تذکرہ کی خدمت میں یہ مبارک ہدیہ پیش کر رہا ہوں۔

میں اس سلسلے میں محترم المقام شیخ سلیم مدظلہ ناظم مدرسہ صولتیہ، ان کے صاحبزادے شیخ شمیم[1] سلمہ، مولانا افتخار فریدی[2] مرادآبادی اور حکیم محمد یامین صاحب ناظم کتب خانہ زید مجدہما کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا ان حضرات نے اس کتاب کی نقل میں میری مدد فرمائی اور میرے لئے اتنی سہولیتیں بہم پہونچادیں کہ میں نے اطمینان کے ساتھ مسجد الحرام کے احاطے میں دفتر صولتیہ کے اندر بیٹھ کر حسب دلخواہ اس کی نقل کرلی۔

اس رسالے کے مندرجہ حالات کے علاوہ حضرت حافظ صاحب شہیدؒ کے کچھ تھوڑے بہت حالات ملتے ہیں تو وہ حضرت حاجی صاحبؒ کے حالات کے ضمن میں یا امیر الروایات یا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں مل جاتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ شیخ طریقت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔

۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے مزاج میں اخفاء حال اور ظرافت کا مادہ تھا۔

خانقاہ تھانہ بھون جو مسجد پیر محمدؒ میں واقع ہے اور ایک وقت میں وہ ''دوکان معرفت'' کہلاتی تھی وہاں حضرت حاجی صاحبؒ حضرت حافظ صاحبؒ اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ تین بزرگ ایک وقت میں جمع رہے تھے۔ حافظ صاحب شہیدؒ کو حقہ نوشی کا شوق تھا۔ خانقاہ کے باہر کبھی حقہ نوش فرماتے ہوتے اور کوئی نو وارد ملاقات کے لئے آتا تو ظرافت طبع کی رو سے فرمادیا کرتے تھے۔ بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ وہ اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو مولانا محمد سے پوچھو اور حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھ جاؤ۔

سوانح قاسمی اور سوانح رشیدی میں معرکہ شاملی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں حضرت حافظ صاحبؒ کا ذکر آتا ہے کہ وہ اس معرکہ میں شہید ہوئے لیکن ان کی کتنی عظیم شخصیت تھی۔ علم باطن میں وہ کس درجہ ممتاز

---

[1] مولانا شمیم صاحب کا ۲ر شعبان ۱۴۱۲ھ موافق یکم رمارچ ۱۹۹۲ء میں وصال ہوا۔ [2] مشہور مجاہد آزادی تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن اور اکابر و اسلاف کے شدائی کا ۳ر رجب ۱۴۱۹ھ موافق ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۸ء کو وصال ہوا۔ (محب الحق)

تھے ان کی بدولت بزم طریقت کی رونق کس قدر بڑھ گئی تھی اس کا اندازہ اسی رسالے سے ہوا۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ جہاد کا حال اور پیر و مرشد کا واقعہ شہادت حکیم محمد ضیاء الدینؒ نے بھی مصلحتاً بہت ہی مجمل طور پر اور مختصر لکھا ہے اور مصلحت ہی غالباً اس کی محرک ہوئی کہ انگریز کے باغی ایک درویش صفت مرد مجاہد کے حالات کو قلمبند کر کے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں مکہ معظمہ کسی نہ کسی طرح بھجوادیا اور اس طرح یہ رسالہ محفوظ دمصوٴن رہا ورنہ انگریز نے تو مظلوم شہیدوں کے کارناموں کو مٹانے، بھلانے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ میرا غالب خیال یہ ہے کہ اس رسالے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ حکیم صاحب ۱۸۵۷ء کے معرکے کو ذرا تفصیل سے لکھتے مگر اس زمانے کی مجبوری کا آج کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بہت سے علماء وصلحا شہید ہوئے بہت سے پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے، کچھ جلاوطن کر کے کالا پانی بھیجے گئے، کچھ ہجرت کر کے حرمین شریفین چلے گئے، انگریز کی داروگیر نے ایک ہنگامہ قیامت بر پا کر رکھا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ المشائخ حضرت حاجی صاحبؒ براہ کراچی مکہ معظمہ پہونچے ہیں مشہور مناظر اور مجاہد اسلام حضرت مولانا شیخ رحمت اللہ کیرانویؒ ''سورت کے راستے سے'' ''بلد امین'' کو روانہ ہوئے ہیں۔ شاہ احمد سعید مجددی دہلویؒ اور ان کے بھائی شاہ عبدالغنی مجددیؒ مع افراد خاندان کے دہلی کی خانقاہ حضرت شاہ غلام علیؒ سے جدا ہو کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر چکے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شہدا اور مہاجرین کی یاد میں خون کے آنسو بہانے اور مسلمانان ہند کی حالت زار پر پھوٹ پھوٹ کر رونے اور ملت بیضا کے فروغ رفتہ کا تذکرہ اور تعمیر نو کی فکر کرنے والے چند اہل دل علماء باقی رہ گئے ہیں جن میں نمایاں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ ہیں۔

میدان شاملی میں بنا بنایا کھیل بگڑ جانے اور بہت سے مجاہدین خصوصاً حضرت حافظ صاحبؒ کی

شہادت کے حادثہ جانکاہ سے اکابر ملت کے دلوں میں اضطراب وبے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ایسی حالت میں کس میں ہمت تھی کہ روداد غم تفصیل سے سنائے۔

اب میں حکیم محمد ضیاء الدینؒ کے بیانات اوران اکابر کے جذبات کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ حافظ صاحبؒ کے احباب مریدین اور معتقدین کوان کی جدائی کا کس قدر صدمہ تھا۔

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ مرید بہت کم فرمایا کرتے تھے۔ حکیم محمد ضیاء الدین صاحب رامپوریؒ بہ سفارش حضرت حاجی صاحبؒ شرف بیعت سے مشرف ہوئے تھے اور بیعت ہونے کے بعد وادی سلوک میں ابھی گامزن ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

''اسی تمنا اور تجسس میں رہتا کہ حق تعالیٰ کسی طرح مجھ کو بھی اس طریق سے کچھ حصہ نصیب فرمادے اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ کیا بعید ہے کہ حضرت پیر و مرشد کے تصدق سے اللہ تعالیٰ اپنی محبت اور اخلاص بھی عطا فرمائے۔

یہ خبر نہ تھی کہ پردہ غیب سے کچھ اور ظاہر ہوا چاہتا ہے اسی توقع اور کشاکش میں تھا کہ ناگاہ گردش ایام اور شامت افعال اس شکستہ حال سے یہ صورت پیش آئی کہ دفعتہً جہان میں ایک شورنشور پیدا ہوا۔ ہنگامہ قتل اور غارت کا چاروں طرف سے ایسا گرم ہوا کہ شاید کبھی نہ ہوا ہوگا اور جو لوگ دیندار اور جری تھے غیرت اسلام سے اکثر شہید ہوکر سوئے دار البقاء رحلت فرما ہوئے یا خانہ ویراں ہوکر اور ''بدراہی'' اس ملک کی دیکھ کر بیت اللہ شریف یا کسی اور دار اسلام کو تشریف لے گئے اب ہندوستان میں گویا دنیا پلٹ گئی۔

اسلام پست ہوگیا دین ودنیا کی اچھی بات گم ہوگئی کیا کروں یہ فسانہ غیر مقصود ہے اپنا درد وغم اور قصہ حسرت والم کچھ اور ہے ہر کوئی اپنی بلا میں مبتلا ہے۔ آتش مفارقت جی جلائے دیتی ہے، دل مہجور گھبراتا ہے سوزش درونی کو بیان کیا چاہتا ہے اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا۔ حاصل کلام اس ہنگامے میں جلال کبریائی کو جوش وخروش تھا اور مدہوشان شیون الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق وشوق تھا۔

چنانچہ حضرت مرشدیؒ نے بھی ضرر دنیائے دنیہ کا کچھ خیال نہ فرمایا کمر ہمت چست باندھ کرام حق پر جان و مال کو قربان کیا اور ذوق وشوق و دیدار الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا۔

اور تمنائے شربت شہادت و جام کوثر میں ہماری بیکسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا ہمت مرداں، مدد خدا کا تماشہ دکھلا کر مردانہ اور مشتاقانہ ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ (کو) برسر معرکہ ہو کر جام شہادت نوش فرمایا۔ واہ کیا خوب داد ہمت، لے گئے اور داغ حسرت دے گئے۔

(دوہرہ)

ساجن دکھیا کر گئے اور سکھ کو لے گئے ساتھ ☆ جنم پچھوہا دے گئے اور پھر نہ پوچھی بات

(نیچینی)

رفتی و مرا خبر نہ کردی ☆ بر بیکسیم نظر نہ کردی

دفعتہً حشر برپا ہوا جہاں تہ و بالا ہو گیا۔

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا ☆ مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو رہی ہری

ادھر رفعت اور شان دوبالا ہوئی ادھر جہاں تیرہ و تاریک نظر آیا یہ جان ناتواں سخت گھبراتی تھی سینہ پھٹا جاتا تھا، عقل حیران ہوئی۔

یہ نہ تھی امید ہم کو ساقی گلفام سے ☆ دور ساغر میں ہمیں محروم رکھا جام سے

ناگاہ جناب حاجی صاحب قبلہ سلمہ اللہ تعالیٰ کو جناب باری سے الہام ہوا کہ بیت اللہ کو آؤ چنانچہ وہ بھی بالہام حق، بیت اللہ شریف کو تشریف لے گئے، وائے محرومی کے بجائے حضرت پیر و مرشدؒ جو باقی تھے ان سے یوں اپنی مفارقت ہوئی۔

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے ☆ کسے بہ بیکسی من نمی برد خبرے

ہائے بیدادی کیسے کیسے مربی جدا ہوئے اس پر بھی ہم سر پھرے جیتے رہے... یہ نظم حسب حال ہے۔

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا ☆ ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی ایک شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خاک گلشن میں ☆ بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

آہ جس وقت وہ صحبت یاد آتی ہے اور وہ صورت شریف رحمتہ اللہ علیہ نظر میں پھر جاتی ہے اس دل ناشاد پر جو کچھ گزرتا ہے بیان نہیں ہوسکتا ہر چند تڑپ تڑپ کر جی چاہتا ہے کہ مرجاؤں، اس ہر دم کی جاں کنی سے چھوٹ جاؤں مگر کچھ بس نہیں چلتا اور از خود مرا نہیں جاتا، لاچار کلیجہ پکڑ بے اختیار اپنی زندگی پر رو دیتا ہوں، جب کہیں صورت مراد کی نہ بندھی اور کچھ بس نہ چلا بجز عرض حاجت کوئی چارہ نہ دیکھا اب اکثر یہ دعا ورد زباں اور مونس جاں ہے۔

یہ غلام آپ کا اے شاہ محمد ضامنؒ ☆ کب تلک حسرت دیدار میں کاٹے گا دن

خانقاہ تھانہ بھون کا ایک منظر:

حکیم صاحبؒ خانقاہ تھانہ بھون کی اس طرح منظر کشی کر کے دور ماضی کی یاد تازہ فرماتے ہیں اور جب کبھی وہ چمنستان اسرار الٰہی آباد تھا اور وہ نخل مراد پُر باز اوصاف نامتناہی موجود تھے، عجب رنگ و روپ رہتا تھا۔ کہیں درس علم اور کہیں تعلیم عمل اور کبھی وعظ و پند کبھی زبان بند، مشغول با خداوند، کہیں حلقہ توجہ کا، کہیں جلوہ ذکر جہر کا، کسی کو حالت گریہ کسی کو قہقہہ، کوئی مست و بیہوش، کوئی محو و مستغرق، دل دنیا سے فارغ، اللہ کا طالب ہر ایک اپنے حال میں مست رہتا تھا گویا ایک چمن رحمت حق تھا کہ ناگاہ برباد ہوا، یارو جب کبھی کسی جگہ اس مجمع خیر کا ذکر خیر گوش زد ہوتا ہے سینے میں تار سا نکل جاتا ہے اور دل مضطر بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے ہر چند چاہتا ہوں کہ روکوں مگر دل مضطر پر کچھ بھی بس نہیں چلتا۔

ضبط فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن ☆ دل بیتاب کو روکوں یہ نہیں ہوسکتا
عیش دنیا کیا خوش آئے ☆ دل مہجور کس توقع پر قرار پائے
جب جدا تم سا یار جانی ہو ☆ کس روش اپنی زندگانی ہو

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یارب ن نغمہ بلبل کسے خوش آتا ہے ☆ نکہت گل سے دماغ اپنا اڑا جاتا ہے

حافظ صاحب شہید کا حلیہ مبارک:

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے آپ کا سراپا لکھا ہے اس سراپا میں سو سے زائد اشعار ہیں میں نے ان میں سے نصف سے کم اشعار منتخب کر لئے ہیں، ان اشعار کو پیش کرنے سے پہلے میں اس سراپا سے اخذ کی ہوئی چند خاص باتیں درج ذیل کرتا ہوں۔

(۱) حضرت حافظ صاحبؒ بوقت شہادت جوان تھے، داڑھی کے بال سیاہ تھے۔ (۲) آپ خوش رو بارعب اور گورے چٹے تھے۔ (۳) چیچک کے کچھ کچھ داغ آپ کے چہرے پر تھے جو بہت خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ (۴) آپ کی آنکھیں بادہ معرفت کے نشے سے مخمور اور سرخ رہتی تھیں۔ (۵) آپ سر کو منڈواتے تھے اور اس سلسلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سنت پر عمل پیرا تھے۔ (۶) گردن بلند تھی۔ (۷) سینے پر سیاہ بال تھے۔ (۸) بھویں آپس میں پیوستہ نہ تھیں بلکہ کشادہ تھیں۔ (۹) قد وقامت متوسط اور نہایت موزوں تھا۔ (۱۰) چہرے پر تبسم کی کیفیت نمایاں رہتی تھی۔

اب میں سراپا کے اشعار پیش کرتا ہوں۔ درحقیقت یہ اشعار حافظ صاحب شہیدؒ کی شکل وصورت کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ترین اشعار ہیں۔

حلیہ پاک ان کا لکھے ہے قلم
ہیں یہ قدرت کے جو نادر رقم
صورت و سیرت میں وہ سب سے نبیہ
حضرت فاروقؓ کی بالکل شبیہ
قامت موزوں ہے جو طوبیٰ مثال
اس کی صفت ہو گئی لکھنی محال
قد ہے وہ اسلام کا قائم علَم
جس کے ہوئے سر پہ مہ و مہر و خم
قد متوسط ہے نہ کوتہ دراز
سامنے جس کے کرے طوبیٰ نیاز
چہرہ پر نور کا عالم ہے اور
چاہئے یاں دیدۂ حق بیں کو غور
نور خدا اس میں نظر آئے ہے
سامنے کیا برق ہو شرمائے ہے
چہرۂ پر نور میں یوں ہے دمک
نور تجلی کی ہو جیسے چمک
چاند کہاں چہرہ نیکو کہاں
چشم کہاں نرگس جادو کہاں

چشم نہیں نسخ کا یہ صاد ہے — صلی علیٰ کیا عجب ایجاد ہے
بندۂ بے دام ہے بادام واں — صاد ہے یا صلی علیٰ کا نشاں
سرخئ چشم اس کی جو یاد آئے ہے — آنکھوں سے یاں خون ہی بہہ جائے ہے
ابروؤں میں جو نہیں پیوستگی — اس میں ہے اک اور ہی دل بستگی
ان کے محاسن میں وہ چمکے عذار — شعلہ کی جوں دُودِ سیہ میں بہار
موج تبسم نے یہ عالم کیا — گوہر و مرجان کو بے دم کیا
لطف تبسم کا ہے لولو غلام — حلقہ بگوش اس کا ہے یاقوت نام
بات ہے کیا بات پر اسرار ہے — بات ہے یا مطلع انوار ہے
رمزو کنایہ سے لطیفوں سے پر — جیسے مرصع ہو کوئی سِلک دُر
چہرے پر چیچک کے جو دیکھو نشاں — قطرہ شبنم گل تر پر عیاں
کیا کہوں ایسی ہے وہ گردن بلند — زُلف کی پہنچے نہ جہاں تک کمند
عشق الٰہی میں جو ہمت بڑھی — سر کو عجب طرح کی گرمی چڑھی
تاب نہ تھی سر پہ ذرا رکھیں بال — دیتے تھے سر پر سے بلا اپنی ٹال
رکھتے جو تھے ہمت شیر خدا — کرتے ادا سنت شیر خدا
نعمت باطن کا خزانہ وہ دل — آتش عشق اس میں سدا مشتعل
سینے پر کچھ بال سیہ ہیں نمود — ہیں یہ اسی آتش سوزاں کے دُود
ہمت عالی کا کروں کیا بیاں — جس کے رہے زیر قدم آسماں
پشت کی توصیف سنی ہر کہیں — تکیہ جز اللہ کسی پر نہیں

میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کی خدمت میں حاضری اور ابتدائے سلوک کے کچھ واقعات

حکیم صاحبؒ اپنے پیر و مرشد کے ابتدائے سلوک کے واقعات اس طرح بیان فرماتے ہیں

وقت عصر حضرت میاں جی قبلہؒ نے ارشاد فرمایا کہ تم آیۃ کریمہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ ختم کرلو۔ حضرت حافظ صاحبؒ نے بعد عصر آیۃ کریمہ شروع فرمائی اور اگلی عصر تک ختم فرما کر اسی جگہ سے اٹھے اور اس ایک رات دن میں بجز حاجت بشری یا نماز وغیرہ ضروریات کے کوئی بات نہ کی۔ جب میاں جیؒ نے ذکر و اشغال تلقین فرمائے اسی ہمت اور استقامت کے ساتھ انجام کو پہونچائے، سوائے اور اشغال کے چند روز میں حبس دم کی یہ مشق حاصل فرمائی تھی کہ ایک دم میں ذکر نفی و اثبات بعد شرائط پانسو مرتبہ تلک پہونچا کر چھوڑ دیا زیادہ حاجت نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کہاں تلک کثرت فرماتے اور کئی سال تک فقط آدھ پاؤ کے بقدر کھانا نوش جان فرمایا کرتے تھے اور ربط قلب شیخ کے ساتھ اس قدر پیدا کیا تھا کہ بالکل محو اور فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵/شعبان (شب برات) سے آخر رمضان شریف تک ڈیڑھ مہینے تمام شب مشغول رہتے تھے، شب کو لیٹنا سونا بالکل موقوف کر دیتے تھے۔ چند روز میں بکمال جذب کے ساتھ سلوک طے فرمایا اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے۔ اس وقت میں تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیراں تھا۔

عادات وخصائل:

حکیم صاحبؒ نے اپنے مرشد کامل کے خصائل کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

''اللہ تعالی نے اس ذات عالی کو کیا بے نظیر پیدا کیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا اور بایں صورت و شان باکمال۔۔۔ایسے بے ساختہ اور بلا تکلف تھے کہ تصنع کا گمان بھی نہ آتا تھا اور ظاہر و باطن وہ صاف معاملہ تھا کہ ریا کی بو باس نہ تھی اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ مجھ سے نہایت محبت رکھتے ہیں ہیبت حق چہرے پر نور سے ایسی عیاں تھی کہ ہر ایک دفعۃً آنکھ نہ ملا سکتا تھا اور مردم شناسی کا یہ ملکہ تھا کہ کبھی خطا نہ ہوتی تھی اور جیسا جس کو دیکھتے ویسے اس سے کلام فرمایا کرتے تھے غرض کسی حال میں افراط و تفریط نہ تھی اور باوصف خانہ داری او راہل وعیال کے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا۔

دانائے عصر اور علماء زمانہ ہر ایک مخلص و منقاد تھا۔ نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا۔ ہر وقت

عشق الٰہی میں مست وسرشار رہتے تھے دل کی کیفیت چہرے مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی، آنکھیں ہر وقت مخمور رہتی تھیں، محبت الٰہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا''۔

اتباع شریعت:

حکیم صاحبؒ مؤلف مونس مہجوراں اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''اور اتباع شریعت یہ کچھ تھا کہ ادنیٰ بدعت بھی جڑ سے اکھاڑ دیا کرتے تھے اور خود مسئلہ مختلف فیہا میں احتیاط پر عمل فرمایا کرتے تھے اور اوامر ونواہی میں شان فاروقیت کا عروج ہوتا تھا، زہد وتقویٰ پر ایسی کمر چست باندھی تھی کہ جان تک سے دریغ نہ فرمایا۔

اللہ اللہ کیا اوصاف بیان کروں مختصر یہ ہے کہ ایک دریائے نور تھا نور محمدی کا ظہور تھا''۔

فیض صحبت:

اور فیض صحبت ایسا بے نہایت تھا کہ جب لوگ سامنے بیٹھتے تھے تو خیال دنیا نہ آتا تھا عبادت کی طرف رغبت ہوتی تھی۔

مجمع اصحاب وخیر وبرکت:

اپنے مرشد کے فیوض وبرکات بیان کرتے کرتے حکیم صاحبؒ کو دیگران اکابر ملت وطریقت کی مجلس اور صحبتیں بھی یاد آتی ہیں جو مسجد پیر محمدؒ میں جمع تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

''غرض اس طور طریق خیر وبرکت کا یہ مجمع قصبہ تھانہ بھون مسجد پیر محمد مرحوم میں جمع ہوا تھا کہ کچھ بیان کیا نہیں جاتا اس آخری وقت میں یہ حضرات نمونہ متقدمین کے پیدا ہوئے تھے اور تھوڑے عرصہ میں اس قدر تعلیم وتلقین راہ خدا جاری ہوئی کہ عالم میں شہرہ ہوگیا ہر طرف سے طالب خدا اور درویش وقت رجوع ہونے لگے اور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق فیض یاب ہوتے تھے۔ عجب وہ زمانہ تھا اور عجیب کیفیت وہاں رہتی تھی کہ نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں نے سنی اور ہر چند غور کیا مگر بہر حال اس مجمع کو

رنج و راحت دنیا سے بے فکر پایا بجز یاد خدا کسی شے کا فکر و اہتمام کرتے نہ دیکھا۔ سبحان اللہ کیا وقت سرور
حضور تھا اور وہ کیسی برکات عام تھیں جو اخلاص سے چندروز بھی اس صحبت میں رہ گیا ایک حال پیدا کر کے
گیا یہ بات اس زمانے میں کہیں نہ تھی سالہا سال کے عابد و زاہد دیکھے جو کچھ ان کے قلب میں اثر ذکر پایا
ان حضرات موصوفین ادام اللہ فیوضہم کی خدمت میں چندروز کے طالبوں کو اس سے بہتر پایا غرض کہ وہاں
اول ہی ایک نسبت کا اثر ہو جاتا تھا اور جس کسی طالب نے وساوس نفس و شیطانی کو دفع کیا اور حسن عقیدت
سے وہاں حاضر ہو کر ہمت کر کے زہد و تقوی میں قدم چست رکھا اور جی لگا کر ان بزرگوں کی خدمت میں
کچھ تربیت پائی مقام عالی پایا چنانچہ ایسے کتنے خادم ان حضرات کے موجود ہیں کہ ہر طرح کی نعمت دینی
سے مالا مال ہیں روز و شب اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

اخفاء حال:

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ اپنے حال کو بہت چھپاتے تھے مرید با اخلاص نے اس صفت کا ذکر یوں
کیا ہے:

''پیر و مرشد کو باوصف اس جاہ و جلال کے ستر حال کا بہت خیال تھا، آزادانہ وضع رکھتے تھے اور
بہت کم مرید فرمایا کرتے تھے، بوسیلہ سفارش حضرت حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالی میں مشرف بہ بیعت ہوا''۔

شوق شہادت:

مرشد کے شوق شہادت کا ذکر حکیم صاحبؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جس سال (۱۸۵۷ء میں) حضرت پیر و مرشد شہید ہوئے یوں فرمایا کرتے تھے''

''کہ دیکھو حوریں پیالہ لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے
لیوے'' ان ایام میں حضرت پیر مرشدؒ ولولہ محبت الہی میں ایسے مست و مخمور ہوئے تھے کہ اکثر ذکر شہادت بر
زبان تھا اور بہت باتیں اسرار کی کہہ اٹھتے تھے ستر حال کا چنداں لحاظ نہ رہا تھا اور جو کوئی مستدعی بیعت

ہوتا تھا برخلاف عادت فوراً بیعت کر لیتے تھے۔

ساقی بزم توحید معرفت وشیر بیشہ حریت بصد شان رعنائی و مشتاقی شاملی کے میدان جہاد میں:

حوروں کی آنکھیں جس مشتاق شہادت پر پڑ رہی تھیں ذرا اس کا معرکہ جہاد میں مشتاقانہ اور دلربایانہ انداز تو ملاحظہ فرمایئے، حکیم صاحبؒ نے وجد انگیز الفاظ میں اس منظر کو دکھایا ہے۔ تاریخ حریت اور کتاب حمیّت ملّی کا یہ وہ ورق ہے جس کو خون دل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ سنیئے حکیم صاحب فرماتے ہیں:

جس وقت ارادہ معرکہ کا کیا، غسل فرما کر سب لباس نیا زیب بدن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز پیشتر سے رکھ چھوڑا تھا حالانکہ ان کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے اور وہ لباس اس دن کام آیا۔ نعلین شریفین کچھ بوسیدہ نہ تھیں مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب پا کیں (پہنیں) اور یہاں تلک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی اور سرمہ لگایا، دستار پیچدار، سپاہیانہ وضع، شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علَمِ جوانمردی اٹھا کر مردانہ اور مشتاقانہ برسر معرکہ جان بحق تسلیم فرمائی جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

درکوئے تو عاشقاں چناں جاں بدہند ☆ کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز

نعش مبارک سے عطر خس اور گلاب کی خوشبو:

مؤلف مونس مہجوراں جیسے ثقہ راوی کا یہ بیان بھی ہے ''جس وقت نعش مبارک لینے آئے تھے جسم شریف سے عطر خس اور گلاب کی خوشبو آتی تھی اس نالائق (مؤلف) کا دماغ اس خوشبو سے مشرف ومعطر ہوا اور جناب حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس وقت تصدیق فرمائی''۔

مؤلف کے نام شہادت سے ہفتہ عشرہ پہلے ایک مکتوب گرامی:

حضرت پیرومرشدؒ نے ہفتہ عشرہ پہلے شہید ہونے سے اس نالائق کو ایک عنایت نامہ ارقام فرمایا تھا (وہ گرامی نامہ فارسی زبان میں تھا) بعینہ ترجمہ اس کا درج کرتا ہوں،

''برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین سلمہ اللہ تعالی بعد سلام واضح رائے ہو کہ تمہاری تحریر کے موافق دل میرا متمنی ملاقات ہے لازم کہ بفور (جلد) (بعد) مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچ آؤ ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے عاقل کو اشارہ کافی ہے، باقی حال بروقت ملاقات بیان کیا جائے گا۔ فقط والسلام''۔

تاریخ شہادت:

آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت شربت شہادت نوش جان فرمایا۔ آپ کی وفات وشہادت پر جو تاریخیں کہی گئیں وہ یہ ہیں:

(۱) مؤلف رسالہ کے بھائی محمد علاء الدین صاحب رامپوری نے

''شہادت مرشد ہادی'' تاریخ شہادت نکالی

۱۲۷۴ھ

(۲) مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبدالسمیع صاحب بیدل رامپوری نے یہ قطعہ لکھا، جس سے معرکہ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے

شہید ہو گئے ضامن[۱] علی پاک نہاد | جواب جن کا نہ تھا کوئی نسل آدم میں
ہوئے شہید مگر اک تماشہ دکھلا کر | لہو لہان کیا دشمنوں کو اک دم میں
نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی | گلو بریدہ ہے سکہ بھی ان کا درہم میں
جو مارے تیر تو لگتے ہی جالیا گوشہ | ہزاروں کافر بد کیش نے جہنم میں
خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے | نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں
جو پوچھی سن شہادت کہا فلک نے کہ ہائے | ہوئے شہید وہ شاہ بری محرم میں

دوسری تاریخ بیدل صاحب نے یوں نکالی:

[۱] حافظ صاحب کا نام دراصل محمد ضامن ہے۔ ان کو ضامن علی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ (فریدی)

بیدلؔ آں وقت کہ حافظ ضامنؒ ☆ رفت و آراست بجنت مسند

شاہ رضواں شد و گفت ایں تاریخ ☆ حافظ مصحف ایزد آمد

(۳) میاں جی عبدالغفور کوئی [illegible] وقت ہوں گے انھوں نے یہ تاریخ نکالی:

حوریں سب مل کرکے ہیں واہ وا ☆ پیر کے دن خلد میں پیر آگئے

(۴) ملا زین العابدین پشاوری کوئی بزرگ تھے انھوں نے دو تاریخیں کہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

شہ بہشت بریں بود نیز از پئے سال ☆ بفال طرفہ بر آمد شہ بہشت بریں

۱۲۷۴ھ

تھانہ بھون کا ایک منظر:

حافظ صاحبؒ کی شہادت کے بعد تھانہ بھون پر بالعموم اور مکان حافظ صاحبؒ پر بالخصوص کیا گذری اس کی تفصیل مؤلف رسالہ نے پیش نہیں فرمائی رسالے کے بعض مقامات پر اس کے متعلق کچھ اشارات ملتے ہیں۔ حافظ صاحبؒ کا مکان ویران اور خستہ حال ہو گیا تھا کس طرح ہوا؟ یہ داستان حکیم صاحبؒ کے موضوع سے باہر ہے، کچھ مصلحت کے بھی خلاف ہے اور ان کے دکھی دل کو اس کی تاب بھی نہیں ہے کہ ان حوادث کو وہ مفصل بیان کرسکیں۔

ایک آہ ہے جوان کے سینۂ سوزاں سے نکل رہی ہے ایک حسرت ہے جو نوحہ کناں ہے ایک ایک بات پیر و مرشد کی یاد آ رہی ہے، پیر و مرشد کا مکان بھی یاد آ رہا ہے سنیے کیا فرماتے ہیں:

"واحسرتا کدھر گیا اور کیا ہوا وہ مجمع خیر اور جماعت محبت آمیز اور وہ صحبت عشق انگیز اور وہ مکان دل آویز یعنی مسکن حضرت اقدسؒ کہ اب ویران ہے باوصف اس خستہ حالی کہ دیکھو وہاں کیا جلوہ حق ہے اور اس اجڑے مکان میں کیا دل کشادگی ہے، خس و خاشاک سے بوئے گل اور نغمہ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے اکثر اہل دل وہاں جاکر مسرور ہوتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے۔

بزمینکہ نشان کف پائے تو بود　　سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

مرشد کی شہادت کے بعد مؤلف کا ایک خواب:

ایک صحرائے وسیع ہموار سبزہ زار ہے اس کی وسعت اور فرحت وفضا کا کچھ بیان نہیں ہوسکتا اس میدان میں ایک درخت اس قدر بلند ہے کہ سر اس کا آسمان کے قریب ملا ہوا ہے اور بہت خوبصورت ہے چند شاخیں اس کی سر جھکائے جھوم رہی ہیں اور ان میں کھجور کے سے خوشے نہایت خوش وضع کے ساتھ لٹکتے ہیں اور بیچ ان شاخوں کے ایک تخت نفیس وخوبصورت قائم ہے اس پر حضرت پیر ومرشد جلوہ فرما ہیں اور وہ شاخیں ہر چہار سو پر سایہ فگن ہیں عجب آن بان، شوکت وشان اس حال باکمال میں ٹپکتی تھی یہ معاملہ دیکھ کر اس قدر فرحت واطمینان اور جمعیت خاطر حاصل ہوئی کہ بالکل محو ومستغرق اس حال میں ہوگیا جب بایں ہئیت دیکھا تو اس نالائق کے دل میں خیال آیا۔ اگر حضرت کچھ حال اپنی شہادت کا ارشاد فرمائیں تو بہتر ہے۔

اس بات کے دل میں وارد ہوتے ہی ارشاد فرمایا کہ اللہ کا بڑا شکر ہے اس نے مجھ کو شہدا میں بڑا مرتبہ عنایت فرمایا اور بڑی نعمتیں عطا ہوئیں۔ ''مگر حقے کا ذکر آیا تھا'' اس نالائق کے جی میں خطرہ گذر گیا کہ آپ سے گرفت ہوئی ہوگی (اس وقت حافظ صاحب شہیدؒ نے) فرمایا ''نہیں'' فقط ذکر آیا تھا۔ یہ فرما کر اور اس ہئیت کو چھوڑ کر ایک مسجد میں تشریف لائے اور دہن شریف کھول کر دکھلایا، کیا دیکھتا ہوں کہ درج دہان مبارک میں شکر بھری ہوئی تھی۔

حافظ صاحبؒ کے دہن سے حقے کی بو نہ آتی تھی:

مؤلف نے اس خواب کو نقل کرنے کے بعد حضرت حافظ صاحبؒ کے بارے میں حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے میں نے بغور خیال کر کے دیکھا تھا کہ حضرت حافظ صاحبؒ کے دہن شریف سے حقے کی بو نہ آتی تھی۔

قمریوں سے شوق اور حافظ صاحبؒ کے اخفا حال کا ایک عجیب واقعہ:

مؤلف مونس مہجوراں رقمطراز ہیں: ''ابتدائے حال میں حضرت حافظ صاحب کو قمریوں سے شوق تھا ایک روز بعد کھانا کھانے کے ایک روٹی قمریوں کے واسطے لائے جس وقت قریب پنجرے کے پہونچے ایک قمری نے صدائے حق سرہ سنائی اس صدا کو سنتے ہی، بیہوش ہو کر گر پڑے، ناگاہ ایک شخص

آ گیا (اس وقت ہوش آ گیا) گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور یوں فرمایا کہ "دیکھو اکثر آدمی راہ میں پانی گرا دیتے ہیں لوگ رپٹ کر گر جاتے ہیں" سبحان اللہ کتنا اخفاء حال تھا کہ حتی المقدور اپنے حال کو باتوں سے چھپا دیا اسی وجہ سے آپ کے اکثر حال اور خرق عادات ظاہر نہ ہوئے"۔

حافظ صاحب شہیدؒ کا ایک ملفوظ:

حکیم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت حافظ صاحبؒ تشریف لئے جاتے تھے راہ میں ایک جانور مردار (مردہ) پڑا تھا اور دو سگ بچے (کتے) گرد اس کے تھے ایک دوسرے کو کھانے نہیں دیتے تھے باہم غرّا رہے تھے یہ دیکھتے ہی ایک آہ سرد بھر کر فرمایا کہ "دیکھو اللہ تعالیٰ نے بعینہٖ مثال دنیا داروں کی ظاہر کر رکھی ہے کہ دنیا مردار پڑی ہے اور دنیا دار کتے لڑتے ہیں"۔

بعد شہادت خواب میں نصیحت:

حکیم صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے حالات قلبی میں کچھ فتور واقع ہوا تو خواب میں آ کر یوں فرمایا "تھوڑا کھایا کرو اور لباس جیسا ملا ویسا پہر (پہن) لیا"۔

اشعار مرثیہ:

قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حضرت حافظ صاحبؒ کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ایک زبردست غم انگیز ادبی شاہکار ہے اس کی تاثیر ناظرین کرام خود محسوس فرمائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوری جماعت حافظ صاحب کی شہادت کے بعد مضطرب و بےچین ہو گئی تھی۔ حضرت نانوتویؒ کے یہ اشعار اپنی معنوی وسعت میں رنج و غم کا ایک طوفان لئے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر دل ہل جاتا ہے اور بے اختیار رقت طاری ہوتی ہے۔ یہ اشعار تعداد میں ۶۵ تھے میں نے ۳۵ اشعار کا انتخاب کیا ہے۔

یہ بھی ظاہر کر دوں کہ حضرت قاسم العلومؒ نے اس مرثیہ کے آخر میں اپنے نام کے بجائے حکیم محمد ضیاء الدین صاحبؒ کا نام درج کیا ہے اگر حکیم صاحبؒ خود نہ فرماتے کہ یہ اشعار حضرت قاسم العلومؒ کے

ہیں تو ہمیں کیسے پتہ چلتا، اب یہ اشعار مرثیہ سنیے۔

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم اس قدر جاں سے | ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غم ہائے فراواں سے
کہیں سے مول لا دے دل مجھے کچھ اور اے ہمدم | کہ اٹھنے کا نہیں بار غم اس قلب پریشان سے
غبار دل کی حاجت ہے غم سالار خوباں میں | میرے سینے کو بھر دو چیر کر ریگ بیاباں سے
رہ دو چشم موج خون کو کافی نہیں ہوگی | کوئی مشفق مراتن چھان دے تیروں کے پیکاں سے
غم جاناں میں ہم کو ان دنوں رونا ضروری ہے | طلب کر اب کی نوبت چشم خوں بار ابر باراں سے
ہجوم صدمہ جانکاہ ہر صبح ومسا اب کے | تقاضا ماتم غم کا کرے ہے جن و انساں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جاکر | کہ جس کا خال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے
شہید راہ حق حافظ محمد ضامن چشتیؒ | بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے
بچھاتے تھے ملائک بال و پر پاؤں تلے جن کے | لٹائے خاک میں ان کو عجب ہے چرخ گرداں سے
پریشاں ہو گیا دل صدمہ اول میں کیا کیجئے | بہاتا اشک کی جا لخت دل اس چشم گریاں سے
فراق یار میں کر فکر جاں کچھ اے دل ناداں | کہ اب کے بر سر پرخاش غم آیا ہے ساماں سے
مدد کر صبر کچھ اب کے دل مضطر کے ہاتھوں سے | نظر آتا ہے غم میں ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہم جاں سے
کشش نے عشق حق کی ان کو علّیین میں کھینچا | رہے ہم سر پٹکتے ہجر میں ان کے، کہستاں سے
فراق یار میں جینا تعجب ہے ولے ہمدم | اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بار گناہاں سے
نہیں معلوم کیوں ہے اس قدر شوقوں کی بیتابی | وہ آئیں اپنے ویرانے میں یہ باہر ہے امکاں سے
وصال یار ممکن ہی نہیں نادان جیتے جی | تو پھر بیتاب کیوں ہوتا ہے اے دل شوق پنہاں سے
قریب یار ہم کو دفن کرتا روز محشر تک | صدائے نالہ شوق آئے گی گور غریباں سے
کروں ہوں یاد ایام گذشتہ اور نہیں کرتا | کہ حسرت کے سوا کچھ ہاتھ آئے گا نہ ارماں سے
دل بیتاب کے ہاتھوں سے تنگ آیا ہوں ہجراں میں | نہ چپکے ہی بنے ہے اور نہ کچھ ہوتا ہے افغاں سے
کرے ہے تنگ شوق یار کیا صورت کروں یارب | کہ یہ جاں حزیں ہم بزم ہو اس جان جاناں سے

نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو / سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لبہائے خنداں سے
ملیں گے پھر بھی یارب ہم یہ آنکھیں ان کے تلووں سے / تھمے گا بھی کبھی لوہو کا ٹپکا اپنی مژگاں سے
تو اے یاد عنایت ہائے دلبر اب تو لے بس کر / بہت سے رو چکے ہم حسرت و افسوس و حرماں سے
اگر ہو وصل مرکر اور علاجوں سے رہوں زندہ / تو یارب آشتی ہو جا اجل کی آب حیواں سے
کسی کا کیا گیا پر رنج فرقت کی مصیبت کو / کوئی جا کر کے ٹک پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حبِ الٰہی کی / کوئی پوچھے سبب، رحلت کا اس سالار خوباں سے
گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائق صحبت / تو ہم کو بخشوا لینا تھا کچھ کہہ سن کے رحماں سے
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہگاروں کا لے چلنا / تو تنہا اس طرح جانا بھی نا زیبا ہے سلطاں سے
اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے / تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالار نیکاں سے
مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد بریں میں پر / ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے
غم فرقت میں یاں گذرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی / تمہیں فرصت نہیں واں لذت دیدار یزداں سے
بنے تھے یوں تو ہم روز ازل سے غم اٹھانے کو / نہ تھی پر یہ خبر ہونگے الگ بھی تیرے داماں سے
تمہارے ہجر میں جان جہاں کچھ بن نہیں آتا / دل حسرت زدہ گھبرائے ہے سیر گلستاں سے
دل مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی / مگر ہاں سر نکالو تم اگر گنج شہیداں سے
تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو / تو اک شعلہ سا اٹھے ہے ہمارے قلب سوزاں سے

آفتاب علم وعرفان

حضرت مولانا شیخ محمد محدث فاروقی چشتی تھانویؒ

حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ کی شخصیت کیا باعتبار علم وفضل اور کیا باعتبار عرفان وسلوک ایک ممتاز شخصیت تھی۔ وہ ایک طرف حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے

دوسری طرف حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ وہ عالم طفولیت میں سید السادات حضرت سید احمد شہیدؒ سے جبکہ وہ دوآبے کے دورۂ تبلیغ و ہدایت میں تھانہ بھون تشریف لائے تھے، بیعت کا شرف حاصل کر کے ان کے حلقہ توجہ دہی میں بھی شریک ہوئے تھے۔ وہ اپنے تبحر علمی اور اپنی تصانیف کے لحاظ سے بھی بلند پایہ مقام رکھتے تھے۔ مجھے ان کے حالات سے بہت معمولی واقفیت تھی۔ پچھلے دنوں بستی کرتپور جانا ہوا وہاں عالیجناب حکیم عبدالواحد خاں صاحب مدظلہ اور ان کے برادر کلاں مولانا حکیم محمد الیاس خاں صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی ان کے پاس حضرت مولانا محدث تھانویؒ کی چند تصانیف، مطبوعہ اور قلمی تھیں ان کے سرسری مطالعہ کا موقع ملا دوسری مرتبہ وہاں جانے پر ان کے پاس حالات محمد یہ مؤلفہ حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولیؒ دیکھی جو اگر چہ مطبوعہ ہے لیکن کمیاب بلکہ تقریباً نایاب ہے افسوس کہ یہ سوانح عمری بوسیدہ ہوگئی تھی اس کے درمیان کے بہت سے اوراق بھی موجود نہ تھے پھر بھی اس کتاب نے میری بڑی مدد کی اور میرے اس مقالے کا بڑا ماخذ یہی کتاب ہے۔

حکیم صاحب کے والد بزرگوار حضرت حکیم محمد داؤد خاں صاحب مرحوم، حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوریؒ کے راسخ الاعتقاد مرید تھے۔ اسی نسبت سے انھوں نے اپنے دادا پیر کی زیادہ سے زیادہ تصنیفات اپنے کتب خانہ میں جمع کی تھیں اور ان کا مطالعہ ذوق وشوق سے کرتے رہتے تھے۔ حضرت محدث تھانویؒ کی کل تصانیف تو یہاں بھی نہیں ہیں مگر جتنی موجود ہیں اتنی بھی کسی ایک کتب خانہ میں مجھے یک جا نہ مل سکیں میں نے مناسب سمجھا کہ اس ذخیرے سے اخذ کر کے حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ کی ایک مختصر سوانح عمری ناظرین ''تذکرہ'' کی خدمت میں پیش کروں۔

تاریخ پیدائش اور نام ونسب:

مولانا شیخ محمدؒ ۲۰ر جمادی الاولی ۱۲۳۰ھ کو پیر کے دن تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی مولوی حمد اللہ تھا۔ جو کہ علم وفضل میں کامل اور عہدۂ تحصیل داری پر فائز تھے۔ آپ کی پانچ برس کی

عمر تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور دس برس کی عمر تھی کہ سر سے سایہ پدری بھی اٹھ گیا۔ آپ حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی اولاد میں تھے آپ کے اسم مبارک 'شیخ محمد' میں لفظ شیخ آپ کے نام کا جز تھا نسب کا اظہار کرنے کے لیے نہ تھا۔ بالکل اس طرح سے جیسے سید محمد یا خان محمد نام ہوا کرتے ہیں۔ اپنے بڑے صاحبزادے مولانا محمد محمود کے نام پر ابو محمود آپکی کنیت تھی۔ اپنی مثنوی میں جس کا ذکر آگے آئے گا جگہ جگہ شیخ اور محمد تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔

قسطاس کے دیباچہ میں اپنا نام اور نسب اس طرح ذکر فرمایا ہے:

بعدہٗ کہتا ہے احقر عباد اللہ الصمد ابو محمود شیخ محمد ابن مولانا المولوی حمد اللہ العمری الفاروقی محتداً و التھانوی میلاداً و موطناً و اسحاقی تلمذاً و تعلماً عفی اللہ عنہ و عنہم اجمعین۔ آمین ثم آمین۔

''الہامات الموجود'' کے دیباچہ میں اپنا نام یوں لکھا ہے۔

فقیر شیخ محمد بن مولوی حمد اللہ خان عمری فاروقی نسباً و تھانوی میلاداً و وطناً صوفی صافی مشرباً چشتی صابری و نقشبندی مجددی سلسلۃً و سید احدی و یعقوبی و نوری شعبۃً و حنفی مذھباً و اسحاقی تلمذاً۔

نواب فاروقی خان:

پانچ پشت اوپر آپ کے جدامجد شیخ احمد تھے جو نواب فاروقی خاں کہلاتے تھے۔ یہ بڑے رئیس اور جاگیردار تھے، تھانہ بھون کو آباد کرنے میں ان کو بھی بڑا دخل ہے انہوں نے بڑے بڑے عالی شان سرخ و سفید پتھر اور لکھوری اینٹ کے مکان بنوائے، باغ لگوائے، باوڑیاں کھدوائیں، مسجدیں بنوائیں، کنویں تعمیر کیے، سڑکیں نکالیں غرض کہ تھانہ بھون ان کے عہد میں ہمیشہ گلزار رہا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز نے مجاہدین سے انتقام لینے میں اس قصبے کی رونق کو برباد کیا۔

نواب فاروقی تک آپ کا شجرہ یہ ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد ابن مولوی حمد اللہ ابن حکیم محمد بخش ابن حکیم محمد ارحم ابن حافظ محمد اعظم ابن قاضی مکرم خاں ابن شیخ احمد عرف نواب فاروقی خاں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت:

بچپن[1] میں آپ حضرت سید احمد شہیدؒ سے جب کہ وہ مع قافلہ تھانہ بھون تشریف لائے تھے مسجد پیر محمد مرحوم میں بیعت ہوئے اور ایک دو مرتبہ ان کے حلقہ توجہ دہی میں بھی حاضر ہوئے۔

ابتدائی تعلیم:

گیارہ برس کی عمر تک آپ نے قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی پڑھی پھر مولانا عبدالرحیم تھانویؒ سے عربی صرف ونحو پڑھنی شروع کی، مولانا قلندر علی جلال آبادیؒ سے بھی پڑھا۔

انتہائی تعلیم:

پندرہ سال کی عمر میں دہلی پہونچ کر شہیر آفاق حضرت مولانا محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کے حلقہ درس میں تعلیم حاصل کی، انیس سال کی عمر میں جملہ علوم میں دستگاہ کامل حاصل کی چنانچہ آپ کے سر پر دستار فضیلت بندھی اور علم حدیث وتفسیر، فقہ واصول، عقائد وفرائض، تصوف واخلاق، کلام، منطق، ریاضی اور حکمت کی سند ملی۔

تھانہ بھون میں قیام:

شروع ۱۲۵۱ھ میں آپ دہلی سے اپنے وطن تھانہ بھون آئے اور یہاں وعظ وپند اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ آپ کا قدیم مکان حوض والی مسجد کے متصل تھا۔ دس گیارہ برس اسی مسجد

---

[1] حالات محمد یہ میں اور خود مولانا کی بعض تصنیفات میں کئی جگہ ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت کی، چنانچہ آپ رسالہ ''الہامات الموجود'' میں تصریح کے ساتھ یوں تحریر فرماتے ہیں: فقیر یاد دارد کہ عمرم ہفت سال باشد (کہ) در مسجد پیر محمد والی واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور (از اضلاع میان دوآب) بشرف بیعت جناب سید صاحب قبلہ ممدوح وقدس سرہ مشرف شد اگر چہ در ایام طفلی بود لیکن پرتو بزرگاں کافی است۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ حضرت سید صاحب نے ۱۲۳۴ھ میں دوآبے کا تبلیغی سفر فرمایا ہے اسکے بعد دوآبہ تشریف نہیں لائے (دیکھئے سیرت سید احمد شہیدؒ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) لہذا یا تو مولاناؒ کی پیدائش ۱۲۳۰ھ سے تین سال پہلے ماننا پڑے گی ورنہ ان کی عمر اس وقت چار سال ہوگی غیر معمولی حافظے کی بنا پر انہیں سید صاحبؒ کی آمد یاد ہوگی۔ اور بزرگوں نے تبرکاً بیعت بھی کرا دیا ہوگا۔ حلقہ توجہ دہی میں بھی بزرگوں کے ساتھ شرکت ہوگئی ہوگی۔ (فریدی)

میں نماز ادا کرتے رہے اور طلبا کو درس دیتے رہے کئی گاؤں تھے اس لیے کافی آمدنی تھی۔آپ کے عزیزوں میں چند آدمی انگریزی علاقے میں اور اکثر ہندوستانی ریاستوں میں اچھے عہدوں پر ملازم تھے۔دو چار جگہوں سے آپ کو بلاوا بھی آیا مگر آپ تھانہ بھون چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔

سلوک :

پہلے حضرت حافظ محمد ضامن فاروقی چشتی شہیدؒ سے جو رشتے کے ماموں ہوتے تھے روحانی فیض حاصل کیا بعدہٗ براہ راست حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے بیعت ہوئے جبکہ وہ حوض والی مسجد تھانہ بھون میں تشریف لائے ہوئے تھے۔بالآخران سے خلافت و اجازت حاصل کی۔۱۲۵۹ھ میں حضرت میاں جیؒ کا بعمر ۵۹ رسال وصال ہو گیا اوران کی جدائی کا آپ کو اور تمام خلفا کو سخت صدمہ ہوا۔

حضرت حاجی امداداللہ قدس سرہٗ سے آپ کا ارتباط:

۱۲۶۰ھ میں حضرت حاجی صاحبؒ پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف گئے تو آپ نے ان کے فراق میں چند اشعار کہے یہ اشعار آپ کی مثنوی میں موجود ہیں فرماتے ہیں ۔

اے غذاے روح امدادِ الٰہ	آہ قدرے تو کسے نشناخت آہ
حیف راہیِ حرم تنہا شدی	ناگہاں چوں جاں جدا از ماشدی
انچہ وصفِ تو مرا در باطن است	راز دارد گوش حافظ ضامن است
گو من وتو ہر دواے ہم پیر من	خواجہ تا شانیم و ہم بزم سخن
لیک باشم چاکر تو گر بجاں	موجب فخراست پیداؤ نہاں

زیارت حرمین کا شوق اور نواب وزیرالدولہ کی طلبی:

۱۲۶۲ھ میں آپ کے دل میں زیارت حرمین کا شوق غالب ہوا۔ٹونک میں نواب وزیرالدولہ مرحوم کو احادیث تہذیب اخلاق کی تالیف وتدوین کا شوق پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ایک کامل محدث کی

ضرورت محسوس ہوئی ،علما ریاست سے مشورہ بھی کیا چونکہ اس وقت سلسلہ عزیزیہ میں مولانا محدث تھانویؒ ایک بلند پایہ محدث مانے جاتے تھے اس لئے نواب صاحب نے بصد تمنا آپ کو طلب کیا۔ آپ اس خیال سے کہ حج کا ارادہ ہے ہی راستہ میں یہ ریاست بھی پڑتی ہے۔ ۱۷ر جمادی الثانی ۱۲۶۲ھ کو روانہ ہوکر ٹونک پہونچے اور بعد ملاقات نواب صاحب آپ تالیف کتاب میں مشغول ہوگئے۔

نواب صاحب کی آپ سے عقیدت:

نواب صاحب مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھے اور حضرت مولانا کو بھی حضرت سید صاحبؒ سے یک گونہ نسبت باطنی حاصل تھی اس لئے نواب صاحب نے آپ کا بڑا اکرام کیا اور آپ کے حلقے میں بیٹھنے لگے۔

ٹونک کا نظام الاوقات:

صبح کے وقت مسودۂ کتاب قلمبند فرماتے، سہ پہر کو تعلیم طلبا میں مشغول ہوتے ،شام کے وقت نقشبندی طریقے پر حلقہ کرتے۔ جمعہ کے دن تالیف وتدریس کی تعطیل ہوتی کبھی کبھی بعد نماز جمعہ وعظ فرماتے تھے۔

لحن داؤدی:

اللہ تعالےٰ نے جہاں آپ کو ظاہری ومعنوی خوبیوں کے ساتھ نوازا تھا اور خوشنما ودیدہ زیب حسین شکل وصورت عطا فرمائی تھی وہاں خوش الحانی سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا حکیم محمد عمر چرتھاولی مرحومؒ قیام ٹونک کے حالات لکھتے ہوئے حالات محمدیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''عشاء یا صبح کی نماز میں بحالت خشوع وخضوع کوئی سورہ یا رکوع پڑھنا شروع فرماتے (تو) مقتدیان رقیق القلب ہی کو نہ رلاتے (بلکہ) مصلیان سنگ دل کو بھی وجد میں لاتے۔ راستے بند ہوجاتے آتے جاتے سکتے میں آتے۔ طالب علمی کے زمانے میں دلی میں بھی آپ کے

حسن گلو کی شہرت تھی۔ حفاظ وقرا آپ کی قراءت کے گرویدہ تھے"۔

عادات وخصائل:

حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی مرحوم اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔ "آپ ہمیشہ پاک وصاف نفیس وشفاف کپڑے پہنا کرتے تھے، لطیف وقلیل کھانا کھاتے، دوسرے تیسرے روز جاڑوں میں، اور گرمیوں میں اکثر روزانہ نہاتے باوجود موجود ہونے عظمت ہر قسم کی، کبھی خودستائی کی گفتگو نہ کرتے اور کسی حالت میں کسی فرد بشر کی جرم بینی اور نکتہ چینی کی جستجو نہ کرتے کبھی کسی کو برا نہ کہتے، کسی وقت بے وضو نہ رہتے آٹھ پہر میں کل چار گھنٹے آرام فرماتے ہر امر میں اتباع سنت اسلام فرماتے۔ بعضا سائل بڑا کندہ ناتراش ہوتا کہ ایک چھوٹے سے مسلے کے دریافت کرنے کے واسطے دو دو گھنٹے سمع خراش ہوتا مگر آپ جواب میں ذرا بھی سختی کو کام میں نہ لاتے نہایت نرمی سے مکرر سہ کرر سمجھاتے ہر طرح اطمینان فرماتے کبھی کسی سے ترش رو یا خفا نہ ہوتے دوست ہوتا یا دشمن، 'تخم کدورت سینہ صفا گنجینہ میں نہ بوتے'۔ بلا ضرورت شرعی کہیں نہ جاتے ہر وقت اپنے قیام کی جگہ بیٹھا رہنا پسند فرماتے اور مسکن ومجلس، روش ارباب داد ودہش رات دن کھلا رہتا، سفر میں باوصف موجود ہونے سواری کے کوسوں پیدل چلتے، صورت آپ کی بہت حسین تھی، حافظہ آپ کا بہت اچھا تھا جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لی آخر تک ازبر تھی، تفسیریں سب یاد تھیں اصول فقہ تمام منضبط، صحاح ستہ برزبان تھا۔"

سفر حج:

نواب صاحب کی منشا کے مطابق تھوڑے سے دنوں میں بہت سی حدیثیں جمع ہوگئیں اور ضروری ضروری باتیں سب مجتمع ہوگئیں تو بعد انفراغ ترتیب کتاب، خشکی کا راستہ کچھ بیل گاڑی پر اور کچھ پاپیادہ طے کرکے بادی جہاز پر سوار ہوئے اور مع الخیر مکہ معظمہ پہونچ کر ۱۲۶۳ھ میں شرف حج مبرور سے مشرف ہوئے۔

علما حرم مکہ سے ملاقات:

وہاں کے علما خصوصاً حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ مہاجر مکیؒ برادر خورد حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ ومہاجر (متوفی ۱۲۶۲ھ) سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے بعد ملاحظہ احوال سند جمیع علوم اور خرقہ خلافت عطا فرمایا اور یہ فرمایا کہ ''اللہ اکبر آپ کی نسبت میں تو انتہا کی وسعت ہے''۔

الہامات محمدیہ:

آپ کو مسئلہ وحدت وجود وشہود میں عرصے سے تردد تھا تسکین نہ ہوتی تھی لہذا مقام ابراہیم میں صبح وشام مابین باب السلام وزمزم بیٹھنا اختیار کیا اللہ کے فضل وکرم سے انیس بیس روز ہی میں اس مسلے میں ایک رسالہ مسمّٰی بہ ''الہامات الموجود'' تصنیف کیا اور بفضل خداوند عزوجل اس مسئلہ لاینحل کو بخوبی حل[1] فرمایا۔

یہ کتاب بہ تصحیح ومقابلہ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندیؒ وکتابت محمد محب اللہ بجنوری مطبع نیمروز بجنور میں طبع ہو چکی ہے۔ اسی کتاب کے بارے میں اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں۔

گوہر فرد فریدی سفتہ ام ☆ انچہ در تقریر وحدت گفتہ ام

مدینہ منورہ:

بعد فراغت حج، زیارت روضۂ رسول اللہ ﷺ کے لئے مدینہ منورہ حاضر ہوئے آپ کی مثنوی میں آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں بہت سے نعتیہ اشعار موجود ہیں جو غالباً وہیں پر کہے گئے ہیں۔

واپسی:

۱۲۶۴ھ میں امام ابوالحسن شاذلی یمنیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے، حدیدہ، وعدن کی راہ سے بمبئی پہنچے۔

---

[1] اس کتاب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں: الحمدللہ اولاً وآخراً کہ از تحریر تبییض ایں رسالہ بروز دوشنبہ وقت یکپاس روز برآمدہ بتاریخ ششم ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ در بلدۂ مکہ معظمہ از دست خود فارغ شدم۔ (فریدی)

مناظرہ محمدیہ کی تصنیف:

بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالحق خیر آبادی مرحوم نے اپنے والد کے مشورے سے ایک کتاب امام فخر الدین رازیؒ کے بعض اقوال کی تردید میں لکھ کر شائع کرادی ہے اور علمائے ہند نے اس کو پسند کر کے اس پر دستخط بھی کردئے ہیں حتی کہ مفتی صدر الدین دہلویؒ نے بھی اس پر مہر تصدیق لگادی ہے۔ آپ کو یہ کتاب دیکھ کر بہت ملال ہوا، اور اس کا جواب لکھے بغیر وطن کی طرف جانا آپ نے مناسب نہ سمجھا اسی رنج وتعب میں تھے کہ عالم مراقبہ میں حضرت امام رازیؒ سے ملاقات ہوئی اس کے بعد عازم وطن ہوئے اور راستہ ہی میں قلم برداشتہ جواب لکھا، مناظرۂ محمدیہ اس کا نام رکھا۔ دہلی پہونچ کر مفتی صاحبؒ کی خدمت میں اس جواب کو پیش کیا وہ اس کے خطبہ کو پڑھ کر ہی دنگ رہ گئے اور مضمون مناظرہ دیکھ کر معانقہ کیا اور اسی وقت اس رسالہ پر تقریظ لکھ کر اپنی مہر ثبت فرمادی۔ حسب بیان حکیم محمد عمر چرتھاولی مرحوم، حضرت قاسم المعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ''یہ رسالہ اگر کتب درسیہ علم حکمت میں داخل ہوتو قاضی مبارک کے بعد صدرہ کے تحت میں ذہین آدمی سمجھ سکتا ہے''۔

یہ رسالہ بھی طبع ہوگیا تھا میں نے اسکی قلمی نقل کرتپور میں دیکھی ہے۔

واپسی بیت اللہ کے بعد:

حج سے واپس ہونے کے بعد آپ نے شبانہ روز پیر محمد والی مسجد میں رہنا اختیار کیا وہاں ہزاروں آدمی مرید ہوئے اور سیکڑوں طالب علموں نے پڑھا۔

مسجد پیر محمد مرحوم کا منظر:

تھانہ بھون کی یہ وہ تاریخی مسجد ہے جس کو مشائخ وقت ''دوکان معرفت'' کہا کرتے تھے حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ کے تین با کمال خلفاء بیک وقت اس مسجد کے حجروں میں جمع تھے، جہاں دن رات علم وعرفان اور ذکر وفکر کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ حکیم محمد عمر چرتھاوئی نے اپنے الفاظ میں.

اس مسجد کی مرکزیت کا جو نقشہ کھینچا ہے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کا اقتباس اس موقع پر پیش کردوں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

''سبحان اللہ و بحمد اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادتگاہ قدسی نفساں تھی، ہمپایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی، ایک طرف شمال کے حجرے میں مثال قطب شمالی، عاشق ذوالجلال شہید لم یزلی ولی ازلی حافظ ضامن علیؒ یاد الٰہی میں مشغول رہتے ایک جانب، جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطان زمین ولایت وکرامت، ماہ آسمان رفعت وعظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرم قال اللہ وقال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کو گرتے پڑتو نکے تھامنے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس سرہٗ الخالق۔۔۔۔۔۔۔کبھی درس وتدریس طلبہ میں۔۔۔۔۔۔کبھی مشاہدات ذات و سلطان الاذکار میں مستغرق۔۔۔۔۔۔۔۔ہر ڈھنگ میں زیر قدم نبی مقبول، باطن میں سب سے الگ ظاہر میں شمول رہتے تینوں صاحب، علاوہ اتحاد نسب ایک پیر کے مرید وہ ماہ تو وہ بدر وہ بدر وہ خورشید، جب کوئی شخص مرید ہونے کے واسطے اس قافلے میں آتا ہفتوں بلکہ مہینوں بار بیعت نہ پاتا جسکے پاس جاتا وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو بتلاتا۔ دن رات پانچ سات طالب علم بحث مابعد وماسبق میں مصروف، روز وشب دس بیس مرید پُر ادب　ہو حق میں مصروف کوئی ذکر کلمہ طیب سے مطیب کوئی تلاوت کلام زیبا سے مزیب، کسی کا دل پر اضطرار، صورت سیماب گرمی شغل ہوسے، جواب برق مضطر، کسی کا سینہ فگار، کناں وار، ضربات اسم ذات حق سے نمونہ شق القمر۔۔۔۔کوئی آٹھوں پہر بارہ تسبیح کے ذکر میں کوئی نفی واثبات۔۔۔۔۔۔۔پر نظر جمائے ہوئے کوئی ذکر خفی کے ذریعہ۔۔۔۔۔دھیان لگائے ہوئے۔کوئی مجرد الا اللہ کی ضربیں لگاتا اسم ذات پڑھتا۔۔۔۔کوئی درود نامحدود پڑھنے میں دل وجاں سے متوجہ، کوئی ادائے نوافل و وظائف میں اطمینان سے متوجہ۔۔۔۔کوئی قرآن خوانی کرتا کوئی۔۔۔مراقبات میں جاں فشانی کرتا، کوئی تفسیر پڑھتا، حدیث سند کرتا کوئی فقہ واصول میں جد وجہد کرتا کوئی منازل ومقامات درویشی کی تحقیق میں، کوئی مراحل ومراتب

تصوف کی تصدیق میں۔ طرہ برآں کسی طرف تسبیح خواں کبوتران یاھو کسی طرف کچھ قمریاں مشغول حق سرہٗ اور جب کبھی دو چار دل فگار مریداں رشید حضرات ممدوح الاذکار میں سے مثل مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی یا میاں جی کمال الدین چرتھاولی غفرہما اللہ الولی، خواہ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری یا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہما اللہ الحی آتے جاتے کچھ اور ہی رنگ جماتے۔۔۔۔ جہاں گل وہاں خار، جہاں نیک وہاں نکوہیدہ کار جس جگہ یہ سب حضرات وہاں ہم سا بھی واہیات کم محنت، غفلت شعار محض مشتاق دیدار اپنے مرشد کا چہرہ دیکھنے کے مارے سب سے کنارے ٹکٹکی لگائے ہوئے ذکر سے مطلب نہ فکر سے واسطہ دید کی عید میں سدہ بدہ گنوائے ہوئے۔ ہر شب میں وقت سحر ذکر جہر کا وہ شور بڑھتا کہ دن چڑھے اٹھنے والا بھی نہایت ذوق وشوق سے اول وقت اٹھ کر صبح کی نماز جماعت سے پڑھتا۔ کبھی نسبت حضرات چشت اہل بہشت کا ایراد سعد ہوتا، بلند خندۂ گل نالہ بلبل، گریہ ابر و نعرۂ رعد ہوتا۔۔۔۔ گاہے نسبت خاصان بارگاہ خداوند حضرات نقش بند کا ورود مسعود ہوتا' تسکین کے نقشے جمتے' مفتوح باب تجلیات ہوتا۔۔۔ کبھی ظہور نسبت سلسلہ حضرات سہروردہوتا پیدا سوز وساز وقلق وگداز و درد ہوتا' ساقی کی نشلی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہی سب کے سب بے ہوش ہوتے' بے دلوں کے نشے ہرن' اہل دل سرور محبت الٰہی میں خود فراموش ہوتے، گاہے خاندان شاہنشاہ اولیا صاحب مجد وعلٰی، غوث الثقلین وسیلتنا فی الدارین حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نسبت کا نزول ہوتا مرادیں برآتیں مقصد آخر حصول ہوتا۔۔۔ اور جب کبھی حضرت کے جی میں آجاتا اور مثنوی مولانا روم یا دفتر ہفتم مصنفہ اپنا پڑھنا شروع فرماتے مبتدی ہوتا خواہ منتہی ہر قطرے کو دریا بناتے در و دیوار کو رلاتے۔ ایک طرف گوشہ جنوب و مشرق احاطہ مسجد میں مولوی محمد اعلیٰؒ کی قبر مثل پارۂ ابر شجر اخضر کے پایہ میں۔۔۔۔ جس طالب علم نے یہاں بیٹھ کر مطالعہ کتاب میں جی لگایا۔۔۔۔ مطالب ومضامین ذہن نشین ہوئے۔۔۔۔ یہ بزرگ کہ مولانا صاحب کے دادا کے بھائی ہیں مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے ہم عصر تھے عالم وفاضل، درویش کامل صاحب نظم ونثر تھے ''اصطلاحات الفنون'' مؤلفہ آنحضرت کی بہت بڑی کتاب ہے فی زماننا نہایت کارآمد احباب

ہے ایک مرتبہ طبع بھی ہوئی اب نایاب ہے، بیچ میں مسجد کے ....ایک چھوٹی کوئی (کنویاں) بڑے موقع سے بنی ہوئی پانی وہ خنک اور شیریں گویا بہشت کی نہر کا سوتا ہے جو بیدار بخت یہاں سے پانی بھرتا ہے بہشتی ہوتا ہے، مسجد کی صورت وشان قطع نظر، خوبی عمارت، واسلوبی بنیان، قابل تامل عارفاں، بر جی نہ مینار صرف بیچ میں ایک گنبد صورت سر انسان۔ خیال کر کے دیکھو تو ایک آدمی بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غور کر کے صاف مفہوم ہوتا ہے کہ امام اپنے مقتدیوں کو نماز پڑھا کر دعا مانگ رہا ہے.......اور یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ اسی مسجد متبرک میں پہلے ان حضرات ممدوح سے ایک مدت تک حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس سرہٗ رہے اور حسب پیش گوئی 'مولوی معنویؒ' اشعار باقی ماندہ دفتر ششم..... کہے .... المختصر لغایت ۱۲۷۲ھ قائم یہ جلسہ سعید رہا ہر رات شب برات، ہر روز روز عید رہا۔

ازواج واولاد:

سب سے پہلے قاضی محبوب علی خاں کی بھانجی سے آپ کی نسبت قرار پائی تھی اتفاق سے وہ مخطوبہ خاتون چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر نابینا ہوگئیں لہٰذا ۱۲۵۳ھ میں پہلا نکاح ایک ایسی خاتون سے ہوا جو آپ سے خود نکاح کرنا چاہتی تھیں یہ غالباً دہلی کی رہنے والی تھیں۔ حکیم محمد عمر چرتھاویؒ نے لکھا ہے کہ مولوی سید احمد جدّے والے کی سفارش سے مولانا ان کو اپنے نکاح میں لائے ان سے کوئی اولاد نہ تھی ۱۲۷۲ھ میں مولوی محمد زماں کی بیوہ لڑکی سے نکاح ہوا جو ۱۲۷۷ھ تک حیات رہیں۔ مولانا محمد محمود صاحب اور ایک صاحبزادی ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ۱۲۷۷ھ میں جبکہ والدہ مولانا محمد محمود کا انتقال ہو گیا تو ۱۸۵۷ء کی معروف شخصیت قاضی عنایت علی خاں تھانوی کی حقیقی ہمشیرہ سے جو بیوہ تھیں آپکا نکاح ہوا اور ان محترمہ کی سفارش سے حضرتؒ نے اپنی ابتدائی مخطوبہ سے بھی جو بیچاری نابینا تھیں نکاح کیا۔ تھانہ بھون کے عمائد میں بیواؤں کے نکاح کا دستور نہیں تھا حضرت مولانا ہی کے ذریعے اس جگہ یہ سنت جاری ہوئی۔ ایک صاحبزادی اور میاں محمد عمر، قاضی عنایت علی خاں کی بہن سے تھے اور حافظ محمد صدیق جو میاں محمد عمر سے ستائیس روز بڑے تھے بی بی نابینا کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ۱۲۸۷ھ میں

جب والدہ میاں محمد عمر انتقال کر گئیں تو میرٹھ کی ایک بیوہ سے نکاح کیا وہ تھوڑے دنوں زندہ رہ کر انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد آپ نے اور بھی ایک نکاح بضرورت انتظام خانہ داری کسی بیوہ سے کیا تھا جب اس میں انتظام کا سلیقہ نہ دیکھا تو مجبوراً طلاق دے کر بعد ادائے زرمہر مقررہ علیحدہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک حرم بھی آپ کے نکاح میں کبھی رہی تھیں۔

معرکہ ۱۸۵۷ء کے بعد:

معرکہ شاملی ۱۸۵۷ء میں اگرچہ آپ نے شرکت نہیں فرمائی تھی اور اس عظیم معرکہ جہاد میں آپ کی عدم شرکت ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی اس کے باوجود انگریز نے قابو یافتہ ہو کر آپ کو بھی بہت پریشان کیا اسکی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ مسجد پیر محمد کے اقطاب ثلثہ میں سے (جو ایک روح اور تین قالب کی حیثیت رکھتے تھے) دو بزرگ ممتاز حیثیت سے معرکہ جہاد میں شریک ہوئے تھے حضرت مولاناؒ نے یقیناً نیک نیتی کے ساتھ اختلاف رائے کیا اور اس اختلاف رائے میں مجاہدین سے کسی قسم کی مخالفت وعناد کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ تھا انگریز کی حمایت بھی ہرگز مقصود نہ تھی، مجاہدین کو بھی آپ کی عدم شرکت سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ تقدیر الٰہی کا ظہور اسی طرح ہونا تھا سو ہوا، ۱۸۵۷ء کے بعد خانقاہ تھانہ بھون کا نظام درہم برہم ہو گیا، حافظ محمد ضامنؒ شہید ہو گئے، حضرت حاجی صاحبؒ مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے اور آپ بھی آخر وقت تک اس خانقاہ میں پھر چین و آرام سے نہ بیٹھ سکے۔

قیام میرٹھ:

۱۲۷۴ھ سے ۱۲۷۷ھ تک آپ کا قیام اکثر میرٹھ میں رہا اور یہاں کثیر تعداد میں لوگ شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ خیر نگر کی مسجد خیر المساجد آپ کا مستقر تھی اور وہیں درس و ذکر کے حلقے ہوتے تھے۔

قیام ٹونک:

۱۲۷۸ھ میں حسب طلب نواب محمد علی خاں ابن نواب وزیر الدولہ مرحوم آپ ٹونک تشریف

لے گئے وہاں نواب محمد علی خاں صاحب نے آپ سے حدیث پڑھی ۱۲۸۰ھ تک آپ وہاں رہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مقدمہ جائداد:

۱۲۸۰ھ میں گورنمنٹ برطانیہ نے آپ کو اشتہار نیلام محال بغاوت تھانہ بھون، نواب ٹونک کی معرفت بھیجا۔ مولانا کی جائداد بھی نیلام کی زد میں آ گئی تھی۔ نواب محمد علی خاں مرحوم نے اس موقع پر خدمت استاذ کو ضروری سمجھتے ہوئے پینتیس ہزار روپے نقد آپ کو دیئے اور فرمایا کہ آپ وطن تشریف لے جا کر اپنی جائداد کو اس روپے سے نیلام میں خرید لیجیے، چنانچہ مولانا تاریخ معین پر مظفرنگر پہونچ گئے اور اپنی جائداد کا نیلام انیس ہزار روپے میں خرید لیا زر چہارم بھی داخل خزانہ کر کے رسید لے لی تھی مگر جملہ کاروائی ہو جانے کے بعد اگلے روز مظفرنگر کے کلکٹر نے بالکل قانون کے خلاف وہ جائداد تھوڑے سے اضافے سے بلدیو سہائے بیوہری کو دیدی جب ایسا ہوا تو آپ نے استغنائے مزاج کی بناپر وہ تمام روپیہ ریاست ٹونک کے خزانے کو واپس فرمادیا اور بیوہری سے مقدمہ لڑایا۔ ایک مدت کے بعد جب مقدمہ جیت گئے تو اس وقت نواب محمد علی خاں کو انگریزوں نے ریاست ٹونک سے معزول کر کے بنارس بھیج دیا تھا ،ان کا مال واسباب متعلقہ ریاست بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔ حضرت مولاناؒ کو اپنی جائداد کا اتنا فکر نہ تھا جتنا نواب صاحب کے معزول ہونے کا رنج ہوا۔ فرماتے تھے کہ دیکھئے نواب صاحب کی بحالی کا وقت ہماری زندگی میں آئیگا یا نہیں؟۔ مقدمہ جیتنے کے بعد حضرت مولاناؒ کو فقط ضابطہ کے دستخط کرنے پڑے باقی کام خدام نے بالا ہی بالا انجام دے کر تمام زر نیلام میعاد کے اندر داخل کر کے حسب ضابطہ دخل لے لیا، اس مرتبہ روپیہ میرٹھ کے ایک مہاجن سے لے لیا گیا تھا حضرت مولاناؒ کو جب معلوم ہوا تو سخت ناگوار ہوا اور فرمایا کہ دیکھئے کب تک اس سود کے چکر سے نجات ہوتی ہے۔

بنارس میں نواب محمد علی خاں سے ملاقات:

اسی زمانے میں نواب محمد علی خاں معزول والی ٹونک سے ملاقات کرنے کیلئے بنارس تشریف لے گئے اور کئی روز تک وہاں رہے۔ وقت رخصت نواب صاحب نے پچیس ہزار روپے کا جڑاؤ زیور

بیگمات سے منگا کر استاذ کے سامنے رکھ دیا اور عرض کیا کہ اس کو قبول فرما لیجئے آپ نے فرمایا کہ فقیر تو صرف آپ کی ملاقات کو آیا تھا۔ آپ کا حسن اخلاق یہاں تک کھینچ لایا تھا۔ گو میں قرضدار ہوں مگر یہ بات کسی طرح گوارہ نہیں کہ بیگمات کا زیور لے کر ادائے قرض کا اہتمام کروں، ہاں اگر آپ کے پاس روپیہ ہوتا تو کچھ انکار نہ ہوتا۔ جتنا نواب صاحب نے اصرار کیا، آپ کا انکار قائم رہا۔ آخر میں نواب صاحب نے قسم کھا کر کہا کہ یہ زیور بہ نیت تجارت عقبیٰ اتر چکا ہے اب جسم بیگمات پر واپس نہ جائے گا اگر آپ قبول فرمالیں تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ یہ حجاج اور ارباب احتیاج کے صرف میں آئے گا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ''جزاك اللہ فی الدارین''۔ جو کچھ آپ کی رائے ہو بہتر ہے مگر فقیر کو اس کے لینے میں بہر حال شرم محسوس ہوتی ہے اس کے بعد حضرت مولانا اپنے وطن کو واپس ہو گئے۔ اور نواب صاحب نے اپنے قول کے مطابق وہ سب کا سب زیور دیگر مستحقوں کو دیدیا۔

نواب چھتاری سے قرض:

بیوہری کے مقابلہ میں کامیابی ہوگئی تھی اور سالہائے گزشتہ کی آمدنی کی ڈگری مع زرسود پالی تھی لیکن حضرت مولاناؒ نے از روئے تقوی سیکڑوں روپیہ سود کا واپس فرما دیا ادخال نیلام کے وقت بیس ہزار روپیہ میرٹھ کے ایک مہاجن سے قرض لیا گیا تھا۔ چند سال میں وہ روپیہ چھبیس، ستائیس ہزار ہو گیا، اس افزونی کو دیکھ کر خدام کو بڑی تشویش ہوئی۔ بعض حضرات نے زر مذکور کو چندہ کر کے ادا کرنے لئے ایک فہرست بنائی۔ حضرت مولاناؒ کو معلوم ہوا تو پسند نہ فرمایا اور فرمایا کہ یہ بھی ایک قسم کی دریوزہ گری ہے، کچھ دنوں صبر کرو اللہ کا فضل چاہئے جب وقت آئے گا تو جس نے جائداد دی ہے وہی خود اس تردد سے بھی سبکدوش فرمائیگا۔ آخر کار ۱۲۸۸ھ میں منشی محراب علی میرٹھی کی معرفت کل روپیہ بطریق قرض حسنہ نواب محمود علی خاں رئیس چھتاری سے لیا گیا۔ سولہ ہزار روپیہ لیکر تو اسی وقت مہاجن کو ادا کر دیا گیا باقی کی نسبت آئندہ کے لئے اقرار ہو گیا کہ جائداد مذکور احتیاطاً نواب صاحب کے یہاں رہن مجری کر دی گئی اور نواب صاحب کے کارندے ''تھانہ بھون'' پہنچ کر تحصیل وصول کرنے لگے۔

نواب صاحب بڑے دیندار اور عالی ہمت تھے باوجودیکہ حضرت مولانا سے کسی قسم کا تعارف یا تعلق نہ تھا اور نہ دستاویز کی تحریر کے وقت ہی ملاقات ہوئی تھی محض مولاناؒ کے علم وفضل کے پیش نظر خالصاً لوجہ اللہ یہ معاملہ کیا تھا۔

کارندوں کی کارستانیاں:

مگر نواب صاحب کے کارندوں نے یہ کیا کہ سال تمام کی آمدنی میں سے، بعد منہائی مصارف کبھی جی میں آیا تو تھوڑی بہت رقم رہن مجری کی فرد میں درج کردی ورنہ کچھ بھی نہیں۔ کوئی دوسرا ان پر نگراں تھا ہی نہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے مولاناؒ کے ملازموں پر الزام تراش کر ایسی صورت پیدا کردی کہ مولاناؒ میں اور نواب صاحب میں ملاقات نہ ہوسکے اور طرفین میں بگاڑ پیدا ہوجائے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کارندوں کی تحریروں کی وجہ سے نواب صاحب کے دل میں ملال پیدا ہوگیا۔ اور ماقی روپیہ دینا تو درکنار جو دیا تھا اس کے واپس لینے کا خیال ہوگیا۔ کارندے اس موقع کے منتظر ہی تھے وہ مقدمہ بازی میں بھی طاق تھے۔ جھٹ مولاناؒ پر واپسی رہن کا دعویٰ کردیا گیا۔ حضرت مولاناؒ نے ان کے دعوے کو مان لیا اور نواب صاحب کی ڈگری ہوگئی۔ کارندوں نے ڈگری جاری کرا کے جائداد مکفول نیلام پر چڑھوادی برسوں قضیے جھگڑے رہے کبھی نواب صاحب کے کارندوں کی درخواست کے موافق تاریخ نیلام مقرر ہوگئی اور کبھی خدام حضرت مولاناؒ کی کوشش سے التوا کی نوبت آئی۔ کبھی جائداد نیلام ہوگئی اور کبھی خدام نے ہائی کورٹ سے اس کو منسوخ کرادیا۔ حضرت مولاناؒ اپنے خدام سے فرماتے تھے۔ ''کہاں کا قصہ ہے دور بھی کرو نیلام ہوجانے دو مگر نواب صاحب ہی خریدیں''۔ مالیت جائداد کا تخمینہ عدالت ماتحت سے ایک لاکھ روپیہ ہوا تھا اور مع زرقرضہ مابقی مہاجن تیس بتیس ہزار روپیہ دینا تھا۔ بالآخر یہ قیمتی جائداد ۱۲۹۳ھ میں تین چوتھائی سے زیادہ نواب صاحب نے بذریعہ نیلام خود ہی خرید لی اور کچھ کم چوتھائی جائداد مع مکانات سکنی مولانا کے پاس چھوڑ دی۔ کل جائداد پر قبضہ کارندوں کا تھا ہی اب منشائے دلی بھی ان کا پورا ہوگیا۔ حاسدوں کی بن آئی کوئی کہتا کہ مکانات جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی صبح وشام میں نیلام ہوجائینگے کوئی

کہتا کہ نواب صاحب مولاناؒ کے نام بقیہ زرِ ڈگری کی بابت وارنٹ گرفتاری جاری کرائیں گے۔ مگر آپ کو کوئی فکر نہ تھا۔ کارندوں کی ابتدائی کاروائی سے انتہائے نیلام تک احباب نے ہر چند عرض کیا کہ نواب صاحب سے جا کر براہ راست ملاقات کر لیجئے مگر ملاقات تو کیا آپ نے اس سلسلہ میں ایک خط تک بھی چھتاری کو نہ لکھا اور نہایت استغنا سے فرمایا: ''مجھے خوشامد نہیں آتی۔''

حیدر آباد سے طلبی:

اسی زمانے میں کئی بار حیدر آباد دکن سے آپ کی طلبی کے خطوط آئے وہاں کے عمائد نے آپ کو بصد آرزو بلایا اور بعض احباب نے بھی لکھا کہ آپ کچھ عرصے کیلئے یہاں تشریف لے آئیں گے تو فکر قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں گے مگر آپ وہاں تشریف نہیں لے گئے اور یہ فرمایا کہ وہاں کے بہت سے علما حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید قدس سرہٗ کے مخالف ہیں مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔

نواب صاحب چھتاری کی طلبی:

آخر ۱۲۹۴ھ میں جبکہ نیلام کے تمام قضیے ختم ہو گئے اور کارندے اپنی سی کر چکے تو خود بخود نواب صاحب کے قلب میں دریائے حق پرستی وسخاوت موجزن ہوا اور دل میں یہ بات آئی کہ مولاناؒ نے اس مقدمہ میں ہماری وجہ سے بہت کچھ تکلیف اٹھائی ہے جس طرح ہو سکے ان سے صفائی کرنی ضروری ہے۔ چنانچہ منشی محراب علی میرٹھی کو لکھا کہ ہمارے کئی عریضے حضرت کی خدمت میں گئے مگر جواب ملاقات سے انکار کی صورت میں آیا۔ نواب صاحب نے اس قسم کے کئی خط منشی صاحب کو لکھے اور ہر مرتبہ منشی صاحب نے حضرت مولانا کو نواب صاحب کے مضمون خط سے مطلع کیا، مگر آپ چھتاری کا نام تک نہ لیتے تھے۔ اسی اثنا میں حضرت مولاناؒ میرٹھ تشریف لائے تو منشی صاحب بصد منت وسماجت اپنے ہمراہ چھتاری لے گئے۔

چھتاری تشریف لیجانا:

چھتاری پہنچ کر آپ ایک مکان میں فروکش ہوئے نواب صاحب نے جب تشریف آوری کی

خبر سنی بہت خوش ہوئے جمعہ کا دن تھا جامع مسجد میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حضرت مولاناؒ نواب صاحب سے استغنا کے ساتھ ملے بعد نماز لوگوں کے اصرار سے حضرتؒ نے وعظ فرمایا۔ نواب صاحب بھی مجلس وعظ میں موجود تھے شروع سے آخر تک وعظ سنتے رہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر حضرت مولاناؒ جب اپنی جائے قیام پر تشریف لائے تو نواب صاحب وہاں ملنے کے واسطے آئے اور عرض کیا کہ میں تفصیلی ملاقات چاہتا ہوں ساتھ ہی ساتھ تا قیام اپنے یہاں ٹھہرنے کی درخواست پیش کی اور اپنے صاحبزادے نواب محمد عبدالعلی خان کو حکم دے گئے کہ وہ خدمت بابرکت میں برابر حاضر رہے۔ حضرت مولاناؒ نے نواب صاحب کی دین داری کو دیکھ کر اس درخواست کو منظور فرمایا دوسرے دن علی الصباح نواب صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے اور حسب درخواست نواب صاحب وعظ بھی دوسری مرتبہ فرمایا جلسہ وعظ میں عجیب کیفیت تھی حاضرین رو رہے تھے۔

تخلیے میں نواب صاحب سے گفتگو:

اس کے دوسرے دن نواب صاحب نے اپنے اوراد و وظائف کے کمرہ میں بغرض تخلیہ حضرت مولاناؒ کو مدعو کیا۔ سنگ مرمر کی چوکی کے سرہانے جس پر خود نواب صاحب بیٹھتے تھے حضرت مولانا کو بٹھایا اور دوسری جانب خود بیٹھ گئے اور دیر تک مقدمۂ جائداد کے بارے میں عذر و معذرت کرتے رہے اور اپنے قصور کی معافی چاہی اور فرمایا کہ جو کچھ بے اعتنائی ہماری طرف سے ہوئی ہے اسکو اللہ کے واسطے معاف فرما دیجئے اور اس وقت مجھ کو وہ آیتیں سنایئے جو قرآن مجید میں قرض حسن کے بارے میں ہیں آپ نے ایک آیت کے علاوہ باقی تمام آیات اس مضمون کی قرآن شریف کے مختلف مقامات سے پڑھ کر سنائیں اس پر نواب صاحب نے فرمایا اے حافظ کلام اللہ! ان آیتوں میں ابھی اس ایک آیت کی بھول ہے جو قرض خواہ کو قرضہ سہولت کے ساتھ وصول کرنے کے متعلق ہے فرمایا وہ یہ ہے۔ "وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرہ" ط (اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اسکو آسودگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔

نواب صاحب! ہاں وہ آیت یہی ہے مگر یہ تو فرمایئے کہ علماء کے نزدیک اس مسئلہ میں کیا شکل اختیار کی جائے۔

حضرت مولانا !وقت تونگری و آسانی تک مہلت دینے کا حکم ہے جہاں تک ہو سکے بتدریج قرضہ وصول کیا جائے۔

نواب صاحب !۔پھراب معاملہ اقدس میں کس قسم کی آسانی چاہئے؟

حضرت مولانا!ہزار بارہ سو روپیہ سال قسط ہو جانی چاہیے۔

نواب صاحب !اس تھوڑی سی رقم کی قسط بندی کے لیے تو مدت کثیر درکار ہوگی اور اس میں آسانی ہی کیا ہے؟ آخر پھر وہی دشواری پیش آئیگی۔خیر اب آپ آگے پڑھئے اس آیت کے بعد کیا ارشاد باری ہے۔

حضرت مولانا!اس کے بعد ارشاد باری ہے۔"وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعملون (اگر تم معاف کردو تو یہ بات تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم کو اس کے ثواب کی خبر ہو)۔

نواب صاحب !اس آیت کے مضمون کے مطابق تمام روپیہ معاف نہ کر دیا جائے؟

حضرت مولانا!یہ معاملہ اس شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے جو قرض قلیل اپنے ذمہ رکھتا ہو۔

نواب صاحب !اس آیت میں تو قلیل نہ کثیر کی تفصیل ہے نہیں۔

حضرت مولانا!یہ جو کچھ آپ نے فرمایا بجا ہے مگر مجھ سے میرے ہی معاملے میں مشورہ لینا خلاف قاعدہ ہے آپ اس بارے میں اپنے صاحبزادوں سے مشورہ لیجیے یا اپنے خیر خواہ کارندوں سے دریافت کیجیے۔

نواب صاحب یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور روتی ہوئی آواز سے دست بستہ یوں فرمایا اے حضرت یہ سب روپیہ حسب ارشاد باری تعالی میں نے خدام والا کی نذر کیا آپ کی جائداد آپ کو مبارک ہو جس طرح چاہئے رکھئے اپنے کارندوں کو میں تھانہ بھون سے واپس بلائے لیتا ہوں۔مگر یہ راز تحریر دستاویز تک کسی پر کھلنے نہ پائے۔حضرت مولاناؒ نے نواب صاحب کو پہلے تو بکمال اصرار بٹھایا پھر فرمایا کہ واقعی آپ کی دریادلی میں کوئی شبہ نہیں مگر زر قرضہ بہت کثیر ہے اس قدر تکلیف میں آپ کو نہیں دے سکتا اگر میرے حال پر عنایت ہی

منظور ہے تو نصف جائیداد اس روپے کے عوض میں اپنے پاس رہنے دیجیے یا مناسب قسط کر لیجئے۔

نواب صاحب! اجی حضرت اب تو یہ سب جائداد خداوند عالم نے آپ کو دلوائی ہے شکر حق بجالا یئے قبول فرمالیجئے۔

حضرت مولانا! مانا کہ آپ کے نزدیک اس روپیہ کی کچھ حقیقت نہیں مگر اسی وقت تو کہ کارندوں کو دخل نہ ہو۔

نواب صاحب! شاید آپ کارندوں کی سابقہ بے اعتدالی کا تذکرہ فرما رہے ہیں اب اس معاملہ میں ان کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ بالآخر حضرت مولاناؒ نے نواب صاحب کی پیش کش کو منظور فرمالیا اور وطن واپس ہوئے۔ نواب صاحب نے اپنے کارندوں کے نام واپس آنے کے احکام جاری فرما دیئے۔ چنانچہ حضرت مولانا کے ''تھانہ بھون'' پہونچتے ہی کارندوں نے کاغذات متعلقہ کو آپ کے سپرد کر کے چھتاری کا راستہ لیا۔ اس کے سولہ ماہ بعد حضرت مولانا کا وصال ہو گیا تو نواب صاحب نے مولانا رحم الٰہی منگلوری کی معرفت مولانا محمد محمود، حافظ محمد صدیق اور مولانا محمد عمر کو بلوایا اور جائداد کا اطمینان دلایا نیز کچھ نقد بھی مصارف مہمانداری کے لیے دیا اور بکمال عنایت فرمایا کے عنقریب دستاویز واپسی کی تکمیل ہو جائے گی چنانچہ چند ماہ بعد جائداد کو صاحبزادوں کے نام لکھ دیا۔

مسجد رنگریزاں میرٹھ میں کچھ دنوں قیام:

۱۲۸۷ھ میں سید محمد عسکری ڈپٹی کلکٹر ضلع رائے بریلی کا ایک عریضہ آپ کے نام آیا تھا جس میں اپنی حاضری کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے صرف آپ کی ملاقات کی غرض سے رخصت لی ہے۔ آپ نے حکیم محمد عمر چرتھاولی سے اس کا جواب لکھوایا اس میں تحریر تھا کہ جب آپ تشریف لائیں تو پہلے میرٹھ اتر کر مسجد رنگریزاں کے حجرے میں مجھے دیکھ لیں کیا عجب ہے کہ وہیں ملاقات ہو جائے آگے جانا نہ پڑے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ مسودہ انوار محمدی جو منشی محراب علی کے ہاں تھا اور جو بعد مقابلہ وتصحیح حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوریؒ اور حکیم محمد عمر چرتھاویؒ کی نگرانی میں طبع ہوا اس کے مقابلہ کے وقت، حضرت

مولاناؒ میرٹھ تشریف لے آئے اسی وقت سید محمد عسکری میرٹھ آئے اور حضرت مولاناؒ کے ساتھ قاضی صاحبؒ اور حکیم صاحبؒ مذکور سے بھی ملاقات ہوئی۔

تصانیف:

آپ کی تصانیف کی تعداد حکیم محمد عمر صاحب چرتھاویؒ نے بتیس لکھی ہے جن میں سے ان آٹھ کتابوں کے متعلق لکھا ہے کہ طبع ہو چکی ہیں۔(۱) دلائل الافکار فی اثبات الجہر والاسرار،(۲) مناظرہ محمدیہ فی بحث بعض عقائد دینیہ،(۳) مکاتیب محمدیہ فی جواب اعتراض مولوی بشیر الدین قنوجی،(۴) ارشاد محمدی فی الاشغال والاعمال،(۵) انوار محمدی فی المراقبات والمشاہدات،(۶) رسالہ صلوۃ،(۷) الہامات محمدیہ، جس کا پورا نام الہامات الموجود فی تحقیق وحدۃ الوجود الشہود ہے،(۸) قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ یہ کتاب مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلیؒ کی کتاب ''دافع الوسواس'' کے جواب میں تحریر فرمائی ہے۔ ذیل کی کتابوں کے متعلق مؤلف حالات محمدیہ نے لکھا ہے کہ شائع نہیں ہوئیں۔

رسالہ گل ولالہ، فتاوی محمدی، شرح نسائی شریف، دفتر ہفتم مثنوی مولانا رومؒ۔ باقی بیس کتابوں کے نام سوانح نگار نے نہیں بتائے۔ رسالہ تنبیہ مؤلفہ قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوریؒ کے ایک حاشیہ میں حضرت مولانا کی ایک کتاب ''فیضان محمدی'' کا ذکر ملتا ہے۔ بیاض محمدی حصہ اول جس میں مجرب اعمال و نقوش ہیں مسلم پریس دہلی میں طبع ہوئی ہے غالباً اس بیاض کا دوسرا حصہ بھی ہوگا۔ حالات محمدیہ کے شائع ہونے کے بعد دفتر ہفتم مثنوی، محبوب المطابع میرٹھ میں چھپ گیا ہے شرح نسائی کے بارے میں مولانا سید حامد حسنین صاحب امروہی زید مجدہم کے ایک مکتوب گرامی سے معلوم ہوا کہ وہ نسائی شریف کے حاشیے پر کسی مطبع میں شائع ہوگئی ہے اور مطبوعہ شکل میں انھوں نے اس کو پڑھا ہے۔

---

[۱] آپ کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے اجازت بیعت حاصل تھی ۱۹۹۰ء میں تھانہ بھون انتقال ہوا اور وہیں تدفین ہوئی اور آپ کے والد ماجد حافظ زاہد حسین مجاز صحبت تھے۔ (محب الحق)

آپ کی چند تصانیف کے متعلق ضروری معلومات:

ارشاد محمدی کو حضرت مولاناؒ نے زمانہ قیام میرٹھ یعنی ۱۲۷۷ھ میں تصنیف کیا ہے۔ یہ کتاب محبوب المطابع میرٹھ میں طبع ہوئی ہے۔ انوار محمدی مولانا کی حیات میں مطبع ضیائی میرٹھ میں باہتمام محمد حیات صاحب طبع ہوئی۔ رسالہ گل ولالہ جو تصوف میں ہے حضرت میاں جی نور محمدؒ کی حیات میں تصنیف ہو گیا تھا۔ حضرت میاں جیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں اس رسالے کے مطالعے کا اشتیاق ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔ رسالہ گل ولالہ مصنفہ آں مجمع کمالات، عارف معارف ربانیہ و محقق حقائق وہبانیہ کہ مسماۃ **بتقیۃ الاعتقاد لتصفیۃ الفواد من الکفر و الارتداد** درفن تصوف است پس کمال شائقم خوشا روز یکہ عیون مشتاقان جمالش بکحل الجواہر مطالعہ اش منور شوند۔ (یعنی آپ کا رسالہ گل ولالہ جو فن تصوف میں ہے میں اس کے مطالعے کا بہت مشتاق ہوں وہ دن بہت ہی اچھا ہوگا جس دن آنکھیں اس رسالہ کے مطالعہ سے منور ہونگی)۔

دفتر ہفتم مثنوی کے متعلق مختصراً اتنا لکھا ہے کہ یہ مثنوی اعلیٰ اور معیاری فارسی میں ہے درحقیقت یہ مثنوی آپ کے ذوق شعری کی آئینہ دار اور آپ کی فارسی انشاء کا زبردست شاہکار ہے۔ سوز وگداز ،سلاست وروانی اور فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ میرے ذہن میں مدت سے یہ بات تھی اور غالباً مشہور بھی یہی ہے کہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ نے مثنوی کا دفتر ہفتم لکھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے مثنوی مولانا روم کے دفتر ششم کو مکمل فرمایا ہے مثنوی کا دفتر ہفتم حضرت مولانا شیخ محمد محدثؒ کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔

تلامذہ:

آپ کے تلامذہ میں ضلع سہارنپور، ضلع مظفرنگر، ضلع میرٹھ اور ٹونک وغیرہ کی بڑی بڑی باکمال شخصیتیں ہونگی اور کل شاگردوں کی فہرست یقیناً بہت طویل ہوگی۔ مگر مجھے ان تین حضرات کے علاوہ اور

شاگرد معلوم نہ ہو سکے۔(۱) قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہریؒ (قاضی بھوپال)۔(۲) نواب محمد علی خاں والی ٹونکؒ۔(۳) دیوان شمس الدینؒ نائب ریاست ٹونک۔

ایک کرامت:

حالات محمدیہ میں آپ کی بہت کرامات بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہاں لکھی جاتی ہے۔

۱۲۷۶ھ میں بوقت بندوبست سرکاری آپ کی قدیم حویلی میں منشی عبد السبحان منصرم سہارنپوری مع متعلقین رہتے تھے اس مکان کے غیر آباد ہونے کی وجہ سے وہاں جن کا اثر ہو گیا تھا اور وہ ساکنین مکان کو رات دن پریشان کرتا رہتا تھا حتی کہ مکان میں رہنا مشکل ہو گیا جگہ جگہ تعویذ لٹکائے فلیتے جلائے کچھ نتیجہ نہ نکلا اس وقت حضرت مولاناؒ ٹونک میں تھے بالآخر مجبور ہو کر آپ کو اطلاع دی گئی حضرت مولانا نے بواپسی ڈاک یہ مختصر تحریر لکھ کر بھیجی: اے ابن جان یہ مکان میں نے تمہارے نام بیع کیا ہے نہ رہن نہ کرایہ پر دیا ہے نہ عاریۃً بہتر یہی ہے کہ ابھی چھوڑ دو، رفع شر اسی میں ہے کہ راستہ لو، راقم شیخ محمد۔لکھا ہے کہ یہ تحریر پہونچتے ہی وہ جن ہوا ہو گیا۔

آغاز مرض:

رجب ۱۲۹۵ھ میں آپ کو تپ ولرزہ آنے لگا تھا جسکی وجہ سے بہت ضعیف ہو گئے تھے۔حکیم محمد عمر صاحبؒ کا علاج رہا، ایک ماہ بعد آرام ہو گیا مگر طاقت بحال نہیں ہوئی تھی اس کے بعد رمضان آ گیا۔آپ نے کئی سال کے بعد اس سال قرآن شریف سنایا۔رمضان میں ایک دن آپ نے حکیم محمد عمر صاحبؒ اور قاضی صاحبؒ سے فرمایا کہ یہی سال انشاء اللہ سفر وصال معلوم ہوتا ہے آئندہ ماہ صیام تک حیات مفہوم نہیں ہوتی حکیم صاحبؒ نے عرض کیا حضرت کیا فرماتے ہیں یہ ضعف تو عارضی ہے۔یہ سن کر مسکرانے لگے اور دوسرا ذکر چھیڑ دیا۔مزاج حار تھا ترشی کھانے کا بہت شوق تھا سرکہ سے بھی کمال رغبت تھی۔آب شیریں وسرد کی بھی بہت چاہت تھی۔دوا اور پرہیز سے بچتے تھے کبھی کبھی سخت ضرورت میں

بخیال سنت نبوی اور خدام کے تقاضے سے کوئی لطیف وقلیل دوا استعمال فرما لیتے تھے۔ بمطابق سنت دوا کے استعمال کرنے میں بھی عدد طاق کا لحاظ رہتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اکثر سفر کا اتفاق رہا۔ کچھ نہ کچھ تکلیف ہو جاتی تھی مگر اپنی تکلیف کا حال کسی سے بیان نہیں فرماتے تھے۔ تلاوت قرآن، اوراد ووظائف، تہجد واشراق اور دیگر معمولات میں بھی فرق نہیں آتا تھا۔ تصنیف وتالیف کا کام بھی ہوئے جاتا تھا وعظ بھی ہر جمعہ کو اکثر فرماتے تھے جو کوئی طالب علم آجاتا اس کو درس بھی دیتے تھے۔ اور پانچوں وقت کی نماز باہزار اہتمام مسجد میں جماعت سے ادا فرماتے تھے۔

شرح نسائی:

جب آپ کی طبیعت کسی قدر درست ہوئی تو نسائی شریف کی شرح انھیں آخری ایام زندگی میں لکھنی شروع فرمائی۔ اشراق پڑھنے کے بعد لکھنے بیٹھتے اور دوپہر تک منہ نہیں اٹھاتے تھے اور نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد پھر اسی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور جلدی جلدی اس کام کو کر رہے تھے۔ چونکہ قوت حافظہ لاجواب تھی کسی مسئلہ میں چنداں غور کرنے اور کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت واقع نہ ہوتی اگر کبھی شبہ ہوا اور کتاب کو دیکھا تو اپنے حافظے کے مطابق ہی مضمون پاتے تھے۔

آخری تحریر:

بقرعید کی نماز کے بعد حسب عادت آپ مقابرِ اعزاء کو نور فاتحہ سے منور کرنے کے لئے تشریف لے گئے آپ کے خادم محمد صادق صاحب تھانوی ہمراہ تھے ان کو اپنی قبر کی جگہ بتائی۔ آخر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ میں ایک استفتاء سماع موتی کی تحقیق کے بارے میں آیا آپ نے اس کا جواب حکیم محمد عمر صاحب کو املاء کرایا اور بدلائل شرعیہ قرآن وحدیث سے فیضان روحی وسماع موتی کا اثبات فرمایا۔ مولانا رحم الٰہی منگلوریؒ کو جو اس روز اتفاق سے آگئے تھے حرف بحرف سنایا اور حکیم صاحبؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''الحمد للہ یہ مسئلہ بھی اپنے موقع پر طے ہو گیا۔''

چھتاری کا دوسرا سفر:

وسط ربیع الاول میں آپ چھتاری تشریف لے گئے راستے میں چرتھاول میں بھی ایک رات قیام فرمایا۔ چرتھاول میں جب شرح نسائی کا ذکر آیا تو کچھ اس قسم کے کلمات حسرت آیات فرمائے کہ سامعین کے قلب وجگر پاش پاش ہو گئے۔ صبح ہی وہاں سے چھتاری کے لئے سوار ہو کر روانہ ہوئے اور شام تک وہاں پہنچے۔

مرض وفات:

چونکہ حالت ضعف میں یہ طویل سفر کیا تھا اس لئے تکان کے باعث رات کو بخار آ گیا نواب صاحب کے اصرار پر پانچ چھ روز وہاں رہنا ہوا دوا اور پرہیز کچھ نہ تھا۔ وعظ بھی کہنا پڑا۔ بخار بدستور رہا بلکہ بڑھتا ہی رہا حتی کہ جب آپ واپسی میں میرٹھ اترے تو طبیعت بہت ناساز ہوگئی رات بھر نیند نہ آئی صبح کو احباب کے کہنے سے دوا پی۔ دوپہر تک طبیعت کچھ اچھی رہی پھر یکا یک بخار بڑھ گیا اور ساتھ ہی ذات الجنب ہو گیا، اس میں خشکی و تشنگی، سوء تنفس اور کھانسی کی زیادتی ہوگئی بے ہوشی اور غفلت بھی رہنے لگی۔ تین چار روز شہر میرٹھ کے طبیبوں کا معالجہ کیا گیا پھر حکیم عبدالغفور صاحب سکندر آبادی آ گئے ان کا نسخہ دیا گیا۔ ۲۶/ ربیع الاول کو سہ پہر کے وقت منشی غلام حسین ہاپوڑی کو بلا کر فرمایا کہ آج کی رات میرے پاس بیٹھے رہنا انشاء اللہ تعالی اس کے صلے میں تم کو کوئی نفع خاص پہنچے گا چنانچہ وہ بسر وچشم حاضر رہے۔ اس کے بعد آپ کو تھانہ بھون لے جایا گیا۔ طبیعت بدستور ناساز رہی۔ شب وفات سے پہلے جو پیر کا دن آیا تو آپ نے کچھ سنبھالا لیا۔ اسی دن مولانا محمد محمود صاحب، جو ریاست ٹونک میں ناظر تھے، حسب طلب آ گئے۔ حکیم محمد عمر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! میاں محمود بخیر وعافیت آپہنچے، سنتے ہی فرمایا بس تو آج ہی تک کا قصہ تھا۔ اتنے میں میاں محمود نے حاضر خدمت ہو کر سلام عرض کیا۔ حضرت نے حکیم صاحب سے فرمایا اچھا فقیر کی چارپائی درست کرا دو اور خوب دیکھ بھال کر رو بقبلہ بچھا دو سب کو سمجھا دو کہ جہاں

تک فقیر کا سامنا ہے ادھر سے کوئی شخص نہ آنے پائے اور اس وقت میری مجلس میں کسی ایسے شخص کی آمد و رفت نہ ہونے پائے جو مخالف ملت حضرت شفیع محشر ہو پھر فرمایا دیکھو کھانا تیار ہو گیا ہوگا جلد منگالو تم اور محمود مع اور سب صاحبوں کے ایک جگہ بیٹھ کر کھالو۔ المختصر بارہ بجے (دن) سے پہلے پہلے یہ تمام انتظام فرما چکے تھے سب مہمانوں نے کھانا کھالیا چونکہ سوائے دوا یا پانی کے سترہ اٹھارہ دن سے کچھ کھایا پیا نہ تھا نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے مگر 'پاس انفاس' اس حالت میں بھی برابر جاری رہا۔ شروع زمانہ ذکر و شغل سے جاگتے سوتے، سوار پیادہ، ارادہ بلا ارادہ پاس انفاس جاری رہتا تھا، اسی شدت مرض کے زمانہ میں ایک دن فرمایا کہ فقیر اس کے ترک کی قدرت نہیں رکھتا دم بھر کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ جب دن چڑھا ایک دورہ پڑا جس سے تنفس بڑھ گیا آپ نے آہستہ آہستہ کچھ پڑھا اور حکیم صاحب سے فرمایا کہ دو مونڈھے منگالو اور میری چارپائی سے جانب قبلہ اپنا مونڈھا اور جانب شرق محمود کا مونڈھا ڈالو اور دونوں جانب تم دونوں بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر میرا حال دیکھو۔ تعمیل ارشاد کی گئی۔ اسکے بعد لمبے سانس کے ساتھ اللہ کہا اور آنکھیں بند کئے بیس منٹ تک بے حس و حرکت لیٹے رہے اور پھر آنکھیں کھول کر میاں محمود سے مخاطب ہو کر فرمایا کچھ دیکھا؟ انہوں نے عرض کیا شاید نیند کا اثر تھا فرمایا نہیں۔ بعدہٗ حکیم صاحب سے فرمایا بھلا کیا بات تھی؟ انہوں نے عرض کیا شائد حضرت کی توجہ خداوند قدوس کی جانب تھی، فرمایا ہاں۔ دن کے ایک بجے کا وقت تھا کہ سلطان الاذکار کے اندر مشغول ہو گئے ہر سانس کی آمد و شد سے لفظ اللہ صاف صاف نکلنے لگا۔ شام کے وقت مجلس حضرت میں اہل شہر کا ایک کثیر مجمع ہو گیا۔ پاس انفاس اور سلطان الاذکار کی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ہر واقف و ناواقف پر بھی ظاہر ہو گئی۔ متولی عبدالرحمٰن تھانوی نے بصد نالہ و فغاں کہا افسوس! آج یہ آفتاب عالمتاب چھپا چاہتا ہے۔ بقول حکیم محمد عمر صاحبؒ اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک میدان وسیع میں صد ہا اولیا اللہ اور ہزاروں صوفیائے باصفا جہر کے ساتھ ذکر اللہ کر رہے ہیں اور ہر طرف سے اللہ اللہ کی صدا آ رہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات تک یہ کیفیت رہی اور جب نصف شب گذر گئی دفعۃً مغرب کی سمت سے ایک آندھی اٹھی اور بادل چھا گیا اسی وقت روح پرفتوح عالم بالا کی

جانب رخصت ہوگئی اناللہِ وانا الیہ راجعون ، جیسے ہی حضرت نے انتقال فرمایا پہلے تو سخت زلزلہ آیا پھر دیر تک بادلوں کا شور اور آندھی کا زور رہا۔آپ کی وفات کی وجہ سے جہاں زمین لرزاں تھی اور آسمان گریاں وہاں تمام حاضرین کے دل وجگر بریاں تھے۔بہت سے لوگوں نے رات ہی سے قرآن مجید اور کلمہ توحید بطور ایصال ثواب پڑھنا شروع کر دیا تھا۔صبح ہوتے ہوتے بہت سے ناظرہ خواں اور حافظ قرآن جمع ہو گئے اور سب تا تجہیز وتکفین قرآن کی تلاوت اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے۔ ۷؍ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دن دس بجے کے قریب عیدگاہ کے نزدیک نماز جنازہ پڑھی گئی شہر کے مسلمانوں کے علاوہ دور دور کے لوگ شریک جنازہ ہو گئے تھے حالانکہ اس وقت تک ریل اس علاقہ میں جاری نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود ایک بڑا مجمع پیدل اور سواری سے شرکت جنازہ کے لئے تھانہ بھون پہونچ گیا تھا۔اتفاقاً گورکنوں کی غلطی سے قبر کی تیاری میں دو گھنٹہ کی دیر ہوگئی اسی عرصے میں آپ کے خلیفہ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوریؒ بھی آگئے۔غرض دو پہر سے پہلے سہ پہر علم وعرفاں کا یہ آفتاب نیمروز زیرزمیں غروب ہوگیا۔

ایک خواب:

جس رات حضرت محدث فاروقی تھانویؒ کا انتقال ہوا ہے قاضی سید عنایت علی منگلوریؒ برادر معظم قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوری نے پٹیالے میں خواب دیکھا کہ ان کے بھائی سید افتخار علی بکمال افسوس یہ کہہ رہے ہیں کہ ’’آہ صد آہ حضرت عمر فاروقؒ نے انتقال کیا!‘‘

مادّہ ہائے تاریخ انتقال:

حکیم محمد عمرؒ نے اس مصرعے سے تاریخ وفات نکالی............کیا قطب ارشاد نے انتقال آہ!
۱۲۹۶ھ

حکیم صاحبؒ نے فارسی زبان میں یوں تاریخ نکالی۔ ؎

رنج والم شد چرا جان وجگر چوں فشرد ☆ عارف از ہستی بگو شیخ محمد نمرد
۱۲۹۶ھ

حکیم صاحب ہی نے یہ تاریخ کہی:

اے عمر فکر سن رحلت مغفور ہے گر ☆ کر شمار عدد شیخ محمد مرحوم

۱۲۹۶ھ

یہ تاریخ بھی حکیم صاحب ہی کی نتیجہ فکر ہے:

دیدۂ صوری سے دیکھو، معنوی بے خواہ عمر ☆ چھ عدد بارہ سونوے پر بڑھے تھے آہ کے

کسی نے اس فقرہ سے تاریخ نکالی: ہائے افسوس چراغ گل ہوگیا۔ کسی نے کہا: قطب ارشاد رفت۔
کسی نے ''هو غفره'' سے تاریخ نکالی۔ ۱۲۹۶ھ ۱۲۹۶ھ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا تعزیت نامہ:

میاں محمد صادق خادم مولاناؒ کے نام حضرت حاجی صاحب قدس سرہ' کا غم انگیز مکتوب مبارک بطور تعزیت صادر ہوا تھا اس کو بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت محبّ مخلص محمد صادق صاحب دام ذوقۂ وشوقۂ باللہ۔ بعد سلام مسنون ودعائے خیریت دارین واضح ہو کہ خط رنج غلط تمہارا آیا بدریافت حال انتقال حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ جو صدمہ فقیر کے دل پر ہے بیان نہیں ہوسکتا بجز صبر وشکیبائی کیا چارہ ہے۔ آہ ہزار آہ!

ساتھ کا اپنے ہر اک واصل ہوا ☆ مدعائے دل اسے حاصل ہوا
پہونچا ہر اک منزل مقصود پر ☆ رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر
جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر ☆ مثل سایہ رہ گیا میں خاک پر
حیف ہے صد حیف یاران طریق ☆ جا ہوئے دریائے مطلب میں غریق
گو ہر مطلب ہر اک نے لے لیا ☆ غوطہ زن میں بحر حرماں میں رہا

زیادہ ازیں طاقت قلم در پردۂ عدم۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو مراتب علیہ جنت فردوس نصیب کرے اور ان کے مستفیضوں سے ان کا فیض قیامت تک جاری رکھے، آمین۔ فقیر بھی پابہ رکاب ہے ارحم الراحمین خاتمہ بخیر کرے اور بخشے کہ اپنے بزرگوں سے ملے اور ہمیشہ خوش رہے، آمین۔ محبّ من اللہ

تعالیٰ تم کو اپنی محبت اور معرفت دے اور اپنے بزرگوں کے طریقے پر قائم رکھے۔ مناسب ہے کہ حضرت مرشد سے جو کچھ پہونچا ہے اسکو کرتے رہو یعنی ذکر و شغل میں عمر باقی گذارو اور ہر امر میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو انشاء اللہ تعالیٰ راحت و فراغت دارین حاصل ہوگی۔ فقیر کی طرف سے سب دوستوں اور عزیزوں کو نام بنام سلام فقط تحریر آخر ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ

سلسلہ طریقت:

آپ کے مرید کثیر تعداد میں تھے مگر جہاں تک مجھے علم ہے خلیفہ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسمٰعیل منگلوریؒ تھے جن کے لاکھوں مرید اور بہت سے خلفاء تھے ضلع بجنور میں آپ کے روحانی فیوض آج تک آشکارا ہیں آپ کی اصلاحی جدوجہد کے واقعات اس علاقہ میں زباں زد ہیں۔ خاص کر بستی کرتپور میں پٹھانوں کے یہاں نکاح ثانی کا رواج آپ کے ذریعے سے ہوا ۱۳۱۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی آپ کے جانشین آپ کے صاحبزادے حضرت قاضی سید عبدالغنی منگلوریؒ ہوئے ان کے بھی کثیر التعداد مرید تھے ہندوستان کے دو مایہ ناز اور عظیم شاعر حضرت اصغر گونڈویؒ اور حضرت جگر مرادآبادیؒ آپ ہی سے بیعت تھے۔ ان دونوں کے کلام میں تصوف کی جو کچھ چاشنی پائی جاتی ہے وہ آپ ہی کے فیض نظر اور فیض صحبت کا صدقہ ہے۔ آج کل آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ سید عبدالولی منگلوری مدظلہ، اس سلسلہ کے سجادہ نشین ہیں۔

حضرت مولاناؒ کی اولاد:

اس سلسلے میں علاوہ حالات محمدیہ کے حکیم عبدالواحد خاں صاحب کرتپوری اور مولانا سید حامد حسین صاحب امروہی خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے جو کچھ معلوم ہوا وہ درج ذیل ہے۔

حضرت محدث تھانویؒ کے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا محمد محمود صاحبؒ (۲) مولانا محمد عمر صاحبؒ (۳) میاں حافظ محمد صدیق صاحبؒ حسب بیان حکیم

عبدالواحد خاں صاحب، حضرت مولاناؒ کی صاحبزادی، مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم مالک مطبع مجتبائی دہلی کو منسوب ہوئی تھیں۔ مولانا محمد عمرؒ کی چار لڑکیاں تھیں کوئی لڑکا نہ تھا۔ حافظ محمد صدیق صاحب کی بھی غالبًا ایک لڑکی تھیں نرینہ اولاد نہ تھی البتہ مولانا محمد محمود صاحب کے چار صاحبزادے تھے جنکے نام یہ ہیں: (۱) میاں مسعود احمد (۲) میاں محمد احمد (۳) میاں محمد اعلیٰ (۴) حافظ محمد افضل۔ ان میں سے اول الذکر پاکستان میں ڈاکٹر ہیں ثانی الذکر بھی وہیں ہیں آخر الذکر دونوں صاحبزادوں کا انتقال ہوگیا۔ حکیم عبدالواحد خاں کے بیان کی رو سے مولانا محمد محمود کی ایک صاحبزادی حضرت قاضی سید عبدالغنی منگلوریؒ کو منسوب ہوئی تھیں جو قاضی سید عبدالولی مدظلہ کی والدہ تھیں حافظ محمد افضل مرحوم کے دو صاحبزادے تھے۔ میاں اسلم اور میاں اکمل، یہ دونوں حسب بیان حکیم عبدالواحد خان صاحب، مولوی عبدالاحد مالک مجتبائی کے نواسے تھے ان میں میاں اکمل کا انتقال ہوگیا۔ میاں اسلم مدظلہ پاکستان میں موجود ہیں۔

حضرت محدث تھانویؒ کا مکان اور کتب خانہ:

مولانا حامد حسین صاحب امروہی زید مجدہم نے میرے ایک استفسار کے جواب میں جو ارقام فرمایا ہے اس کو اس عنوان کے ماتحت درج کرتا ہوں۔

مولانا محدث کا بڑا کتب خانہ تھا یہ سب کتابیں میاں اسلم کے پاس تھیں میں نے میاں اسلم صاحب سے ذکر کیا تھا کہ مجھے مولاناؒ کا کتب خانہ دکھلا دیجئے انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا مگر افسوس دو تین روز کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور وعدہ کا ایفاء نہ ہوا۔ ان کے جاتے ہی شرنارتھی قابض ہو گئے اور انھوں نے سارا کتب خانہ ردّی میں داخل کر کے معمولی قیمت پر دوسری جگہ لے جا کر فروخت کر دیا۔ جامعہ اشرفیہ کے مدرس........اس کے ملحقہ مکان میں رہتے ہیں بقیہ کتابیں انھوں نے لے لیں۔ اس وقت محدث تھانویؒ کی کسی کتاب کا یہاں ملنا دشوار ہے۔ محدث تھانویؒ کا نسائی شریف پر حاشیہ میں نے دیکھا ہے اور بعض کتابیں فارسی میں میں نے دیکھی ہیں الخ

قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شاعری

امسال وسط شوال میں پھلاودہ ضلع میرٹھ جانا ہوا۔ مدت سے اشتیاق تھا کہ اُس قصبہ کی زیارت کروں جس میں مولانا شاہ سید عبدالغنی پھلاودیؒ جیسا درویش صفت عالم پیدا ہوا تھا۔ اتفاق سے ۱۲ ر نومبر ۱۹۵۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ یو. پی. کے اجلاس میرٹھ میں مولوی سید عبدالمغنی صاحب نبیرۂ حضرت موصوف سے ملاقات ہوئی انھوں نے مجھے اس کتب خانہ کا گرویدہ بنادیا جو مولانا پھلاودیؒ کا جمع کیا ہوا ہے۔ اور جس کو باوجود مختصر ہونے کے علوم قاسمیہ کا مخزن کہنا چاہئے۔ مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ اب سے اٹھارہ سال پیشتر اس دنیا میں موجود تھے۔ احقر نے ان کی زندگی میں ایک عریضہ مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کے حالات وسوانح کے سلسلے میں پھلاودہ روانہ کیا تھا۔ مولانا اس وقت سخت علیل اور صاحب فراش تھے جواب دوسرے کے قلم کا لکھا ہوا آیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پھلاودہ میں حضرت نانوتویؒ، اور حضرت امروہی کے خطوط وتصانیف کا اس قدر غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہوگا جو کسی دوسری جگہ غالباً نہیں ہے۔ خیر اس عنوان پر مستقل طور پر پھر لکھوں گا کہ میں نے کتب خانہ پھلاودہ میں کیا کیا دیکھا اس وقت مجھے حضرت مولانا نانوتویؒ کے غیر مطبوعہ کلام کو پیش کرنا ہے جو اس کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے سب سے پہلے میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا تعارف کرادوں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ اس گمنام قطب الوقت نے پھلاودہ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر کس طرح سے مولانا نانوتویؒ کی ایک ایک ادا کو اپنے آئینہ بیاض میں اتار لیا تھا۔ اور ان کو اپنے باکمال استاذ کے ساتھ کتنا ربط اور تعلق خاطر تھا۔

مولانا شاہ عبدالغنی پھلاودیؒ:

پھلاودہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے اور نسلاً سادات کرام سے تھے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت مولانا امروہیؒ سے تلمذ حاصل تھا۔ سند فراغ حضرت مولانا امروہیؒ سے حاصل کی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے۔ مدرسہ شاہی مرآداباد میں مدرس تھے حضرت محدث امروہیؒ جب مدرسہ

شاہی سے ۱۳۰۳ھ میں امروہہ[۱] آئے تو یہ بھی ان کے دیگر رفقاء کے ساتھ امروہہ آ گئے تھے یہاں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد میں کئی سال مدرس رہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے امروہہ کے مدرسہ سے جسمانی تعلق منقطع کر لیا مگر پھلاودہ میں بیٹھے ہوئے امروہہ کو اور امروہہ کے محدث کو نہیں بھولتے برابر خط و کتابت جاری رہتی ہے۔ محدث امروہیؒ کے کثیر التعداد خطوط دیگر اکابر کے مکاتیب کے ساتھ اس احتیاط اور حفاظت سے رکھے ہیں کہ آج بھی چالیس پچاس سال کا عرصہ گزرنے پر نئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں مدرسہ اسلامیہ امروہہ کی تدریجی ترقی کا حال تحریک قادیانیت کہ خلاف اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ مناظرہ رامپور (جو اہل سنت اور قادیانیوں کے درمیان ہوا تھا) کی مختصر روداد ہر ضروری بات کا ذکر اور نئے واقعہ کی اطلاع موجود ہے ۱۳۱۷ھ میں حاجی امداد اللہ قدس سرہ' کے وصال کی خبر امروہہ سے پھلاودہ روانہ کی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ تاکید ہے کہ اس واقعہ جاں کاہ کو سن کر دامن صبر ہاتھ سے نہ چھوڑ دینا۔ مولانا پھلاودیؒ کا اپنے استاذ حضرت امروہیؒ سے عشق و محبت کا یہ عالم ہے کہ بار بار اپنے وطن میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ دعوت اس وقت اَور قوی ہو جاتی ہے جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا امروہیؒ میرٹھ یا دیوبند تشریف لا رہے ہیں ایک مرتبہ حضرت مولانا میرٹھ سے بالا ہی بالا دیوبند تشریف لے گئے جب حضرت پھلاودی کو معلوم ہوا تو یہ شعر لکھ کر امروہہ روانہ کیا۔

تو بہ دیوبند رسیدۂ دل ما بہ رخت کشیدۂ ☆ بہ نگاہ لطف ندیدۂ مگر ایں چہ شیوۂ دلبریست

مولانا پھلاودیؒ کو حضرت قاسم العلومؒ سے بھی نسبت خاص حاصل تھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مولانا نانوتویؒ سے کس مقام پر اور کب تک تعلیم حاصل کی غالباً ۱۲۹۷ھ تک یہ پھلاودہ کا درویش مولانا نانوتویؒ کے دامن سے وابستہ رہتا ہے۔ بعدہ' مولانا امروہیؒ کے پاس مرادآباد آ کر تکمیل کرتا ہے۔ پھلاودہ میں مولانا نانوتویؒ کے بھی بہت سے خطوط نہایت حفاظت و صیانت کے ساتھ ایک جزدان میں رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کو اپنے اس صوفی منش شاگرد کا بڑا خیال ہے اچھے اچھے القاب سے یاد فرماتے

[۱] ذی قعدہ ۱۳۰۳ھ سے جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں درس دینا شروع کر دیا۔ اسی سال سے جامعہ میں دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہوا جو بحمد اللہ اب تک جاری ہے۔ (محب الحق)

ہیں۔ پھلاودی شاگرد کو اپنے شیخ کے قلم سے نکلے ہوئے تکریمی القاب سے کچھ ندامت محسوس ہوتی ہے۔ اور اس ندامت کا ذکر کر کے حذف القاب کی درخواست کرتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ القاب میں اختصار کرنے پر تیار ہیں لیکن ان کو بالکل ترک کرنے پر راضی نہیں ہیں۔

بہت سے خطوط ایسے بھی مولانا پھلاودیؒ نے جمع کر لئے ہیں جو حضرت نانوتویؒ نے اپنے مایہ ناز شاگرد مولانا امروہیؒ کو روانہ کیے ہیں۔ اور ان میں خاص خاص علمی مضامین مکتوب الیہ کی استعداد کے پیش نظر بیان فرمائے ہیں۔ مولانا پھلاودیؒ کے ابن الابن مولوی سید عبدالمغنی صاحب نے مجھے بتلایا کہ مولانا عبدالغنیؒ صاحب پھلاودی سفر میں بھی مولانا نانوتویؒ کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی تقاریر کو ضبط کیا ہے۔

شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علوم و معارف کو محفوظ رکھنے اور ان کو رائج کرنے کی کوشش کی اسی طرح مولانا پھلاودیؒ نے حضرت نانوتویؒ اور ان کے تلمیذ رشید حضرت امروہیؒ کی علمی دستاویزوں کو دست و برد زمانہ سے محفوظ رکھا اور برابر قاسم العلومؒ کے معارف و علوم کو سیکھنے اور سکھانے کی تلقین فرماتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے کتب خانہ میں حضرت نانوتویؒ کے کیا کیا نایاب اور کمیاب علمی آثار ہیں اس کو پھر لکھونگا اس وقت تو مجھے صرف تعارف کرانا تھا۔

مولانا پھلاودی بلند پایہ درویش بڑے جید عالم بہترین ادیب اردو فارسی عربی کے باکمال شاعر تھے۔ حافظ کلام اللہ ہونے کی رعایت سے حافظ تخلص تھا۔ تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ خط نہایت پاکیزہ اور اپنے دونوں استادوں سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۳۵۲ھ میں انتقال فرمایا، انتقال سے قبل ایک وصیت نامہ لکھا جو شائع ہو چکا ہے۔

مولانا نانوتویؒ کا ذوق شعر:

دنیائے علم واقف ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ مفسر، محدث، متکلم، صوفی اور زبردست مناظر تھے۔ ان کی تقریر و تحریر کے بہت سے نمونے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ان کی محققانہ کاوشیں رہتی دنیا تک ان کا نام قائم رکھیں گی۔ ان کے تلامذہ اقصائے عالم میں آفتاب و مہتاب بن

کر چکے، اسلام کی حمایت میں ان کے مناظرے ملت بیضا کی تقویت کا باعث ہوئے۔ ان کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حکمت و معرفت دارالعلوم دیوبند کے بام و در پر جلوہ گر ہوئی، اور آج بھی جلوہ گر ہے۔ یہ تمام خصوصیات اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن مولانا کا ایک باکمال اور قادر الکلام شاعر ہونا قریب نظروں سے اوجھل ہے۔ گو شعر و شاعری ان امتیازات کے ہوتے ہوئے مولانا کے لیے کچھ زیادہ موجب عزت نہ ہو لیکن پھر بھی ایک فن ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس فن میں اپنی جولانئ طبع کی کرشمہ سازیاں دکھلائی ہیں۔ مولانا کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ قصائد قاسمی کے نام سے چھپ چکا ہے جس میں ایک نعتیہ قصیدہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی ذوق شعر کا پتہ چلانے کے لیے یہ مجموعہ کافی نہیں ہے۔

ایک طرف حضرت نانوتویؒ نے اردو نثر کو علمی و فنی اصطلاحات کے خزانے عطا فرمائے اس کو معارف لدنیہ کا حامل بنایا۔ ''قبلہ نما'' بطور تحفہ پیش کیا۔ ''آب حیات'' کے جرعہ ہائے حیات بخش پلائے اس زبان مین اونچے اور مشکل مضامین کے علاوہ اپنی سادہ کلامی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ دوسری طرف اردو نظم کے دامن کو اعلیٰ تخیل اور بلند جذبات سے زینت بخشی اگر مولانا نانوتویؒ کا پورا مجموعہ کلام دستیاب ہو جاتا تو میں اپنے اس دعوی میں کامیاب ہو جاتا کہ وہ اپنے زمانے کے دہلی کے بڑے بڑے شعراء سے قادر الکلامی میں کسی طرح کم نہیں[1] ہیں آخر وہ مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ جیسے ادیب وقت کے شاگرد رشید تھے جنھوں نے دیگر علوم کے علاوہ علم ادب بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک ذہین شاگرد مولانا رشید الدین دہلویؒ سے حاصل کیا تھا۔ مولانا مملوک علیؒ دہلی کے بعض ان مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں جو بادشاہ دہلی کی سرپرستی میں دہلی میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ''اطیب النغم'' اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے عربی اشعار سے ان

---

[1] حضرت مولانا نانوتویؒ کی اُردو شاعری کے متعلق بھی چند دن ہوئے احقر حضرت مولانا محمد طیب مدظلہ سے گفتگو کر رہا تھا مولانا نے فرمایا کہ میں نے متعدد بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے ایک دفعہ فرمایا کہ بعض وقت شاعرانہ مضامین اور کیفیت کی اس قدر آمد ہوتی ہے کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ پورا وعظ برجستہ نظم میں کہہ دوں مگر چونکہ یہ خلاف سنت ہے اس لئے اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ (فریدیؒ) قاری محمد طیب صاحب کی وفات ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ ۱۷ رجولائی ۱۹۸۳ء کو ہوئی۔ (محب الحق)

کے ذوق ادب کی فراوانی کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے مولانا فضل حقؒ خیر آبادی کے عربی اشعار پر اصلاح دی ہے اسی کا اثر ہے کہ "ثورۃ الہندیہ" کی نظم ونثر عربی انتہائی موثر ہے، اور اہل فہم کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ ہونے اور خداداد صلاحیت کے باعث حضرت مولانا نانوتویؒ کا کلام عربی بھی نہایت پر تاثیر اور پر کیف ہے۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ بعد تک فارسی، علمی حلقوں میں کافی رائج تھی شعر وسخن میں اس زبان کے جوہر دکھائے جاتے تھے اسی لئے مولانا نے نثر کے علاوہ نظم کو بھی قند پارس سے لذت یاب فرمایا ہے۔ رہی اردو وہ ان کے زمانے میں ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ ملک کی عام فہم زبان تھی۔ دہلی جو اردو زبان کا عظیم الشان مرکز ہے۔ مولانا تعلیم کے زمانے میں وہاں برسوں رہے ہیں پھر وہ کس طرح اس زبان کو اپنی شیریں کلامی سے فیض یابی کا موقع نہ دیتے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ کے ایک اور شاگرد (جو بعد کو حضرت امروہیؒ کے یہاں مدرسہ شاہی مرآداباد میں فارغ التحصیل ہوئے) حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صدیقی مفسر امروہیؒ سے بھی حضرت قاسم العلومؒ کے ذوق شعر وادب کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ حضرت حافظ صاحبؒ جو کہ اکابر دیوبند خصوصاً مولانا نانوتویؒ کے آخری چند سال کی ایک جیتی جاگتی تاریخ تھے، فرماتے تھے کہ مولانا نانوتویؒ نے "دیوان اللہ دئے" کی فرمائش پر ایک مثنوی لکھی تھی جو پانچ سو اشعار پر مشتمل تھی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے۔

ضعف سے ہو گیا دم رفتار ☆ تن کو سائے کا تھا منا دشوار

اس کے قریب ہی زمانے میں مولانا گنگوہیؒ نے "ہدیۃ الشیعہ" تصنیف فرمائی اس کو ملاحظہ کر کے فرمایا کہ مولانا گنگوہیؒ دین کا یہ کام کر رہے ہیں اور میں نے "مثنوی" لکھی ہے۔ فوراً وہ مثنوی منگوائی اور جلا دی۔

ایک مرتبہ حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں حضرت مولانا نانوتویؒ کے ساتھ مظفر نگر گیا تھا جیل خانہ کے قریب ایک مکان میں مولانا فروکش تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں دوپہر کو سو رہا تھا آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا کے کاغذات رکھے ہیں اور خود کسی ضرورت سے کہیں گئے ہیں، میں نے کاغذات کو دیکھا

تو دو غزلیں تھیں جو مختلف ردیف اور قافیے کی تھیں۔

ایک مرتبہ حافظ صاحبؒ نے مولانا نانوتویؒ کے چند اشعار سنائے جو ان پیش کردہ غزلوں میں موجود ہیں علاوہ ازیں مولانا کی ایک غزل کا (جو ذوقؔ کی غزل پر لکھی تھی) ایک شعر سنایا۔ ذوقؔ کی غزل کا مطلع یہ ہے۔

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر ☆ پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

(ذوق دہلویؒ)

اس زمین میں حضرت مولانا نانوتویؒ کا صرف ایک شعر جو حضرت حافظ صاحبؒ کو یاد رہ گیا تھا یہ ہے۔

میں کیا کروں کہ پر ترے ناوک کا جل گیا ☆ رکھنا تھا اس کو داغ سے دور اور شکستہ پر

(مولانا نانوتویؒ)

اب میں حضرت والا کا غیر مطبوعہ کلام پیش کرتا ہوں، اس کی دو نقلیں کتب خانہ پھلاودہ میں ہیں تیسری نقل میرے پاس ہے۔ مجھے مولوی سید عبدالمغنی سلمہ سے معلوم ہوا کہ مولانا کے کلام کی ایک ضخیم بیاض ان کے پاس اور تھی جس کو انھوں نے ایک صاحب کو عاریۃً دیدیا ہے۔ اگر وہ بیاض بھی میرے سامنے ہوتی تو میں اس سے زیادہ کلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔

اس موجودہ مختصر مجموعہ میں چھ غزلیں اردو کی، دو فارسی کی اور پانچ عربی کی نظمیں ہیں۔ اس میں سے اردو کی سب غزلیں چند اشعار کے حذف کے بعد فارسی کی دونوں غزلیں، اور عربی کلام کا اقتباس پیش کروں گا۔

عربی کے اشعار کافی تعداد میں موجود ہونے کے باوجود کم پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ناقلین و کاتبین سے کتابت میں بہت سی اغلاط واقع ہوگئی ہیں۔ وہ اغلاط کافی غور وخوض کے بعد رفع ہوسکتی ہیں۔ پھر عربی اشعار کا سلیس اردو ترجمہ بھی متوسط طبقہ کے لیے ضروری تھا۔ بنا بریں تمام حاصل کردہ کلام عربی پیش نہیں کیا گیا۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ مولانا حافظ سید عبدالغنی صاحبؒ پھلاودی کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں کہ ان کی کوشش کے نتیجے میں مولانا نانوتویؒ کے بہت سے علمی آثار محفوظ رہے یہ اشعار بھی انھیں کی بدولت ہمارے ہاتھ لگے جو تبرک کے طور پر ہدیہ ناظرین کیے جارہے ہیں۔

کلام اردو

(۱)

جما کر تیری صورت رو برو ہم	کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم
کیا کرتے ہیں کہنا نامہ برباد	رخ گلفام و زلف مشک بو ہم
اگر یوں ہی کٹی یہ زندگانی	تو لے جائیں گے کیا کیا آرزو ہم
نگاہ لطف کے ہیں زخم دل میں	کریں اے چارہ گر کیوں کر رفو ہم
پڑا رہنے دے اے شوق دل آرام	ابھی بیٹھے ہیں پھر کر چار سو ہم
بس اتنا تنگ مت کر وحشت دل	لیے بیٹھے ہیں اپنی آبرو ہم
لب شیریں سے خود کامی تو معلوم	پیئں گے ہمدم اب اپنا لہو ہم
نہ جاناں ہے نہ جاں ہے اور نہ دل ہے	کریں کس کس کی یارب جستجو ہم
نہیں ساقی تو ہمدم پھوڑ دینگے	کسی پتھر پہ ساغر اور سبو ہم
پئے تشہیر مشت خاک قاسم	اڑائیں گے کہیں بھی کو بکو ہم

(۲)

اگر مشق ستم کو واں نشانہ چاہیے کوئی	تو مر جانے کو ہم کو بھی بہانہ چاہئے کوئی
کسی کا حال کچھ ہو اور کسی پر کچھ گزر جائے	مگر زلفوں کے سلجھانے کو شانہ چاہئے کوئی
ہمارا غم غلط ہو یا نہ ہو ہمدم سے پر تم کو	تغافل کے لئے ہم سے بہانہ چاہئے کوئی
یہ مانا قاسم آزاد وحشی ہے مگر سنیئے	وحوش دشت وصحرا کو بھی خانہ چاہئے کوئی

(۳)

یوں حسن میں ہیں اور بھی کم اور زیادہ | پر آپ میں ہے طرز ستم اور زیادہ
جوں سایہ نمود اپنی تمہیں سے ہے وگر نہ | کچھ ہم میں نہیں غیر عدم اور زیادہ
وہ پیار کی باتوں میں خفا ہو گیا یارب | تھی ہم کو تو امید کرم اور زیاہ
ہے عمر رواں راہ عدم جتنے بڑھے ہم | اتنے ہی بڑھے سوئے عدم اور زیادہ
اے چارہ گر عشق نہ کر وصل کی تدبیر | کھودیں گے مجھے لطف صنم اور زیادہ
کچھ ناز کا دعوٰی ہے اگر اپنا سمجھ کر | تو ہاں تمہیں اپنی ہی قسم اور زیادہ
کیا کرکے رہے دیکھئے قاسم یہ محبت | زندہ رہے ہم گر کوئی دم اور زیادہ

(۴)

عاشقوں سے وہ صنم کیا شاد ہو | گر کسی کو شکوۂ بیداد ہو
قتل عاشق ایک پرانی بات ہے | ہاں ستم گر کچھ نئی ایجاد ہو
آرزوئیں ہو گئیں سینے میں خاک | دل لگا کر خاک کوئی شاد ہو
اپنی مشت خاک اور یہ آرزو | کوچۂ دلدار میں برباد ہو
بھول کر دیکھیں کہو تو ہم اگر | بھول جانا انتقام یاد ہو
بے نیازی کا مزہ جانے وہی | جس کے سینے میں دل ناشاد ہو
قاسم دیوانہ میں دیکھی یہ بات | کشتۂ غم ہو کے غم میں شاد ہو

(۵)

مروں ہوں مری ناتوانی تو دیکھو | سر مرگ ہے شادمانی تو دیکھو
پڑے نقش پا کی طرح پر جہاں ہم | وہیں مر مٹے ناتوانی تو دیکھو
ستم گر کی زلف و نگہ سے ہمیشہ | نبٹتے ہیں ہم سخت جانی تو دیکھو

نہ آنکھوں سے نکلی نہ دل ہی میں ٹھہری | خدنگ نگہ کی روانی تو دیکھو
نہ ہو دل کو تسکیں نہ کچھ آس ٹوٹے | ذرا آپ کی خوش بیانی تو دیکھو
ادھر سے اُدھر سایہ وش ضعف میں بھی | طلب میں پھرا جاں فشانی تو دیکھو
مری تلخ کامی میں لذت سی لذت | ستم گر کا لطف نہانی تو دیکھو
اجل کی تمنا تھی مر کر بھی، وہ ہی | رہا غم، غم جاودانی تو دیکھو
تمہاری تو شیرینئ لب نہ دیکھی | یہ قاسم کی شیریں بیانی تو دیکھو

(۲)

رقیب مہر کے قابل عدو وفا کے لئے | بنے تھے ہم ہی فقط آپ کی جفا کے لئے
کھڑے کھڑے گہ و بیگاہ کا ترا آنا | بلائے تازہ ہے اک جان مبتلا کے لئے
تفقد اس کا تمہیں اپنے آپ لازم ہے | زبان ہل نہ سکے جس کی التجا کے لئے
ہمیں تو صبر کو کہتے ہیں شیخ و واعظ سب | انھیں تو کوئی بھی کہتا نہیں وفا کے لئے
وہ بات کیا ہے کہ مر کر بھی قاتل بے رحم | قتیل تیرے تڑپتے رہے جفا کے لئے
جفا بجائے وفا اور ستم بجائے کرم | ہوا کہیں بھی کسی کے یہ آشنا کے لئے
جفائیں کیجیے پر تم کو زیب دیتا ہے | جفا بھی ہووے تو قاسم سے باوفا کے لئے

کلام فارسی

(۱)

ساقیا سیرم زمے خاک درمے خانہ ام | از لب شیریں بدہ لذت بیک پیمانہ ام
جان یا جاناں بگو خوانم ترا یا جان جاں | اصطلاح شوق بسیاراست و من دیوانہ ام
آتش عشق تو افتاد است درجان و تنم | سوختی یکسر فدایت جان من کاشانہ ام
از من خستہ چہ می پرسی کہ قاسم کیستی | گر گلی من بلبلم در شمع من پروانہ ام

(۲)

از جنوں دست در گریبا نست | خار صحرا بشوق دامانست
گردش بخت و دورۂ گردوں | فتنۂ کاکلِ پریشانست
سینۂ چاک چاک و خندۂ بناز | دل بیتاب و نوکِ مژ گا نست
دل بیتاب من مبارک باد | کہ بکار تو چشم فتانست
جاں بلب آمد و اجل بر سر | واں مسیحا بکار د گرانست
نیم جاں کرد و رفت بازندید | باز زان شوخ چشم در مانست
ہم نفس! در عدم چہ دولت بود | کشتۂ ناز باز شا دا نست
گر رمیدی زختہ ات چہ عجب | بوئے گُل ہم ز گل گریزا نست
شکوۂ رفتنش چرا اے دل | رفتن از تن چو کار ہر جانست
مرض عشق و یار دور و دراز | نہ مسیحا نہ آب حیوانست
کشتۂ نازرا شکایت نیست | آں پریوش چرا پشیمانست
قاسم از کوچہ اش چہ کار ترا | مسکن وحشیاں بیا بانست

کلام عربی

(۱)

من لم یسخر بالبکاء حبیبہ، | لالتفات فقد اضاع نحیبہ،
یا نفس مالک تجز عین تجملی | ذاکان منہ نصینا و نصیبہ،
دع عنک و یلک ذکرہ، و حدیثہ، | واترک رجاک بعیدہ و قریبہ،
فرجاک مقطوع و شوقک ضائع | والصبران صابرت لیس مصیبہ،
ان جاء جاء مجھزاً الذھابہ، | کالبدر یطلع یستمیل مغیبہ،
بابی و امّی لا تزورلنا فھل | ابقیت شیئاً تشتھی تخریبہ،
فالموت من شوق الوصال اخف من | عیش بالآم الفراق عقیبہ،

(۲)

اغرت علی عیشی فلو عدت عادیا	ذهبت بما غادرته منه بادیا
ذهبت بعقلی و اصطباری و راحتی	و قلبی فلو آثرتنی بفوا دیا
تقول تذکرنی اذا صرت فارغاً	عن الغیر تکنی بانتهاء و دادیا
فهل انسین الیوم من کان وجهه	بعینیّ احلٰی قبل ذامن رقادیا
اَ اَشغل بالاحباب منک وانت فی	فوادی سو یدائی و عینی سوادیا
نعم قد شغلتم بالا حبته دوننا	ومن قد غدافی ودّ کم لی معادیا
اذا شئتُ ان انساک لا استطیعه‘	واُنسی کثیر امبد یا و معادیا

(۳)

یا من بقلبی له ذکر فانسانی	روحی و شوقی الیه منذ از مانی
رمانی الدهر من داری و اقصانی	واللّٰه قربنی منکم وادنانی
دنوت منکم ولکن ما دنوت متٰی	مالم تحل بعینی بین اجفانی
حللت منها فمالی لا اراک بها	لم تات ام برق نو رمنک اعمانی

(۴)

جاء الکتاب وما الکتاب صحیفةٌ	عربیةٌ من فاضلٍ متبحرٌ
متکلم متفطن و محدث	متفقه و مفسر متد بر
حاوی العلوم اصولها و فروعها	معقولها منقولها ومناظر

(۵)

یجلوبصائر ناظریه جمیعهم	و یزید نوراً فوقهٗ فی ناظری
سکن الفواد و کان قبل حلوله	یرجو میا منکم و یخشی طائری

تبرکات

حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے غیر مطبوعہ خطوط

حضرت نانوتویؒ کا مکتوب بنام منشی محمد ممتاز علیؒ میرٹھی مرحوم:

سراپا عنایات و کرم منشی محمد ممتاز علی صاحب، سلمکم اللہ، محمد قاسم کا سلام قبول فرمائیے۔ اور پھر سنیے۔ کہ آپ کا نامہ مورخہ ۴؍ رجمادی الثانی دیو بند ہو کر نانوتہ آیا نہ تھا کہ میں بتقاضائے چند در چند انبیٹہ چلا گیا۔ کل سولہویں دن وطن آیا تو آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آج تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ تین جوابات استفسارات ڈاک میں بھیجتا ہوں اور ایک ورق اور جس پر ہندسہ مرقوم نہیں اور شروع میں موٹے قلم سے لفظ تنبیہ لکھا ہوا ہے ساتھ ملفوف ہے۔ اس ورق کو علیحدہ نکال کر منشی عبد الرزاق صاحب کے سپرد کر دینا شاید کسی وقت کام آئے اور کسی نیم ملا کے اعتراض کا جواب ہو جائے۔ اور باقی اجزاء جوابات کو مولانا محمد علی صاحب کے حوالے کر دینا' اور یہ عرض کر دینا کہ بعد مطالعہ ان اوراق پر بشرط پسند مہر کر کے واپس فرمائیے میرے پاس اس کا مثنی نہیں۔ اگر مثنی ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی۔ اور اگر پسند نہ آئے تب بھی اس اصل کا لوٹا دینا ضرور ہے۔ اگر کسی صاحب کو خیال جواب الجواب ہو تو نقل کر لینے کا اختیار ہے۔ میں نے دو روز میں تمہید اور چھتیس جواب لکھے ہیں اور صاحب چار روز میں نقل کر لیں حد نہایت ہفتہ میں نقل کر کے واپس فرمائیں مگر مولانا کی انصاف پرستی سے مجھ کو امید تسلیم ہے اندیشہ تعصب نہیں اگر اس پر بھی مولانا محمد علی صاحب کا وہی اصرار رہا تو یوں کہو قیامت آگئی۔ جب ایسے بھولے بھالے بے شر عالم بھی شاگردوں کے

---

[1] منشی محمد ممتاز علی صاحب میرٹھی مرحوم بڑے جید کاتب اور مطبع مجتبائی میرٹھ کے مالک تھے۔ میرٹھ سے یہ اپنے مطبع کو دہلی لے گئے۔ میرٹھ اور دہلی دونوں جگہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان کے مطبع میں تصحیح کا کام کیا ہے۔ منشی صاحب آخر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ بعد کو مطبع مجتبائی مولوی عبد الاحد مرحوم کے پاس آ گیا تھا۔ غالب کے خطوط بھی منشی صاحب کے نام ہیں۔ "عود ہندی" (غالب) کو سب سے پہلے منشی صاحب ہی نے غالب کی زندگی میں مجتبائی میرٹھ سے شائع کیا ہے۔ (فریدی)

کہنے سننے سے ایسی چال چلنے لگے۔ تو ہم کو کون روکنے والا ہے؟ منشی صاحب! اگر نفسانیت عند اللہ مذموم نہ ہوتی اور بحث مباحثہ کا انجام خراب نظر نہ آتا اور نزاع اہل اسلام خدا اور رسول علیہ السلام کو ناگوار نہ ہوتا تو آپ بھی ایک تماشہ دیکھ لیتے ان شاء اللہ مخالفان احقر کی حقیقت معلوم ہو جاتی سب کے نشے ان شاء اللہ ڈھیلے ہو جاتے مدعیان روزگار اپنے کیے کو پہنچ جاتے پر کیا کروں ''الدنیا سجن المومن'' اس گرفتار ہوا و ہوس کے ذمے خدا کی طرف سے بھی دربارۂ مناظرہ سیکڑوں قید و قیود لگی ہوئی ہیں وہاں کی باز پرس کا کھٹکا ایسے کام کرنے نہیں دیتا، ورنہ اس نفس کافر کیش کو کیا کیا کچھ لہریں نہیں آتیں مگر۔۔۔۔۔ لاچار ہو کر اس شعر کو پڑھ کر اپنے آپ کو سمجھا لیتا ہوں۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ☆ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اور اسی لئے تحریر جواب سے گھبراتا رہا۔ اور لکھ لیا تو ارسال میں اتنا توقف کیا اور سو طرح کے حیلے و حجت نکالتا رہا، مگر جب دیکھا سب اہل مشورہ اسی طرف ہیں ادھر آپ کا عنایت نامہ بھی بطلب جوابات معلومہ پہونچا، ناچار ہو کر روانہ کرتا ہوں پر ''شور مکروہ'' سے ڈرتا ہوں اس لئے پھر بھی یہی آرزو ہے کہ جانے دیجئے مخالفوں کے راہ پر آنے کی امید نہیں جو موافق ہیں ان سے اندیشہ برگشتگی نہیں۔ اور اگر کوئی برگشتہ بخت پھر بھی گیا تو معتقدوں کا بندہ شائق نہیں۔۔۔۔۔۔ تسپر جواب اعتراض' جواب ہوتا ہے آداب نیاز نہیں ہوتا۔ ناظران اوراق کو میری ''تیز قلمیاں'' جو باوجود عزم ادب بمقابلہ تعریضات مخالفان بے اختیارانہ سرزد ہو گئی ہیں ناگوار ہوں گی اور اس وجہ سے کیا کیا کچھ برا بھلا نہ کہیں گے۔ مگر خدا تعالےٰ خوب جانتا ہے کہ میں کس کو کہتا ہوں اور مولوی محمد علی صاحب کو کیسا سمجھتا ہوں۔ میں اوّل ہی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ استفسارات مولوی محمد علی صاحب کی طرف سے معلوم نہیں ہوتے کسی طالب علم کا ہذیان ہے، مولوی محمد علی صاحب کے نام لگا دیئے ہیں، اور مولوی محمد علی صاحب نے بوجہ تسلیم طبع زاد اس کے نشیب و فراز پر غور و لحاظ نہیں فرمایا۔ بلکہ اوروں کے اعتماد پر آپ ''بررو'' ہو بیٹھے ہیں ورنہ ان کی وہ سلامت روی اور کم گوئی اور ان کی وہ یکسوئی اور ''معصوم وشی'' جو سراسر ایسی باتوں کی مخالف ہے ان سے

ایسی حرکت اور وہ بھی میرے مقابلے میں ہرگز کرنے نہ دیتی۔ اس لئے ان جوابوں کے پیش کرنے میں اوّل تو ان سے شرماتا ہوں اور ''آخر کار'' سے خائف ہوں مبادا ''ملازمان شب و روز'' اس قصے کو دور پہونچائیں اور مولانا کو آمادۂ جواب کریں اور ادھر بھی نفس بد کیش ''اپنیوں'' پر آجائے اور وہ محبت اور ملاقات سب خاک میں رل جائے۔ اور میں سنتا ہوں کہ کہیں کہیں اور بھی ''استفسارات مولانا'' کا فکر ہے سو کہیں اور سے اگر کوئی جواب آگیا ہو یا آج کل میں آجائے تو پھر کاہے کو ان جوابوں کو پیش کیجئے ''بلکہ بنظر مصلحتہائے دیگر'' پھر تو پیش نہ کرنا ہی مناسب ہے اگر پیش ہی کرنا ہوگا تو جب پیش کریں گے جبکہ ''مخالفان احقر'' اوروں کے جواب سے فارغ ہولیں گے تس پر بھی اگر آپ کی یہی رائے ہو کہ ''جوابات مرسلہ'' پیش ہی کرنے چاہئیں تو بعد استخارہ اختیار ہے۔ خاص آپ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی محمد علی صاحب کے یہاں سے اس تحریر کا واپس آنا معلوم جس طرح ہو سکے اس کی نقل کرا کر ان کی خدمت میں بھیجئے گا۔

منشی عبدالرزاق صاحب بیگ کی خدمت میں بعد سلام ضرور یہ کہہ دینا کہ آپ بھی مضمون واحد تصور فرمائیں۔

مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلام و نیاز میری طرف سے یہ عرض کر دینا کہ اب آپ کو انصاف فرمانا ضرور ہے۔ میں نہیں کہتا کہ آپ میری رورعایت کریں اور کہوں ہی تو کیا ہوتا ہے اگر میری رعایت ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی پر حق کی طرف داری کے لئے خدا کی طرف سے جس قدر تاکیدیں ہیں سب آپ کو معلوم ہیں اور اس باب میں جس قدر وعد و وعید ہیں آپ خوب جانتے ہیں خدا کو یاد کر کے ''محاکمہ'' فرمایئے گا زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط۔

حضرت شیخ الہندؒ کا پہلا خط حافظ زاہد حسن[1] صاحب کے نام:

[1] حافظ زاہد حسن صاحب امروہی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت اور اجازت یافتہ ہیں۔ ۹۰ رسال سے زائد عمر ہے۔ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کے نائب مہتمم تھے۔ چند سال سے فالج میں مبتلا ہیں اور صاحب فراش ہیں۔ (فریدی) (۱۳۷۴ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔ محب الحق)

ھوالرحمٰن الرحیم سراپا فضل وکرم دام لطفکم السلام علیکم ورحمت اللہ۔

عنایت نامہ سرمایہ شادمانی ہوا۔ جناب کی یاد آوری کا مشکور ہوں اور اس پر متاسف ہوں کہ اس سے پہلے جو آپ نے خطوط بھیجے قسمت کی نارسائی سے ایک بھی نہیں ملا۔ یہ بات تو ضرور ہے کہ یہ دور افتادہ کسی مخلص کو ابتداء خط لکھنے سے عمداً بھی رکتا ہے مگر جس قدر ابتدا کرنے سے قاصر ہوں اس سے زائد جواب دینے میں چست ہوں۔ خطوط کا حال ایسا ہی ہے جو مل گیا مل گیا، نہ ملا نہ ملا۔ چٹنی چائے بھی اس وقت تک نہیں پہنچے۔

اُن مخلصان مرآداباد اور مکرمان امروہہ شریف کی خدمات میں سلام عرض کر دیجیے جن کو یہ ناکارہ یاد رہ گیا ہو' اور جو بھول گئے ہوں سو خیر۔ بالخصوص مدرسین امروہہ اور مرآداباد سے ضرور سلام عرض کر دیجیے۔ خوب یاد آیا سنبھل جناب منشی صاحب[1] کی خدمت میں سلام و نیاز پہنچا دیجیے اگر چہ ایک کارڈ صرف ہو خدا کرے آپ سب حضرات خیریت سے ہوں۔ احقر کے پاس کارڈ یا خط بھیجنے میں ٹکٹ لگانا فضول ہے۔ جملہ رفقاء اور انکے طفیل سے یہ ناکارہ بحمد اللہ خیریت اور راحت سے ہے۔ آپکی اس موٹی مرآدابادی جائے نماز نے بہت کام دیا' آپ کی عنایات کو یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ تو فرمائیں مولانا (سید[2] احمد حسن) مرحوم کے صاحب زادے کس مشغلہ میں ہیں؟ کتب ضروریہ سے فارغ بھی ہو چکے؟ اللہ کرے بخوبی فارغ ہو کر اپنے مقدس بزرگوار کے پیرو ہوں جملہ رفقاء آپ کو اور سب حضرات کو سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔ آپ کے کارڈ پر تاریخ نہ تھی۔ مگر ہم کو آخر محرم میں ملا۔ یہ عریضہ ۲۹ محرم کو روانہ کرتا ہوں۔

جناب سید صاحب! خط لکھو تو بالاجمال سب جگہ کی خیریت لکھ دینی مناسب ہے۔ سنبھل۔ بچھرایوں۔ نگینہ۔ وغیرہ کی، والسلام فقط، مالٹہ (مالٹہ) سینٹ کلیمنٹ براکس ۲۹ محرم ۱۳۳۷ھ محمود حسن ۲۲۱۹

---

[1] غالباً منشی حمید الدین صاحب بیخود سنبھلی مراد ہیں جو حضرت مولانا نانوتوی کے مسترشدین ومخلصین میں سے تھے۔ (فریدی)

[2] حضرت سید محدث امروہی کے صاحبزادے مولانا قاری سید محمد صاحب رضوی مدظلہٗ عرف بنے میاں۔ (فریدی) مولانا سید محمد میاں جید عالم تھے، حافظ وقاری بھی تھے، تمام علوم کی تحصیل وتکمیل جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں کی۔ آپ کا وصال ذی الحجہ ۱۳۹۸ موافق نومبر ۱۹۷۸ء میں ہوا۔ (محب الحق)

مکتوب نمبر ۲:

سراپا فضل و کرم دام لطفکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا گرامی نامہ ۶ رشعبان کا ہم کو ذی الحجہ میں وصول ہوا ممنون فرمایا۔ آپ کی اور جمیع حضرات امروہہ۔ مرآدآباد۔ سنبھل۔ نگینہ۔ حسن پور۔ بچھرایوں، کی بالا جمال خیریت معلوم ہوئی، الحمد للہ وجزاکم اللہ۔ مکرما! کیا عرض کروں' اس قدر بعد پر اپنے مکرمین واحباب سے تعلق میں کچھ کمی محسوس نہیں ہوتی اس لئے بالا جمال بھی خیریت معلوم ہوکر یک گونہ سکون ضرور ہو جاتا ہے۔ ادھر ''حوادث ہندوستان'' (انگریزوں کا ظلم وستم) معلوم ہوکر فکر و پریشانی ہوتی ہے۔ جب کسی کی خیریت معلوم ہوتی ہے گونہ اطمینان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو عافیت دارین عطا فرمائے۔ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مردے کے تعلق سے گو احیاء کے قلوب میں یکسوئی' یا غفلت آجاتی ہے جیسا کہ مشاہد ہے مگر غالباً اموات کے تعلق قلبی میں کمی نہیں آتی، گو کسی حال میں ہوں واللہ اعلم جب سے بعض خطوط سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی احمد شاہ[1] صاحب بوجہ ضعف ومرض ترک تعلق کر کے وطن آگئے بار بار خیال آکر ملال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اوران کے بزرگواروں کی برکت سے ان کو جملہ افکار وتکالیف سے محفوظ رکھے۔ الحمد للہ قاضی صاحب[2] بخیر اپنے مرکز پر قائم ہوگئے، ان کے خط کے جواب میں ایک عریضہ روانہ کیا تھا خدا کرے پہنچ گیا ہو۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ رفیق جاں نثار مولوی سید نصرت حسین[3] بماہ ذیقعدہ پیش قدمی کر کے راہی آخرت ہوئے، اللہ تعالیٰ رحمت اور مغفرت فرماوے۔ ان کی والدہ صاحبہ کو اطلاع کر دی تھی کوئی ان کا خط ابھی تک نہیں آیا۔ باقی رفیق بخیریت ہیں۔ آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ آپ کی دال اور گوشت کی پارسل سے خوشی ہوئی تھی مگر اس وقت تک کوئی نہیں پہنچا۔ آپ کی تحریر جواب میں بھی اسی لئے تاخیر کی کہ پارسل آجاویں تو آپ کو رسید بھی پہنچ جاوے۔ مگر افسوس ہے اس وقت تک نہیں پہنچے۔ احباب مرآدآباد کی خدمت میں سلام

---

[1] مولانا احمد شاہ صاحب حسن پوریؒ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز تھے۔ [2] غالباً قاضی محمد حسن صاحب مرادآبادیؒ قاضی بھوپال مراد ہیں جو حضرت مولانا گنگوہیؒ کے شاگرد اور مرید تھے۔ [3] مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحب کوڑہ جہان آبادی جو مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق تھے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔ (فریدی)

عرض ہے، جو صاحب پارسل بھیجنے کا ارادہ فرماویں ان کو منع کر دیجئے کہ اول تو چنداں حاجت نہیں، دوسرے اس قدر مسافت میں ضائع ہونے کا خطرہ۔ تیسرے یہاں پینٹھ بچھڑنی شروع ہے، رفتہ رفتہ متفرق طور پر لوگ جا رہے ہیں۔ سو یہ احتمال ہے کہ پارسل کہاں پہنچے اور مرسل الیہ کہاں۔ مولوی کفایت[1] اللہ صاحب سے بعد سلام مسنون فرما دیجئے کہ اپنی سعی کو اس زائد امر میں صرف نہ فرماویں، اس میں شک نہیں کہ کسی مخلص کا کوئی پارسل آتا ہے تو مسرت ہوتی ہے کہ علامت محبت ہے باقی سعی اور ترغیب یقیناً مکروہ معلوم ہونی چاہیے۔ مولوی امین[2] الدین صاحب اور جملہ ان کے مدرسین کو سلام۔ قاری سید محمد صاحب کو سلام مسنون۔ کاش آپ یہ بھی لکھ دیتے کہ کتب درسیہ سے فارغ ہو گئے اور اب یہ مشغلہ ہے۔ والسلام فقط، اپنے مدرسہ میں اور دیگر مواقع میں جہاں سلام پہنچا سکیں پہنچا دیجئے۔ مالطہ سینٹ کلیمینٹ براکس

۲ رصفر۔ محمود حسن ۳۳۹ھ

سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور مرزا قادیانی

حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ (متوفی ۱۳۳۰ھ) قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا نانوتویؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ تحریر و تقریر میں اپنے استاذ معظم سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کو تصویر قاسم[3] کہا جاتا تھا۔ حضرت مولانا نانوتویؒ ہی کے زمانے میں وہ کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

---

[1] حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ۔ [2] بانی مدرسہ امینیہ دہلی۔ (فریدی) [3] حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت محدث امروہیؒ کا مرثیہ لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

گم ہوئی آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے
سید العلماء امام اہلِ عقل و اہلِ نقل
جب شبیہ قاسمی سے بھی ہوئے محروم ہم

حضرت قاسم نشانی دے گئے تھے اپنی جو
پاک صورت پاک سیرت صاحب خلق نکو
تم ہی بتلا دو کہ پھر ہم کیا کریں اے دوستو۔

مدرسہ اسلامیہ خورجہ اور مدرسہ عبدالرب دہلی، مدرسہ اسلامیہ سنبھل میں مسندِ صدارت پر فائز رہے، بعدہٗ ۱۲۹۶ھ میں آپ حضرت نانوتویؒ کے ایما سے مدرسہ شاہی مرادآباد کے سب سے پہلے صدر المدرسین ہوئے۔ ذی قعدہ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے مستعفی ہوکر مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کی داغ بیل ڈالی، دیکھتے ہی دیکھتے یہ مدرسہ بام عروج پر پہونچ گیا اور ملک و بیرون ملک سے جوق در جوق تشنگان علوم اس ''دار العلم'' میں آتے رہے۔ حضرت محدث امروہیؒ کی شخصیت اور حضرت نانوتویؒ کی نسبت کی وجہ سے یہ مدرسہ بھی دیوبند اور سہارنپور کے مدارس سے کسی طرح کم نہ تھا۔ حضرت محدث امروہیؒ کے شاگرد رشید جو حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے بھی شاگرد نیز حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ و مجاز یعنی مفسر قرآن حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقیؒ محشی بیضاوی اور مطول، مولانا حافظ سید عبدالغنی صاحب پھلاودی اور دیگر با کمال اساتذہ نے اس مدرسہ کو حضرت امروہیؒ کی رفاقت میں چلایا، استاذ القراء حضرت قاری ضیاء الدین الٰہ آبادیؒ نے اس مدرسہ میں درس تجوید دیا اور یہیں دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغ حاصل کی، مولانا سید علی زینبی امروہیؒ، بابائے طب حکیم فرید احمد عباسیؒ، مولانا محمد امین الدینؒ مترجم ''نفیسی'' شفاء الملک مولانا حکیم رشید احمد خاںؒ جیسے سیکڑوں با کمال حضرات نے جو اپنے اپنے علاقوں میں صاحبِ درس وفتویٰ ہوئے اور تعلیم وتبلیغ کا کام انجام دیا۔ اس چشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی۔

پروفیسر عبدالعزیز میمنؒ نے بھی اس مدرسہ میں کچھ عرصہ تعلیم پائی ہے، معقول ومنقول کی انتہائی تعلیم اس درسگاہ میں ہوتی تھی۔ یہاں کے فارغ شدگان کی ایک طویل فہرست ہے جس کو یہاں درج کرنا مقصود نہیں۔

= لوگ کہتے ہیں چلے علامۂ احمد حسن
کامل و اکمل سبھی موجود ہیں پر اس کو کیا؟
اپنی اپنی جائے پر قائم ہیں سب اہل کمال
بادل پُر یاس آئی کان میں میرے صدا

اور میں کہتا ہوں وفات قاسمی ہے ہو نہ ہو
جو کہ مشتاقِ ادائے قاسمِ خیرات ہو
پر جگہ استاد کی خالی پڑی ہے دیکھ لو!
حک ہوئی تصویر قاسم صفحہ ہستی سے لو

۱۳۳۰ھ

حضرت امروہیؒ نے اپنے استاذ حضرت قاسم العلوم والعارفؒ کی طرح ہر فتنہ کا مقابلہ کیا اور اپنی تحریر وتقریر سے باطل کو ابھرنے نہ دیا، باطل کی سرکوبی کرنا ان کا خاص نصب العین تھا، اس کام کو کہاں کہاں اور کس کس تدبیر سے انجام دیا اس کی تفصیل بھی مدنظر نہیں۔ مجھے اس مقالہ میں صرف حضرت محدث امروہیؒ کی اُس جدوجہد کو ذکر کرنا ہے جو انھوں نے مرزا قادیانی کے مقابلہ میں کی۔ بدقسمتی سے امروہہ میں حکیم محمد احسن جو ایک اچھے خاندان کے فرد تھے۔

مرزا قادیانی کے دام فریب میں آ گئے اور قادیان سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا، قادیانی مذہب کے واقفین پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ حکیم محمد احسن امروہی اور حکیم نورالدین بھیروی قادیانیوں کے یہاں نعوذ باللہ شیخین کا مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کو رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے۔

مرزا کی جھوٹی نبوت کا دارومدار انھیں دونوں کی دجل آمیز تحقیق پر تھا۔ حکیم محمد احسن نے اپنے محلہ کے قریب رہنے والے چند اشخاص کو مرزا قادیانی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ حضرت مولانا امروہیؒ اور ان کے ذی استعداد شاگردوں نے حکیم محمد احسن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور وہ اپنی باطل وبیجا کوشش میں امید کے مطابق کامیاب نہ ہو سکے۔ ان لوگوں میں سے جو قادیانی کی طرف مائل ہو گئے تھے بعض لوگوں نے توبہ کر لی تھی۔ حضرت محدث امروہیؒ کو بڑا فکر تھا کہ ان کے وطن میں یہ فتنہ وباء کی طرح پھیلتا جا رہا ہے چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں جو مولانا حافظ سید عبدالغنی صاحبؒ پھلاوَدی کے نام ہے اس فتنہ کا ذکر فرماتے ہیں:

بندہ نحیف احقر الزمن احمد حسن غفرلہ

بخدمت برادر مکرم جامع کمالات عزیزم حافظ مولوی محمد عبدالغنی سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مدعا نگار ہے کہ...... امروہہ میں اور خاص محلہ دربار (کلاں) میں ایک مرض وبائی مہلک یہ پھیل رہا (ہے) کہ محمد احسن جو مرزا قادیانی کا خاص حواری ہے، اس نے حکیم آل محمد کو جو مولانا نانوتویؒ سے بیعت تھے مرزا کا مرید بنا چھوڑا

اور سید بدر الحسن[1] کو جس نے مدرسہ میں مجھ ناکارہ سے بھی کچھ پڑھا (ہے) مرزا کی طرف مائل (کر دیا) ان دونوں کے بگڑنے سے محمد احسن کی بن پڑی۔ لن ترانیاں کرنی شروع کیں، طلبہ کے مقابلہ سے یوں عقب گذاری (کی) احمد حسن میرے مقابلہ پر آوے، میں جب مناظرہ پر آمادہ ہوا اور یہ پیغام دیا کہ حضرت! مرزا کو بلایئے صَرف راہ میرے ذمہ (یا) مجھ کو لے چلئے میں خود اپنے صَرف کا متکفل (ہوں گا) بسم اللہ آپ اور مرزا دونوں مل کر مجھ سے مناظرہ کر لیجئے یا میرے طلبہ سے مناظرہ کیجئے۔ ان کی مغلوبی میری مغلوبی تب مناظرہ کا دعویٰ چھوڑ، مباہلہ کا ارادہ کیا، بنام خدا میں اس پر آمادہ ہوا اور بے تکلف کہلا بھیجا بسم اللہ مرزا آوے، مباہلہ، مناظرہ جو شق وہ اختیار کرے میں موجود ہوں (میں نے) اس کے بعد جامع مسجد (امروہہ میں) ایک وعظ کہا اور اس پیغام کا بھی اعلان کر دیا اور مرزا کے خیالات فاسدہ کا پورا رد کیا۔

کل بروز جمعہ دوسرا وعظ ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ بہت پر زور تھا اور بہت زور کے ساتھ یہ پکار دیا کہ دیکھو مولوی فضل حق کا یہ اشتہار مطبوعہ (اور) میرا یہ اعلان مرزا صاحب کو کوئی صاحب لوجہ اللہ غیرت دلائیں کب تک خلوت خانہ میں چوڑیاں پہنے بیٹھے رہو گے؟ میدان میں آؤ اور اللہ برتر کی قدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھو کہ ابھی تک خدا کے کیسے کیسے بندے تم سے دجّال امت کی سرکوبی کے واسطے موجود ہیں۔ اگر تم کو اور تمھارے حوارین کو غیرت ہے تو آؤ ورنہ اپنے ہفوات سے

---

[1] مولانا سید بدر الحسن امروہیؒ حضرت امروہیؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ ان کی آمد و رفت محمد احسن کے پاس رہنے لگی اور ان کی باتیں سن کر حیات مسیح علیہ السلام میں ان کو شک و تردد ہو گیا۔ بہت سے علماء نے ہر چند ان کو سمجھایا لیکن ان میں باطل کا اثر ہو گیا تھا۔ اس لئے کسی کی نہ سنتے تھے اور الٹا مناظرہ کرتے تھے۔ حضرت محدث امروہیؒ کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی۔ ایک دن ان کو حضرت کے پاس لایا گیا یا وہ خود بخود آئے۔ حضرت نے ان کو دیکھ کر فرمایا! مولوی بدر الحسن حقیقت میں تم ہمارے طبیب روحانی ہو، ہمیں غرور ہو چلا تھا کہ ہمارا شاگرد اور ہمارے پاس بیٹھنے والا باطل میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے تم نے ہمارا غرور توڑ دیا، نہ معلوم کہ کس جذبہ سے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ مولوی بدر الحسن زار زار رونے لگے اور قدموں پر لوٹنے لوٹنے پھرے اور اپنے فاسد عقیدہ سے توبہ کی۔ یہی بدر الحسن حضرتؒ کے ساتھ مجلس مناظرہ رامپور میں موجود تھے۔ (فریدی)

باز آؤ۔ بفضلہٖ تعالیٰ ان دونوں وعظوں کا اثر شہر میں امید سے زیادہ پڑا اور دشمن مرعوب ہوا۔

پیش گوئی تو یہ ہے کہ نہ مباہلہ ہو، نہ مناظرہ مگر دعا سے ہر وقت یاد رکھنا مولانا گنگوہی مدظلہٗ (اور) مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی نے بہت کلمات اطمینان تحریر فرمائے ہیں۔ ارادہ (ہے) دو چار وعظ اور کہوں۔

(۲۰/ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۰۲ء از امروہہ)

خود حضرت محدث امروہیؒ نے مرزا کو براہ راست بھی ایک مکتوب گرامی تحریر فرمایا جو قادیانیوں کی روئیداد مباحثہ رامپور میں درج ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''بسم اللہ آپ تشریف لایئے، میں آپ کا مخالف ہوں۔ آپ مسیح موعود نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ آپ اپنے کو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، میں بنام خدا مستعد ہوں، خواہ مناظرہ کیجئے یا مباہلہ آپ اپنے اس دعویٰ کا احادیث معتبرہ سے ثبوت دیجئے، میں انشاء اللہ تعالیٰ اس دعوے کی قرآن و احادیث صحیحہ سے تردید کروں[1] گا۔

---

[1] حضرت محدث امروہیؒ کی ایک تحریر مجھے ملی ہے جو عربی زبان میں ہے اور جس کو میں رسالہ دارالعلوم دیوبند بابت شعبان ۱۳۷۳ھ میں بسلسلۂ سوانح حضرت محدث امروہیؒ شائع کرا چکا ہوں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیح ابن مریم علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان کی طرف اٹھایا اور ان کو قتل و صلیب سے بچا لیا۔ وہ قرب قیامت میں خروج دجال کے بعد جامع مسجد دمشق کے منارۂ شرقی سے اتریں گے اور وہ دو زرد چادروں میں لپٹے ہوں گے اور دو فرشتوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے ان کے سر سے پانی ٹپک رہا ہوگا۔ گویا وہ ابھی غسل کر کے غسل خانہ سے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ جزیہ موقوف کر دیں گے۔ دجال اکبر ان کے ہاتھ سے قتل ہوگا۔ ان کے سانس سے کافر مر جائے گا، جہاں تک ان کی نظر جائے گی باطل ختم ہو جائے گا۔ یہ باتیں حق ہیں۔ اس میں باطل کو راہ نہیں۔ کتاب اللہ سے اور نبی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے یہی ثابت ہے، جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مسیح ابن مریم وفات پا گئے اور وہ خود نعوذ باللہ مسیح موعود ہے۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کی اور اس نے کتاب اللہ اور احادیث کی نصوص ظاہرہ سے اعراض کیا اور امر ثابت کی مخالفت کی۔ وہ ومن یشاقق الرسول الآیہ کا مصداق ہے، یہ مرزائی جھوٹ بولتے ہیں، یہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے قول کو باطل کر دکھلائے گا اور حق کی فتح ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہترین کارساز ہے۔ اے مسلمانو! (مسلسل)

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

راقم خادم الطلبہ احقر الزمن احمد حسن غفرلہٗ، مدرس مدرسہ عربیہ، امروہہ۔

(ستہ ضروری مباحثہ رامپوری ص ۵۶)

ان تمام کوششوں کا ذکر مرزائے قادیان کے سامنے بھی ان کی جماعت کی طرف سے بذریعہ خط یا براہ راست کیا جاتا ہوگا، مرزا کو جہاں دیگر علماء حق سے عناد تھا۔ حضرت امروہیؒ سے بھی دلی بغض ہو گیا اور ایک رسالہ دافع البلاء لکھا جس میں ایک بڑی لمبی چوڑی تمہید کے بعد حضرت امروہیؒ کو مخاطب کیا ہے۔ مخاطبت میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کو حضرتؒ کی ذات سے اپنے لئے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، دافع البلاء سے مرزا کی تحریر کے چند جملے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

......مولوی احمد حسن صاحب امروہی کو ہمارے مقابلہ کے لئے خوب موقع مل گیا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ بھی دوسرے مولویوں کی طرح اپنے ''مشرکانہ عقیدہ'' کی حمایت میں تا کہ کسی طرح حضرت مسیح ابن مریم کو موت سے بچالیں اور دوبارہ اتار کر خاتم الانبیاء بنادیں۔ بڑی جانکاہی سے کوشش کر رہے ہیں.... اگر مولوی احمد حسن صاحب کسی طرح باز نہیں آتے تو اب وقت آگیا ہے کہ آسمانی فیصلہ سے ان کو پتہ لگ جائے یعنی اگر وہ درحقیقت مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں اور میرے الہامات کو انسان کا افترا خیال کرتے ہیں نہ خدا کا کلام تو سہل طریق یہ ہے کہ جس طرح میں نے خدا تعالیٰ سے الہام پاکر " انہ اوی القریة لولا الاکرام لھلک المقام" وہ "انہ اوی الامروھہ " لکھ دیں مومنوں کی دعا تو خدا سنتا ہے وہ شخص کیسا مومن ہے کہ ایسے شخص کی دعا اس کے مقابلے میں تو سنی جاتی ہے جس کا نام اس نے دجّال اور بے

(مسلسل) اور اے کتاب اللہ اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیو! تم اس گمراہ اور گمراہ کن شخص سے بچتے رہو اور اس کے میل جول سے سخت پرہیز رکھو۔ اس لئے کہ یہ اس امت کا دجال ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تیس جھوٹے دجال نہ آجائیں ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

حررہ خادم الطلبہ احقر الزمن احمد حسن الحسینی الامروہی غفرلہٗ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ

ایمان اور مفتری رکھا ہے مگر اس کی اپنی دعائیں نہیں سنی جاتیں۔ پس جس حالت میں میری دعا قبول کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ میں ''قادیان'' کو اس تباہی سے محفوظ رکھوں گا خصوصاً ایسی تباہی سے کہ لوگ کتوں کی طرح طاعون کی وجہ سے مریں یہاں تک کہ بھاگنے اور منتشر ہونے کی نوبت آوے۔ اسی طرح مولوی احمد حسن صاحب کو چاہئے کہ اپنے خدا سے جس طرح ہو سکے ''امروہہ'' کی نسبت دعا قبول کرالیں کہ وہ طاعون سے پاک رہے گا اور اب تک یہ دعا قریب قیاس بھی ہے کیوں کہ ابھی تک ''امروہہ'' طاعون سے دوسو کوس کے فاصلہ پر ہے لیکن ''قادیان'' سے طاعون چاروں طرف سے بفاصلہ دو کوس آگ لگا رہی[1] ہے۔ یہ ایک ایسا صاف صاف مقابلہ ہے کہ اس میں لوگوں کی بھلائی بھی ہے اور نیز صدق اور کذب کی شناخت بھی کیونکہ اگر ''مولوی احمد حسن'' صاحب لعنت باری کا مقابلہ کر کے دنیا سے گذر گئے تو اس سے ''امروہہ'' کو کیا فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے اپنے فرضی مسیح کی خاطر دعا قبول کرا کے خدا سے یہ بات منوالی کہ امروہہ میں طاعون نہیں پڑے گی تو اس صورت میں نہ صرف ان کو فتح ہوگی بلکہ تمام ''امروہہ'' پر ان کا ایسا احسان ہوگا کہ لوگ اس کا شکر نہیں کر سکیں گے اور مناسب ہے کہ ایسے مباہلہ کا مضمون اس اشتہار کے شائع ہونے سے پندرہ دن تک بذریعہ چھپے ہوئے اشتہار کے دنیا میں شائع کردے جس کا یہ مضمون ہو کہ میں یہ اشتہار مرزا غلام احمد کے مقابل پر شائع کرتا ہوں جنھوں نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور میں جو مومن ہوں، دعا کی قبولیت پر بھروسہ کر کے یا الہام پا کر یا خواب دیکھ کر یہ اشتہار دیتا ہوں کہ ''امروہہ'' ضرور بالضرور طاعون کی دست برد سے محفوظ رہے گا لیکن ''قادیان'' میں تباہی پڑے گی کیونکہ مفتری کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس اشتہار سے غالب آئندہ جاڑے تک فیصلہ ہو جائے گا۔ دوسرے تیسرے جاڑے تک ...... اول یہ کارروائی (طاعون) پنجاب میں شروع ہوئی لیکن ''امروہہ'' بھی مسیح موعود کی محیط ہمت سے دور نہیں، اس لئے اس مسیح کا کافر کش دم ضرور ''امروہہ'' تک بھی پہونچے گا یہی ہماری طرف سے دعویٰ ہے۔ مولوی احمد حسن اس اشتہار کے شائع ہونے کے بعد جس کو وہ قسم کے ساتھ شائع کرے گا امروہہ کو طاعون سے بچا سکا اور کم سے کم تین جاڑے امن سے گذر گئے تو

[1] مرزا قادیانی کے یہاں طاعون مؤنث ہے۔

میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں پس اس سے بڑھ کر اور کیا فیصلہ ہوگا اور میں بھی خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مسیح موعود ہوں اور وہی ہوں جس کا نبیوں نے وعدہ دیا ہے اور میری نسبت اور میرے زمانے کی نسبت توریت اور انجیل اور قرآن شریف میں خبر موجود ہے کہ اس وقت آسمان پر خسوف وکسوف ہوگا اور زمین پر طاعون پڑے گی اور میرا یہی نشان ہے کہ ہر ایک مخالف خواہ وہ ''امروہہ'' میں رہتا ہو اور خواہ ''امرتسر'' میں اور خواہ ''دہلی'' میں اور خواہ ''کلکتہ'' میں اور خواہ ''لاہور'' میں اور خواہ ''گولڑہ'' میں اور خواہ ''بٹالہ'' میں اگر وہ قسم کھا کر کہے گا کہ اس کا فلاں مقام طاعون سے پاک رہے گا تو ضرور وہ مقام طاعون میں گرفتار ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے خدائے تعالیٰ کے مقابل پر گستاخی کی اور یہ امر کچھ ''مولوی احمد حسن صاحب'' تک محدود نہیں بلکہ اب تو آسمان سے عام مقابلہ کا وقت آ گیا اور جس قدر لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں جیسے ''شیخ محمد حسین بٹالوی'' جو مولوی کر کے مشہور ہیں اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی جس نے بہتوں کو خدا کی راہ سے روکا ہوا ہے، عبدالجبار، عبدالحق اور عبدالاحد غزنوی جو مولوی عبداللہ کی جماعت میں سے ملہم کہلاتے ہیں اور منشی الٰہی بخش صاحب اکاؤنٹنٹ جنھوں نے میرے مخالف الہام کا دعویٰ کر کے مولوی عبداللہ صاحب کو سید بنا دیا ہے اور اس قدر صریح جھوٹ سے نفرت نہیں کی اور ایسا ہی نذیر حسین دہلوی جو ظالم طبع اور تکفیر کا بانی ہے ان سب کو چاہئے کہ ایسے موقع پر اپنے الہاموں اور اپنے ایمان کی عزت رکھ لیں اور اپنے اپنے مقام کی نسبت اشتہار دے دیں کہ وہ طاعون سے بچایا جائے گا۔ اس میں مخلوق کی سراسر بھلائی اور گورنمنٹ کی خیر خواہی ہے اور ان لوگوں کی عظمت ثابت ہوگی اور ولی سمجھے جائیں گے ورنہ وہ اپنے کاذب اور مفتری ہونے پر مہر لگا دیں گے اور ہم عنقریب انشاء اللہ اس بارے میں مفصل اشتہار شائع کریں گے۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ

(ماخوذ: از دافع البلاء ص ۱۵ تا ص ۱۸ مطبوعہ ضیاء الاسلام قادیان مورخہ اپریل ۱۹۰۲ء)

طاعون کی پیش گوئی کا انجام:

قادیان میں طاعون کا آنا: مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے مرزا کی بہت سی پیش گوئیوں کا الٹا اثر دکھانے کے

بعد اس پیش گوئی پر بھی اپنے رسالے ''الہاماتِ مرزا'' میں بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ میں اس موضوع پر ان کے کہے ہوئے مضامین میں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ مولانا امرتسریؒ فرماتے ہیں:

''اس پیش گوئی پر تو مرزا جی نے اپنی صداقت کا بہت کچھ مدار رکھا ہے، رسالہ دافع البلاء میں تو اس قدر زور ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کو للکارا جاتا ہے۔ ''کوئی ہے کہ وہ ہماری طرح اپنے اپنے شہر کی بابت کہے ''انہ اوی القریہ'' یہاں (قادیان میں) طاعون کیوں نہیں آتا؟ بلکہ جو کوئی باہر کا آدمی قادیان میں آجاتا ہے وہ بھی اچھا ہو جاتا ہے۔'' مگر خدا کی شان کیا ہی کسی نے سچ کہا ہے

حباب بحر کو دیکھو وہ کیسا سر اٹھاتا ہے ۔۔۔ تکبر وہ بری شی ہے کہ فوراً ٹوٹ جاتا ہے

چند روز تو مرزا جی نے بہت کوشش کی کہ ''قادیان'' کے طاعون کا اظہار نہ ہو مگر بکری کی ماں کب تک خیر منائے۔ آخر جب یہ امر ایسا متحقق ہو گیا کہ مرزا جی کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تو ایک اعلان جلی حرفوں میں جاری کیا جو درج ذیل ہے:

''اعلان: چونکہ آج کل مرض طاعون ہر جگہ بہت زور پر ہے اس لئے اگرچہ ''قادیان'' میں نسبتاً آرام ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برعایت اسباب بڑا مجمع جمع ہونے سے پرہیز کیا جائے اس لئے یہ قرین مصلحت ہوا کہ دسمبر کی تعطیلوں میں جیسا کہ پہلے اکثر احباب ''قادیان'' میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اب کی دفعہ اس اجتماع کو بلحاظ مذکورہ بالا ضرورت کے موقوف رکھیں اور اپنی اپنی جگہ پر خدا سے دعا کرتے رہیں کہ وہ اس خطرناک ابتلاء سے ان کو اور ان کے اہلِ وعیال کو بچاوے۔ (اخبار البدر قادیان ۱۹/دسمبر ۱۹۰۲ء)

اللہ اللہ کیسی دبی زبان سے قادیان میں طاعون ہونے کا اقرار ہے، کس سوچ بچار سے لکھا گیا ہے کہ ''نسبتاً آرام'' ہے جس سے دام افتادوں کو بالکل آرام ہی معلوم ہو مگر دانا اس نسبتاً کے لفظ کی نسبت کو

سمجھتے ہیں اور اس کی جانچ کرنے کو سرکاری رپورٹیں پیش کرتے ہیں، چنانچہ قادیان کے اخبار البدر (جو مرزا جی کا ڈائری نویس ہے) کے نمبر ا ص ۴ پر لکھا ہے کہ:

رائے پرتاپ سنگھ نے (جو قادیان میں لوگوں کو ٹیکہ لگانے آئے تھے) کہا کہ میں مرزا صاحب سے بھی کہتا مگر انھوں نے ڈھنگ بنایا ہوا ہے۔ اس لئے میں سردست ان کی خدمت میں کچھ نہیں کہتا۔ میں یہاں نہ آتا مگر چونکہ متواتر رپورٹ پہنچ رہی ہے کہ (یہاں) چوہڑوں میں طاعون ہے اس لئے آنا پڑا۔''

یہ سن کر جناب مرزا صاحب کس ناز وادا سے بعد تسلیم وجود طاعون دبی زبان سے تاویل فرماتے ہیں۔

انه اوی القریه میں قریہ کا لفظ ہے قادیان کا نام نہیں اور قریہ قیرا سے نکلا ہے جس کے معنی جمع ہونے اور اکٹھے بیٹھ کر کھانے کے ہیں وہ لوگ جو آپس میں مواکلت رکھتے ہیں، اس میں ہندو اور چوہڑے داخل نہیں۔ (اخبار مذکور ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء)

حالانکہ دافع البلاء مطبوعہ ریاض ہند ص ۸ پر لکھتے ہیں: خدا نے سبقت کر کے قادیان کا نام لے دیا ہے۔ اب یہاں صاف ہی انکار ہے۔ خدا کی شان کہ ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ یوں لکھا جاتا تھا اور شور مچایا جاتا تھا کہ:

(تیسری بات جو اس وحی (متعلق طاعون) سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بہر حال جب تک کہ طاعون دنیا میں رہے گو ستر برس تک رہے) قادیان کو اس کی خوفناک تباہی سے محفوظ رکھے گا کیونکہ یہ اس کے رسول کا تخت گاہ (ہے) اور یہ تمام امتوں کے لئے نشان ہے۔''

مولانا امرتسریؒ اس عبارت کو درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

مگر آج یہ بات کھلی کہ قادیان کا نام ہی نہیں قادیان کے رہنے والوں سے ہم نے بگوش خود سنا کہ اگر مرزا یہ پیش گوئی نہ کرتا تو قادیان میں کبھی طاعون نہ آتا، جب

سے اس نے پیش گوئی کی ہے ہم نے اسی روز سے سمجھا تھا کہ ہماری خیر نہیں، خدا اس کی تکذیب کرنے کو قادیان میں ضرور ہی طاعون بھیجے گا، سو ایسا ہی ہوا۔

۱۶ اپریل ۱۹۰۴ء کے اخبار البدر قادیان میں مندرجہ ذیل ایک نوٹ ایڈیٹر کی طرف سے نکلا تھا:

قادیان آریہ سماج کے دوسرے سالانہ جلسہ پر جو کہ ۲۔۳ اپریل کو ہوا، سنا گیا ہے کہ یوگیندر پال صاحب نے بڑے دعوے سے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہم بذریعہ ہون کے قادیان کو (طاعون سے) پاک وصاف کریں گے۔ سو جلسہ کا ختم ہونا تھا کہ یوگیندر پال تو کیا صاف کرتے خود طاعون نے صفائی شروع کر دی۔ اخبار اہل حدیث امرتسر مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں معتبر شہادت کے حوالہ سے بتلایا گیا ہے کہ مارچ اپریل ۱۹۰۴ء کے دو مہینوں میں ۳۱۴ آدمی قادیان میں طاعون سے مرے ہیں حالانکہ کل آبادی ۲۸۰۰ کی ہے۔ سب لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تمام قصبہ ویران سنسان نظر آتا ہے

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مرزا غلام احمد قادیانی کی مندرجہ ذیل عبارت حقیقت الوحی ص ۸ سے نقل فرماتے ہیں:

طاعون کے دنوں میں جب کہ قادیان میں طاعون زور پر تھا میرا لڑکا شریف احمد بیمار ہوا۔ (ماخوذ از الہامات مرزا مصنفہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ)

مناظرہ رامپور

رامپور میں منشی ذوالفقار علی قادیانی ہو گئے تھے (جو مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی تھے) اور ان کے چچازاد بھائی حافظ احمد علی خان شوق رامپوری جماعت حقہ کے ساتھ تھے۔ دونوں ہی نواب رامپور کے خاص ملازم تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے قول کے مطابق ان دونوں میں بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا۔ نواب حامد علی خاں والی ریاست رامپور نے اس بحث ومباحثہ کا حال معلوم کر کے کہا کہ دونوں فریق

سرکاری خرچ پر اپنے اپنے علماء کو بلائیں، چنانچہ ۱۵ر جون مناظرہ کے لئے مقرر ہوئی۔ اہل حق کی طرف سے حضرت محدث امروہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی، حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم کو مدعو کیا گیا۔ ابوالوفاء مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے مناظرہ کیا، فریق ثانی کی حمایت کے لئے حکیم محمد احسن امروہی، خواجہ کمال الدین وغیرہما رامپور پہونچے تھے۔ حضرت مولانا امروہیؒ نے مولانا حافظ عبدالغنی پھلاودیؒ کو ایک مکتوب گرامی میں اس مناظرہ کے بارے میں یوں تحریر فرمایا تھا:

......امسال ایک مرتبہ دہرہ دون جانا ہوا اور پھر بھاگلپور اب ریاست رامپور میں فیما بین اہل سنت و جماعت و گروہ قادیانی مناظرہ قرار پایا ہے، رئیس (نواب) کی خواہش ہے۔ میری مشافہت میں مناظرہ ہو۔ قادیانیوں نے مولوی محمد احسن امروہی مولوی سرور اور دو چار اور کو منتخب کیا ہے۔ ادھر سے اول میرا نام لیا گیا ہے اور مولوی محمد اشرف علی صاحب کا (اور؟) مولوی خلیل احمد، مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری کا، نیز پندرہ جون مقرر ہے۔ کل بطلب بندہ رجسٹری خط آیا ہے کہ آپ بروز پنجشنبہ دس جون کو رام پور آجاویں۔ امور ضروریہ آپ کے سامنے طے ہونے ہیں۔ غالباً جمعہ کے بعد روانہ ہوں، میں نے مولانا محمود حسن صاحب صاحبزادہ صاحب (مولانا حافظ محمد احمد) اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو لکھا ہے کہ (امروہہ) جمعہ پڑھیں اور ایک ساتھ روانہ ہوں، غالباً سب حضرات تشریف لاویں۔ آپ کو ضروریہ تکلیف دی جاتی ہے کہ دعا اور ہمت قلبی سے اعانت کریں۔

(۱۹ر جمادی الاول ۱۳۲۷ھ بروز چہارشنبہ مطابق ۹ر جون ۱۹۰۹ء)

اپنے دوسرے مکتوب گرامی میں اس مناظرہ میں جو نمایاں کامیابی ہوئی اس کو مولانا حافظ عبدالغنی پھلاودیؒ کو یوں ارقام فرماتے ہیں:

بندہ نحیف احقر الزمن احمد حسن غفرلہ بخدمت جامع کمالات برادر مکرم مولوی

حاجی حافظ محمد عبدالغنی صاحب سلمہم بعد سلام مسنون مکلف ہے۔

......رامپور جانے کے بعد دوشنبہ کے روز مناظرہ شروع ہوا۔ مسئلہ وفات مسیح کا مولوی محمد احسن قادیانی......مرزائی نے ثبوت پیش کیا۔ مولوی ثناء اللہ امرتسری نے اہل اسلام کی طرف سے تحقیقی والزامی وہ جوابات دنداں شکن دیئے کہ ماشاء اللہ مجلس میں ہر خاص وعام پر محمد احسن کی مغلوبی اور مولوی ثناء اللہ کا غلبہ واضح وثابت ہوگیا۔ اسی روز رامپور میں عام شہرت ہوگئی کہ قادیانی پسپا ہوئے مگر وہ بے غیرت اگلے روز بھی آکر زیادہ ذلیل ہوئے۔ محمد احسن کو نا قابل مان کر خود ان کے گروہ نے دوسرا مناظر مقرر کیا۔ وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا، تیسرے روز الزامی جوابات میں بہت ذلیل ہوئے، نواب صاحب نے فرمایا یہ مسئلہ ختم ہوا اور حاضرین کو حق و ناحق معلوم ہوگیا۔ اب نبوت مرزا کا ثبوت دیجئے آمادہ نہ ہوئے اور ایک شب کی مہلت لی، شب میں یہ درخواست لکھی کہ حضور (نواب صاحب) اہل اسلام کے حامی ہیں بمقابلہ حضور ہم کو مناظرہ کرنا منظور نہیں۔ نیز مناظر اہل اسلام بدزبان ہے ہمارے مقتدا وسیلۂ نجات (مرزا قادیانی) کی بھاری گستاخی کرتا ہے۔ لہٰذا ہم کو مناظرہ کرنا کسی حال میں منظور نہیں، معاف فرمایئے۔ یہ درخواست لکھ کر بعضے شب میں ہی روانہ ہوئے اور بعضے دن میں راہی......والحمد للہ......(۲۸رجون ۱۹۰۹)

اب مناسب خیال کرتا ہوں کہ مناظرہ رامپور کی کچھ روئیداد ہفت روزہ اخبار دبدبہ سکندری رامپور سے پیش کی جائے۔ دبدبہ سکندری کے دو پرچوں میں مناظرہ کا مختصر حال لکھا ہے۔ مفصل طور پر مناظرہ کی رپورٹ نہیں لکھی ہے۔ ایک پرچہ سے معلوم ہوا کہ حافظ احمد علی صاحب نے مناظرہ کی مکمل روئیداد دبدبہ سکندری کو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بعض موانع کی وجہ سے پوری کیفیت تحریر کر کے دبدبہ

سکندری کو نہ بھیج سکے۔ ممکن ہے مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اپنے رسالہ اہل حدیث میں مناظرہ کے تمام احوال و کوائف شائع کر دیئے ہوں لیکن رامپور کی رضا لائبریری میں اخبار اہل حدیث کا کوئی فائل ۱۹۱۱ء سے پہلے کا نہیں ہے۔ حضرت محدث امروہیؒ کی ایک معرکۃ الاراء تقریر بھی مناظرہ کے دران یا اختتام پر نواب کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ اس کا بھی حاضرین پر بہت اثر پڑا تھا۔ مولانا عبدالوہاب خاں رامپوری مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں نے یہ تقریر سنی تھی۔ یہ مناظرہ قلعہ رامپور کے اندر ہوا تھا اور اندازہ ہوتا ہے کہ علاوہ خواص کے شہر کے اور بھی بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص کو سماعت کا موقع ملا تھا۔ مناظرہ ۱۵؍جون ۱۹۰۹ء کو شروع ہوا اخبار دبدبہ سکندری کے پرچوں میں اس کی جو روئداد چھپی ہے۔ اس کی تلخیص یہ ہے:

اس ہفتہ میں کئی روز حضرات علماء اسلام اور جماعت احمدیہ قادیانی میں نہایت عمدہ مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ کے محرک و مجوز جناب حافظ احمد علی خاں صاحب حنفی نقشبندی مہتمم کارخانہ جات ذات خاص حضور اور منشی ذوالفقار علی خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ آبکاری ریاست رامپور ہیں۔

بہت سے حضرات علماء اسلام مناظرہ میں تشریف لائے ہیں جن میں سے چند حضرات کے نام نامی یہ ہیں: (حضرت) مولانا احمد حسن امروہی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی، مولانا محمد الدین صاحب امرتسری، مولانا محمد برکات علی صاحب لدھیانوی، مولوی محمد ابراہیم صاحب دہلوی، مولوی محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، مولوی محمد یحیٰ صاحب کاندھلوی، حاجی محمد عبدالغفار صاحب سوداگر دہلی، مولوی حکیم قیام الدین صاحب جونپوری، مولوی محمد حامد رضا خان صاحب حنفی قادری بریلوی، ڈاکٹر محمد عبدالحکیم صاحب اسسٹنٹ سرجن پٹیالہ، حضرت مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری، مولوی عبدالغفار خاں صاحب حنفی نقشبندی رامپوری، مولوی محمد لطف اللہ صاحب مفتی ریاست رامپور، مولانا محمد فضل حق صاحب رامپوری مدرس اول مدرسہ عالیہ ریاست رامپور۔

جماعت قادیانی کی طرف سے یہ اشخاص آئے ہیں:

مولوی محمد احسن صاحب امروہی، میاں سرور شاہ صاحب، منشی مبارک علی صاحب، منشی قاسم علی صاحب، منشی محمد علی صاحب ایم.اے.، خواجہ کمال الدین صاحب وکیل لاہور، منشی یعقوب علی صاحب ایڈیٹر الحکم قادیان، حافظ روشن علی صاحب، ڈاکٹر محمد یعقوب خاں لاہوری، شیخ رحمت اللہ سوداگر لاہور وغیرہ۔

۱۵ر جون ۱۹۰۹ء حیات وممات مسیح علیہ السلام کی بحث چلی، سب سے پہلے جماعت قادیانی کی طرف سے محمد احسن امروہی نے ایک تحریری مضمون پڑھا۔ مولانا محمد ثناء اللہ صاحب امرتسری نے ان کے چاروں استدلالوں پر نقض قائم کر دیئے۔ مولوی محمد احسن کے بیان کی بے ربطی کا خود قادیانی جماعت نے اقرار کیا اور اس امر کو ان کی پیرانہ سالی کے سر منڈھا۔

۱۶ر جون ۱۹۰۹ء کو بعد معزولی محمد احسن منشی قاسم علی نے تحریری بیان وفات مسیح علیہ السلام پر پڑھنا شروع کیا۔ بجائے اس کے کہ مولانا محمد ثناء اللہ کے کل کے چار اعتراضات کا جواب دیا جاتا وہ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر کے بعد صرف ایک اعتراض کی جانب پلٹ کر آئے۔

۱۷ر جون ۱۹۰۹ء کو ناسازی طبع کی وجہ سے نواب صاحب جلسہ مناظرہ میں نہیں آئے اور ان کی قائم مقامی چیف سکریٹری اور ریونیو سکریٹری نے کی (آج) قادیانی جماعت کے مناظر سے کہا گیا کہ وہ مولانا امرتسری کے اعتراضات کا جواب دیں مگر جماعت قادیانی کی جانب سے جواب دینے میں پہلو تہی کی گئی۔

۱۸ر جون ۱۹۰۹ء کو مناظرہ نہیں ہوا۔

۱۹ر جون ۱۹۰۹ء کو مناظرہ ہوا۔ آج بھی قادیانی مناظر وفات مسیح علیہ السلام کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ (اخبار دبدبہ سکندری ۲۱ر جون ۱۹۰۹ء)

۲۰ر جون کو اہل اسلام نے کہا کہ قادیانی ثبوت وفات مسیح علیہ السلام دینے سے گریز کرتے ہیں اور بار بار کے اصرار پر بھی عاجز ہیں۔ کل سے حضرات علماء اہل اسلام ابطال نبوت مرزا پر گفتگو کریں گے۔ اس پر خواجہ کمال الدین نے مناظرہ سے جان بچانے کے ڈھنگ نکالے اور ہٹ دھرمی سے کام لینا

چاہا۔ بہت ردوقدح کے بعد قادیانیوں سے کہا گیا کہ وفات حضرت مسیح علیہ السلام پر آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہیں تا کہ مسئلہ تو ختم ہو چنانچہ منشی قاسم علی نے تحریری مضمون پڑھنا شروع کیا اور اہل اسلام کی طرف سے جو نقض ان پر وارد ہوئے تھے بعض کا جواب دیا قادیانیوں کی تحریر کے ختم پر جناب مولانا ثناء اللہ صاحب کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر میں انھوں نے فریق مخالف کے تمام دلائل کو تارِ عنکبوت کی طرح توڑ دیا۔ اسی دن قادیانیوں نے یہ لکھا کہ ہم مناظرہ کرنا نہیں چاہتے۔ **الحق یعلوا ولا یُعلیٰ۔**

اللہ تعالیٰ نے دین حق کی نصرت فرمائی اور قادیانی خائب وخاسر ۲۰/جون کی شب اور ۲۱/جون کو یہاں سے چلے گئے۔ مولانا قیام الدین صاحب بخت جونپوری نے کیا خوب تاریخ کہی۔

قادیانی پئے احقاق حق — رام پور آئے مگر کھائی شکست
احمدی کہتے ہیں اپنے کو وہ لوگ — لیکن این نسبت آنہا غلط است
بخت نے لکھی یہ سچی تاریخ — احمدیوں کو ہوئی فاش شکست

(اخبار دبدبۂ سکندری ۲۸/جون ۱۹۰۹ء) ۱۳۲۷ھ

اخبار دبدبۂ سکندری ۲۲/جون ۱۹۰۹ء کو ایک تحریر ''فیصلہ حضرات علماء کرام اہل اسلام دربارہ مسئلہ حیات وممات حضرت مسیح علیہ السلام'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ جس کے آخر میں علماء امروہہ، مرادآباد، رامپور، بسولی، دیوبند، سہارنپور، کاندھلہ، میرٹھ، دہلی، امرتسر، سیالکوٹ، جونپور کے علماء کے دستخط ہیں۔ ذیل میں فیصلہ کی تحریر اور دستخط کنندگان کے نام لکھے جاتے ہیں۔

۱۵، ۱۶، ۱۷/جون ۱۹۰۹ء کو مباحثہ

بموجودگی نواب صاحب رامپور یہ مباحثہ مجمع عام میں ہم لوگوں کے سامنے تواریخ مذکورہ میں ہوا۔ جماعت اہل اسلام کی طرف سے جناب مولانا مولوی ابوالوفا محمد ثناء اللہ صاحب مولوی فاضل امرتسری مناظر مقرر ہوئے (پہلے دن جماعت قادیانی کے مولوی محمد احسن صاحب نے ایک تحریر پڑھی جس پر اعتراضات ہوئے) مگر دوسرے تیسرے روز جماعت قادیانی کی طرف سے منشی قاسم علی صاحب

دہلوی نے تحریر پڑھی وفات مسیح علیہ السلام کے متعلق جتنے دلائل قادیانی جماعت کی طرف سے پیش ہوئے اسلامی مناظر نے ایک ایک کا جواب بڑی خوبی سے دیا، نمایاں طور پر حیات مسیح علیہ السلام کو ثابت کر دیا۔ **فجزاه الله عنّا و سائر المسلمين خيراً** ۔اس بحث سے شکستہ خاطر ہو کر قادیانیوں کو دوسرے مسئلہ (نبوت مرزا قادیانی) پر باوجود قرارداد و وعدۂ بحث کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لہٰذا وہ دوسرا مسئلہ پیش کئے بغیر خود بخود چلے گئے۔ **الحمد الله على ذلك صدق الله العلى العظيم جاء الحق و زهق الباطل انّ الباطل كان زهوقا.**

(مولوی) محمد عبدالغفار رامپوری، (مولوی) محمد لطف اللہ (ابن مفتی سعد اللہ رامپوری)، (مولوی) محمد اعجاز حسین وکیل رامپوری، (مولوی) محمد فضل اللہ رامپوری، (مولوی) محمد بشیر احمد مدرس اول مدرسہ انوار العلوم رامپور، (مولوی) محمد اسلم، (مولوی) فضل حق رامپوری مدرس اول مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) افضال الحق رامپوری، (مولوی) محمد نبی رامپوری، (مولوی) مرتضٰی حسن چاند پوری مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند، (مولوی) ابراہیم سیالکوٹی، (مولانا) محمود حسن مدرس اول مدرسہ اسلامیہ دیوبند، (مولانا) عبدالرحمٰن مدرس اول مدرسہ شاہی مراد آباد، (مولوی) محمود حسن سہوانی مدرس دوم مدرسہ شاہی مراد آباد، (مولانا) محمد اشرف علی تھانوی، (مولانا) احمد حسن امروہی مدرس اول مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ، (مولوی) محمد امین مدرس مدرسہ جامع مسجد امروہہ، (مولوی) رضا حسن مدرس مدرسہ امروہہ، (مولوی) عبدالرؤف امروہی (ابن مولانا سید رافت علی)، (مولوی) محمد شفیق احمد امروہی، (مولوی) محمد معظم حسنین امروہی، (مولوی) محمد سلیم سکندر پوری مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) سید محمد شاہ (محدث) رامپوری، (مولوی) سید حامد شاہ رامپوری، (مولوی) محمد منور علی (محدث رامپوری) مدرس درجہ حدیث مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) محمد طیب عرب، (مولوی) محمد قیام الدین جونپوری، (مولانا) محمد سہول بھاگلپوری مدرسہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند، (مولوی) محمد ابراہیم دہلوی، (مولوی) محمد قدرت اللہ مدرس مدرسہ شاہی مراد آباد، (مولانا) خلیل احمد (محدث) سہارنپوری

مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، (مولوی) محمد عاشق الٰہی میرٹھی، (مولوی) محمد یحییٰ مدرس دوم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (والد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، (مولوی) محمد اسماعیل انصاری امروہی، (مولوی) سید بدر الحسن امروہی، (مولوی) سردار احمد امروہی، (مولانا) محمد خلیل اللہ محدث مقیم رامپور، (مولوی) احمد امین مدرس دوم مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) احمد نور مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) غلام رسول مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) صاحبزادہ محمد الطاف المعروف میاں جاں خاں رامپوری، (مولوی) معز اللہ خاں مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) محمد یوسف (مقیم رامپور)، غلام رحمانی (مقیم رامپور)، (مولوی) سید سجاد علی بسولوی (مقیم رامپور)، (مولوی) وزیر محمد خان مدرس مدرسہ عالیہ رامپور، (مولوی) محمد فضل کریم مقیم رامپور، (مولوی) دیانت حسین مقیم رامپور، (مولوی حافظ) عبد الغفار دہلوی، (مولانا) حافظ نور الدین احمد دہلوی۔

نواب رامپور نے اس مناظرہ کا جو فیصلہ دیا ہے اس کو مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ''صحیفۂ محبوبیہ'' اور الہامات مرزا کے آخر میں درج کیا ہے۔ اس کو بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''رامپور میں قادیانی صاحبوں سے مناظرہ کے وقت مولوی ابوالوفاء محمد ثناء اللہ صاحب کی گفتگو ہم نے سنی، مولوی صاحب نہایت فصیح البیان ہیں اور بڑی خوبی یہ ہے کہ برجستہ کلام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جس امر کی تمہید کی اسے بدلائل ثابت کیا۔ ہم ان کے بیان سے محظوظ و مسرور ہوئے۔''

(محمد حامد علی خاں والی ریاست رامپور)

آثار شیخ الہندؒ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کی ذات والا صفات تعارف سے مستغنی ہے، آپ کی حیات مبارکہ پر متعدد کتابیں اور رسائل لکھے جا چکے ہیں جس سے آپ کی دینی، ملّی، تعلیمی اور

روحانی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ان میں سے چند مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) سفر نامہ اسیر مالٹا — مؤلفہ شیخ الاسلام مولانا سید حسینؒ احمد مدنی

(۲) حیات شیخ الہند — مؤلفہ مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دیو بندیؒ

(۳) تذکرہ شیخ الہند — مؤلفہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری

(۴) شیخ الہند مولانا محمود حسن — مؤلفہ ڈاکٹر اقبال حسن خاں استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۵) اسیران مالٹا — مؤلفہ مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ

(۶) تحریک شیخ الہند — مرتبہ مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ

(۷) ذکر محمود — مؤلفہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

علاوہ ازیں نقش حیات مولفہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، علماحق مؤلفہ مولانا سید محمد میاںؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی ڈائری اور خلافت و جمعیۃ کی طرف سے شائع ہونے والے خطبات و رسائل میں بھی آپ کے سیاسی اور مذہبی کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی تالیف ''تحریک خلافت'' میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر خیر کئی جگہ آیا ہے جس سے حضرتؒ کی بلند نظری، دل سوزی نیز اسلام دوستی اور انسانیت نوازی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ حضرتؒ کی زندگی کے اب بھی بہت سے گوشے تقاضا کر رہے ہیں کہ ان پر روشنی ڈالی جائے۔ حضرت والا کے مکتوب بھی بہت کم مرتب ہو سکے ہیں اور ابھی وقت ہے کہ ہند و بیرون ہند میں حضرتؒ کی جتنی بھی تحریریں ہیں، حضور صاً مالٹا سے روانہ کیے ہوئے گرامی نامے تلاش و جستجو سے حاصل کیے جائیں۔

میں اس وقت حضرت شیخ الہندؒ کے چھ مکتوبات ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں، یہ مکتوبات مجھے حکیم محمد عمر صاحب مراد آبادی زید مجدہم نبیرۂ حکیم محمد صدیق صاحب قاسمیؒ مراد آبادی سے ملے ہیں تھوڑی سی تشریح وتوضیح اور فٹ نوٹ کے ساتھ ان خطوط کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ان خطوط کو پیش کرنے سے پہلے مناسب خیال کرتا ہوں کہ حضرتؒ کے سفر حجاز اور اسارت مالٹا کے چیدہ چیدہ واقعات

تحریر کر دیے جائیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۳۳۳ھ میں زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کیا لیکن اس خیال سے کہ اگر آپ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو اس سفر کی اطلاع ہوگئی تو ہزار ہا آدمی زیارت اور خدمت کے لئے حاضر ہوں گے اور ان کی یہ تکلیف آپ کو گوارا نہ تھی، اس لئے آپ نے چند خاص لوگوں کے سوا کسی پر اپنا یہ ارادہ ظاہر نہ فرمایا یہاں تک کہ روانگی میں بہت تھوڑے دن باقی رہ گئے اور لوگوں کو کسی نہ کسی طرح خبر ہونے لگی جس کو خبر ہوتی وہ دیوبند حاضر ہوتا تقریباً روانگی سے ایک ہفتہ پیشتر روزانہ مکان پر سو پچاس مہمانوں کا ہجوم ہونے لگا اور عین روانگی کے دن سیکڑوں آدمی دیوبند اور دہلی کے درمیانی اسٹیشنوں پر بھی آ کر ملنے گئے۔ دہلی کے اسٹیشن پر ایک بڑا مجمع ساتھ تھا اسی درمیان میں نہ معلوم کس نے اور کس طرح یہ شہرت اڑادی کہ مولانا ہجرت کر کے تشریف لیے جا رہے ہیں اس خیال سے بہت سے خادم بے چین ہو گئے اور حضرت سے دریافت کیا کہ کیا حضور والا ہجرت کی نیت سے تشریف لیے جا رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ نہیں بھائی میں نے ہجرت کی نیت نہیں کی ہے ہاں ایک سرسری خیال دل میں ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو کچھ عرصہ تک خانۂ خدا کی جاروب کشی اور روضہ مطہرہ کی خاک بوسی سے مشرف رہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس ارادے اور خیال سے کب تک قیام کروں گا کیوں کہ مستقبل میں آب و ہوا کی موافقت یا مخالفت، اسباب کی مساعدت یا نامساعدت کا علم کسی کو نہیں خدا جانے کیا ہو۔

سفر حجاز میں مولانا عزیر گل صاحب[1] مولانا حاجی خان محمد صاحب، سید ہادی حسن خاں صاحب

---

[1] آپ کا آبائی وطن زیارت کا کا صاحب، ضلع پشاور تھا۔ والد ماجد درگئی میں رہتے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے اساتذہ سے حاصل کی، پھر دیوبند آگئے اور دارالعلوم کے طالب علم بنے اور حضرت شیخ الہند کے خادم خاص بن گئے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سفرنامہ اسیر مالٹا میں آپ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

''مولانا عزیر گل صاحب حضرت شیخ الہند کے خادم خاص ہیں۔ (تحریک آزادی) کے مشن کے ابتداء سے ممبر رہے اور نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے، صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیم انھوں نے انجام دیں۔ عموماً شیخ الہندؒ ان کو پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کو پاس بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گذار اور خطرناک راستوں کو قطع کر کے نہایت رازداری اور ہمت و استقلال کے ساتھ بار بار آتے جاتے رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

خان جہاں پوری اور مولانا وحید[1] احمد برادرزادہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ساتھ تھے۔ دہلی سے روانگی کے بعد آپ نے ایک شب و روز رتلام میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد سورت اور اس کے اطراف میں قیام فرما کر بمبئی پہونچے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ، مولانا مفتی محمد سہول صاحب بھاگل پوریؒ، مولانا مطلوب الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی، مولانا محمد میاں صاحبؒ عرف منصور میاں نواسۂ حضرت نانوتویؒ بھی بارادۂ حج بیت اللہ بمبئی پہنچ گئے تھے۔ تمام قافلہ بمبئی سے حج کے لئے روانہ ہوا اور مکہ معظّمہ پہنچا۔ حج سے فراغت کے بعد یہ قافلہ مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ غالباً شعبان ۱۳۳۴ھ میں شریف مکہ نے سلطان المعظم سے بغاوت کی اور مکہ معظّمہ کے اطراف میں لڑائی شروع ہوگئی۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ہندوستان چھوڑے ہوئے ایک سال گزر گیا تھا۔ سال بھر کے بعد جب حضرت مولانا خلیل احمد محدث

(بقیہ سے آگے) پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی اور علماء سرحد و یاغستان اور دیگر خوانین کو آپ نے مشن کا ممبر بنایا۔ ان کے پاس پیغام اور خطوط پہونچانا، ان کو ہموار کرنا، ان کا اور مولانا عبید اللہؒ (سندھی) صاحب کا فریضہ تھا جن کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی مگر انھوں نے کبھی اس کو پتا چلنے نہیں دیا۔ مالٹا سے واپس آکر آستانہ شیخ الہندؒ پر مقیم ہوگئے۔ دیوبند کی خلافت کمیٹی کے صدر ہوئے بعدہٗ مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس منتخب ہوئے۔ رڑکی میں تقسیم ہند سے ۲ سال پہلے تک مقیم رہے۔

عبد الرحمٰن نامی ایک شخص نے "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں مولانا عزیر گل کو جاسوس لکھا ہے۔ یہ سراسر بہتان اور ناخدا ترسانہ افترا ہے۔ اسیران مالٹا میں سے صرف مولانا عزیر گل صاحب اب تک حیات ہیں (فریدی)

جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو مولانا عزیر گل صاحب بقید حیات تھے۔ تحریک شیخ الہند کی آخری یادگار، مجاہد حریت کا ۱۴ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنے وطن "میاں گاؤں کیل" سخاکوٹ آزاد قبائل پاکستان میں وصال ہوگیا۔ (محب الحق)

[1] مولانا وحید احمد مدنیؒ ابن مولانا سید صدیق احمد مدنیؒ فیض آبادی مہاجر مدینہ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے برادرزادے تھے۔ آپ بھی اسیران مالٹا میں سے ایک نوجوان اسیر تھے۔ مولانا سید محمد میاںؒ رقم طراز ہیں۔ حافظہ قوی تھا۔ مالٹا میں اور مالٹا کے علاوہ جن ساتھیوں کے ساتھ رہنا ہوا ان کی زبان سیکھ لی۔ عربی اور اردو مادری زبانیں تھیں، فارسی اور انگریزی سبقاً حاصل کیں۔ ترکی، فرانسیسی مالٹا کے مصاحبین سے پشتو، بنگلہ اور کچھ دوسری زبانیں احباب کی مجلسوں میں۔ اس طرح ہفت زبان نہیں بلکہ شاید دہ (۱۰) زبان ہوگئے تھے۔ مالٹا سے واپس ہوکر ہندوستان کی سکونت اختیار کرلی۔ "رسالہ جمیل مظفر نگر" کے مدیر رہے۔ دار العلوم دیوبند میں معین مدرس ہوئے۔ تحریک آزادی ہند میں پورا پورا حصہ لیتے رہے۔ آخر میں مدرسہ عزیزیہ بہار کے صدر مدرس ہوئے۔ اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ۴۵ سال کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔ (اسیران مالٹا ۳۰۶) (فریدی)

سہارنپوریؒ ہندوستان لوٹے تو نینی تال میں ان کو نظر بند کر دیا گیا، اور وہاں ان سے بیانات لئے گئے۔ ان کے علاوہ مولانا مسعود احمد صاحبؒ جو حضرت شیخ الہندؒ کے داماد اور بھانجے تھے الہ آباد بھیج دئے گئے۔ وہاں ان کو ایک مہینہ تک روکا گیا اور ان سے بیان لیا گیا۔ مولانا حافظ محمد جلیل صاحبؒ کیرانوی کو دیوبند سے پولیس افسر آ کر لے گیا اور ان سے بیان لیا گیا۔ ان کے علاوہ حکیم عبدالرزاق صاحبؒ انصاری، مولانا محمد شفیع صاحبؒ مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی (داماد حضرت شیخ الہندؒ) مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ (برادر حقیقی حضرت شیخ الہندؒ) مولانا محمد محسن صاحبؒ (برادر حقیقی حضرت شیخ الہندؒ) مولانا ظہور محمد صاحبؒ مدرس مدرسہ رڑکی، مولانا محمد حسین صاحبؒ (راندیر) حافظ امداد حسین صاحبؒ (رڑکی)، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ قایم مقام صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مدرس دارالعلوم، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری، مولانا نواب محی الدین احمد خاںؒ فاروقی مرادآبادی قاضی بھوپال سے بھی بیانات لئے گئے۔

حضرت مولانا کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادگیوں کے بیانات بھی ایک افسر نے حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر حاضر ہو کر لئے۔ اس سلسلے میں جن حضرات کی خانہ تلاشی لی گئی وہ یہ ہیں:- حکیم عبدالرزاق صاحبؒ انصاری دہلی، حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی، سید نورالحسن صاحب رئیس رتھیڑی ضلع مظفرنگر، سید ہادی حسن صاحب خان جہانپور ضلع مظفرنگر، مولانا محمد حسین صاحبؒ راندیر، مولانا احمد اللہ صاحبؒ پانی پتی (جن کو نظر بند بھی کر دیا گیا تھا) مولانا عبدالحنان صاحبؒ کی بھی خانہ تلاشی ہوئی اور بیان لے کر نظر بند رکھا گیا ادھر نظر بندی اور اظہار و بیان کا سلسلہ جاری تھا، ادھر شریف مکہ کو انگریزوں نے آلہ کار بنا کر حضرت شیخ الہندؒ کو مع ہمراہیان گرفتاری کا حکم دیا اور جدہ بلا لیا حضرت مولانا کی گرفتاری کے بعد مکہ کے تمام مسلمان بے چین ہو گئے اور سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد شریف مکہ کے پاس پہنچا کہ مولانا کو کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟ شریف مکہ نے جواب میں کہا کہ مولانا کو انگریز گورنمنٹ نے طلب کیا ہے اور وہ اسی کی رعایا ہیں اسی لیے ہم ان کو گورنمنٹ انگریزی کے حوالے کیے دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا

کہ مکہ معظمہ کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے کہ کسی با اختیار مسلمان حاکم نے مکہ معظمہ سے کسی کو گرفتار کر کے کسی غیر مسلم حکومت کے حوالے کیا ہو اگر آپ نے ایسا کیا تو تاریخ عرب کے اوراق میں قیامت تک حرم خداوندی کی توہین آپ کی طرف منسوب رہے گی۔

حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے مع ہمراہیاں جدہ بھیجا گیا اور وہاں سے قاہرہ (مصر) روانہ کر دیے گیے۔ اور قاہرہ سے جزیرہ مالٹا (یوروپ) میں جنگی قیدیوں کی کیمپ میں رکھے گے۔ مالٹا سے جو خطوط آپ بھیجتے تھے ان پر سینسر کی مہر ضرور ہوتی تھی، اور خط روانگی سے بیس پچیس دن کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا اسم گرامی کے ساتھ حضرت مولانا نمبر ۲۲۱۹ تحریر فرماتے تھے جو اسیری نمبر ہو گا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری صفر ۱۳۳۵ھ میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے حجاج واپس آچکے تھے۔ قاہرہ سے خط آنے کے بعد گرفتاری کی خبر بجلی کی طرح پھیل گئی اور عوام وخواص میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی، چنانچہ اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع ہوا اور استفسارات ومطالبات غرض مختلف قسم کے مضامین شائع ہوئے خاص طور پر مندرجہ ذیل اخبارات نے اس بارے میں مضامین لکھے ۔ صداقت کلکتہ، جمہور کلکتہ، نئی روشنی الہ آباد، مساوات الہ آباد، مشرق گورکھپور، ہمدم لکھنو، مدینہ بجنور، الخلیل بجنور، خطیب دہلی، الصباح لاہور، (ماخوذ از مختصر سوانح شیخ الہندؒ وحالات اسیری شائع کردہ انجمن نظر بندان اسلام، دہلی)

سید محبوب رضوی مرحوم مؤلف تاریخ دارالعلوم دیوبند نے حضرت شیخ الہندؒ کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

۱۳۳۴ھ کا پورا سال حرمین شریفین میں گذرا۔ اوائل ۱۳۳۵ھ میں واپسی متوقع تھی کہ اچانک معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو برطانوی گورنمنٹ نے شریف حسین کے ذریعہ گرفتار کروا کر اولاً قاہرہ اور پھر مالٹا بھیج دیا۔ اس افسوس ناک حادثہ سے ہندوستان کے مسلمانوں اور دارالعلوم دیوبند اور حضرت کے متوسلین کو خصوصاً قلق واضطراب ہونا لازمی تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور مسلمانوں کی جانب سے حضرت کی رہائی کے لئے ہر ممکن سعی کی گئی اور کوئی موثر طریقہ اٹھا نہیں رکھا گیا مگر بے نتیجہ رہا۔ ۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو

علمائے دار العلوم دیوبند کا ایک مقتدر وفد بسر کردگی حضرت مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دار العلوم دیوبند، صوبہ متحدہ کے گورنر سے ملا اور تحریری عرضداشت پیش کی، مگر سوائے زبانی اظہار ہمدردی کے آخر تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو مالٹا میں جنگی قیدیوں کے ساتھ سوا تین سال تک نظر بند رکھا گیا۔

۲۲؍ جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الہندؒ اپنے رفقاء کے ساتھ فوجی نگرانی میں مالٹا سے ہندوستان کے لئے روانہ کئے گئے۔ سیدی بشر اور سویز میں رکھا گیا۔

۵؍ رمضان المبارک کو سویز سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ ۲۰؍ رمضان کو جہاز بمبئی پہنچا، بمبئی کی خلافت کمیٹی نے نہایت پرجوش استقبال کیا۔ ۲۳؍ رمضان تک بمبئی میں قیام فرما کر ۲۵؍ رمضان کو دہلی تشریف لائے۔ ۲۶؍ رمضان کی صبح کو دہلی سے دیوبند کے لئے روانگی ہوئی اور نو بجے اسٹیشن دیوبند پر رود فرمایا۔ راستہ میں مشتاقان زیارت کا بے پناہ ہجوم اسٹیشنوں پر تھا۔ دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہجوم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری کی نسبت روداد میں درج ہے کہ اس سال کے سب سے مبارک اور روشن حالات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کا قریب پانچ سال کی غیبت کے بعد مصر، قاہرہ، اور اس کے بعد جزیرہ مالٹا میں نظر بندی کا زمانہ گذار کر مراجعت فرمائے۔ ہندوستان اور اپنے وطن خاص دیوبند میں رونق افروز ہونا ہے۔ دیوبند میں جس خلوص، جوش اور مسرت کے ساتھ شاندار استقبال ہوا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کی آنکھوں نے وہ مبارک نقشہ دیکھا ہے۔ اسٹیشن سے اولاً حضرت مدرسہ میں تشریف لائے۔ دار الحدیث کے سب سے بڑے غیر مسقف کمرے میں تخت پر تشریف فرما ہوئے اور ہر طرف مشتاقان زیارت حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا اور تمام مجمع نے دیر تک دعا مانگی۔ اس کے بعد مولانا مدرسہ کے دار المشورہ میں تشریف فرما ہوئے اور یہاں پر تھوڑی دیر قیام فرمایا اور یہاں سے مکان تشریف لے گئے۔

۱۳۳۹ھ شروع ہی ہوا تھا کہ ربیع الاول میں حضرت ممدوح کی وفات کا قیامت خیز سانحہ پیش آ گیا مالٹا سے واپسی پر چند ضروری اسفار پیش آ گئے عید الاضحیٰ ۱۳۳۸ھ کے بعد سے علالت کا سلسلہ شروع

ہو گیا تھا۔ دیوبند کے اطباء کا علاج ہوتا رہا جن میں آپ کے برادر خورد حکیم محمد حسن صاحب بھی تھے اس زمانۂ علالت میں علی گڑھ کا ایک وفد اس غرض سے حضرت کی خدمت میں آیا تھا کہ جامعہ ملیہ کا افتتاح آپ کے ہاتھوں سے کرایا جائے۔ خدام اور متوسلین آپ کے مرض کی شدت کی وجہ سے سفر کے لیے مانع تھے لیکن آپ نے گوارہ نہ فرمایا کہ علی گڑھ کے ان حضرات کی عرضداشت کو رد فرمادیں اس حال میں کہ کروٹ تک خود نہ لے سکتے تھے عازم سفر ہو گئے متعدد خدام ساتھ ہوئے۔ علی گڑھ کے سفر میں اضمحلال بڑھ گیا اور دیوبند پہنچنے کے بعد حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی، بالآخر دہلی پہنچایا گیا۔ حکیم محمد اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے علاج شروع کیا۔ یوم وفات سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ طبیعت زیادہ علیل ہے۔ دیوبند کے بہت سے حضرات دہلی پہنچ گئے۔ ۱۸ر ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی، واقع دریا گنج میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ دیوبند لایا گیا۔ راستہ میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر بڑی بڑی جماعتوں نے نماز جنازہ پڑھی اگلے دن صبح کو دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں نماز جنازہ ادا کر کے بہ ہزار غم والم اس گنجینۂ علم کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔

مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ مدرس دارالعلوم کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے:

کیا کبھی مرتے ہیں اللہ پہ مرنے والے
لوح محفوظ پہ ہے ثبت دوام محمود

آپ مامور من اللہ تھے بہر تبلیغ
شاہد عدل ہے تاثیر پیام محمود

پئے دنیائے دنی ایک قدم بھی نہ اُٹھا
راہِ حق میں ہی اُٹھا جب اُٹھا گام محمود

دور تھا ساغر تحدیث کا ہر شام و پگاہ
واہ، واہ صلی علیٰ شُرب مدام محمود

ان کے شاگرد ہیں پھیلے ہوئے دنیا بھر میں
واقعی زندہ جاوید ہے نام محمود

بولتے کچھ نہیں اور لب پہ تبسم ہے عیاں
موت ہے؟ یقظہ ہے؟ یا ہے یہ منام محمود

سال رحلت یہ ہوا غیب سے دل میں القاء
خلد اعلیٰ طرب افزا ہے مقام محمود

۱۳		ھ		۳۹

اب میں حضرت شیخ الہندؒ کے چھ غیر مطبوعہ مکتوبات پیش کرتا ہوں۔ ان میں پہلا مکتوب مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادیؒ کے نام ہے جو ۲/اپریل ۱۹۱۱ء کو مرادآباد پہنچا ہے۔ اس خط کی روانگی انبالہ سے ہوئی ہے دیوبند میں لکھا گیا ہے۔ معلوم نہیں کس مصلحت سے ایسا کیا گیا ہے اس میں کوئی اہم بات نہیں ہے لیکن انبالہ اور پٹنہ حضرت کی مجاہدانہ مساعی کے دو مرکز تھے۔

دوسرا مکتوب گرامی نواب محی الدین احمد خاں فاروقی مرادآبادیؒ، قاضی بھوپال متوفی ۱۳۴۷ھ کے نام ہے جو نواب عظمت اللہ خاں کی نسل سے تھے اور حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید تھے اور جن کا خاندان ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوا تھا۔ جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں اور اس خاندان کے چند افراد کو تختہ دار پر بھی چڑھایا گیا تھا، گورنمنٹ برطانیہ کی سی آئی ڈی نے بھی اپنی رپورٹ میں نواب صاحب کا ذکر کیا ہے۔ نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ کو یہ خط ۱۴/اگست ۱۹۱۴ء کو دیوبند سے لکھا گیا ہے جو ۱۶/اگست ۱۹۱۴ء کو بھوپال پہنچا ہے۔ اس مکتوب گرامی میں رئیسہ بھوپال اور منشی منصب علی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر حجاز کے عنوان سے جو سفر درپیش ہے اس سلسلے کی ایک کڑی نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ بھی ہیں اور ان کے عہدۂ قضا سے بھی اس معاملہ میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اس مکتوب کا آخری جملہ بتا رہا ہے کہ حضرتؒ کو اس زمانے میں اپنے پروگرام کی بڑی فکر تھی اور اس میں گویا مستغرق تھے۔ کہیں جانا چاہتے ہیں مگر نہیں جا سکتے، وہ یاغستان ہو، حجاز مقدس ہو یا استنبول ہو ”صرف دیوبند میں ہوں“ یہ جملہ بہت ہی معنی خیز ہے۔

تیسرا مکتوب گرامی مولانا حکیم محمد صدیق قاسمیؒ مرادآبادی کے نام ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ یہ ۱۴/اپریل ۱۹۱۵ء کو دیوبند سے بھیجا گیا ہے جو ۱۵/اپریل ۱۹۱۵ء کو مرادآباد پہونچا ہے۔

چوتھا مکتوب گرامی بھی نواب محی الدین احمد خاں فاروقی مرادآبادیؒ کے نام ہے یہ مکتوب بھی بہت اہم ہے، یہ ۲۵/ستمبر ۱۹۱۵ء کو عدن کے ڈاکخانہ سے چلا ہے اور بمبئی میں اس پر سینسر کی مہر لگائی گئی ہے۔ یہ خط ۶/اکتوبر کو شاہجہاں آباد بھوپال پہنچا ہے۔ اس خط کے آخر میں حضرت نے اپنا نام تحریر نہیں

فرمایا ہے اور کارڈ کی شکل میں بھیجا ہے۔ پھر بھی سینسر والوں نے اس خط کو بھانپ لیا ہے۔ غالباً مولانا عزیر گل کے نام سے کچھ سراغ مل گیا ہے۔

پانچواں مکتوب گرامی مالٹا سے روانہ کیا گیا ہے۔ یہ خط ذی الحجہ ۶ ۱۳۳ھ کو تحریر فرمایا گیا ہے۔ سرکاری لفافے پر جو مہریں ہیں ان کی تاریخ پڑھنے میں نہیں آئی۔ اس مکتوب کو بھی فرانسیسی زبان میں سینسر کیا گیا۔ اس پر پتا حسب ذیل ہے۔

''شہر مراد آباد۔ محلّہ بانس منڈی۔ مکان نواب شبیر علی خاں صاحب مرحوم بملاحظہ گرامی مکرمی رشید الدین خاں صاحب دام فیضہم''

رشید الدین خاں صاحب، نواب محی الدین احمد خاں فاروقی کے صاحبزادے تھے۔ کسی مصلحت سے یہ خط بجائے باپ کے بیٹے کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ مکتوب گرامی بھی بہت اہم اور تاریخی ہے اور جامعیت کا ایک مرقع ہے۔

چھٹا مکتوب گرامی مالٹا سے واپس آکر ہمشیرہ[۱] عبد القادر کو مراد آباد بھیجا گیا ہے۔ اس مکتوب میں فتح پور کا ذکر ہے۔ حکیم نصرت حسین کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کی اسارت مالٹا کے رفیق تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے رمضان المبارک کے آخر میں دیوبند پہونچ کر عید کے بعد یہ سفر کیا اس سفر سے مقصود حکیم نصرت حسین کے اعزا اور متعلقین کو تسلی دینا تھا۔

(مکتوب اول)

مخدوم ومطاعم زید مجدکم۔ بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے۔ یہاں بھی مرض موجود ہے اور سب طرف سے مرض کی خبریں آرہی ہیں، دعا فرمائیں خاں صاحب[۲] سلمہ کا حال جب سے آیا ہوں

---

[۱] حکیم محمد صدیق صاحبؒ مراد آبادی کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ حکیم صاحب کے ایک صاحبزادے محمد احسن صاحب کی عرفیت عبد القادر تھی۔ اسی بنا پر پتہ میں انھیں ہمشیرہ عبد القادر لکھا ہے۔ یہ خاتون حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھیں۔ (فریدی)

[۲] غالباً نواب محی الدین خاں فاروقی مراد ہیں۔ (فریدی)

معلوم نہیں ہوا امید کہ ان کی خیریت اور کیفیت سے جلد مطلع فرمایا جاؤں۔ سب کو سلام والسلام فقط بندہٗ محمود عفی عنہ دیوبند، جمعہ

پتہ اس طرح تحریر ہے:

مراد آباد محلّہ بغیابعالی خدمت مخدومی جناب مولانا حکیم محمد صدیق صاحب سلمہ مشرف باد، یہ خط یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو انبالہ[۱] سے چلا ہے اور ۲ راپریل کو مراد آباد پہنچا ہے۔

(مکتوب دوم)

المخدوم المحترم مد فیوضکم السلام علیکم۔

کل جناب کا خط پہنچا۔ آج دوسرا والا نامہ مولوی محمد فاروق صاحب[۲] کا لکھا ہوا موصول ہوا۔ رئیسہ[۳] یا منشی منصب علی صاحب کا کوئی خط نہیں پہنچا کئی روز ہوئے ایک خط بندہ نے جناب کی خدمت میں اس کے متعلق روانہ کیا تھا معلوم نہیں وہ پہنچا یا بیچ ہی میں رہ گیا۔ مخدوما! کتاب معلوم کی بابت ایک تو یہ امر ہے کہ یہ کتاب[۴] صحیح قابل اشاعت ہے یا غلط اور تلف کرنے کے لائق ہے تو یہ تو ممکن ہے کہ اس کے دو چار موقع دیکھ کر جو بالکل خلاف احکام شرع ہیں اور یقیناً اس میں موجود ہیں، اس کے اختفاء اور عدم اشاعت کا حکم لگا دیا جاوے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اول سے آخر تک اس کی اصلاح اور تصحیح کی جاوے تو یہ قصہ طویل اور محض بے سود اور سخت دشوار ہے شاید نئے سرے سے تالیف اس سے سہل ہو۔ تو ایک تو یہ

---

[۱] انبالہ میں مولانا محمد مبین دیوبندیؒ ایک مسجد کے خطیب تھے، غالباً انھیں سے ملنے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ تشریف لے گئے ہونگے۔ تحریک شیخ الہند میں ان کے متعلق گورنمنٹ برطانیہ کی سی آئی ڈی کا بیان یہ ہے،

''جنود ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے اگر چہ وہ مولوی خلیل احمد کا مرید ہے لیکن مولانا محمود حسن کے عرب جانے سے چھ ماہ پہلے ان کا سخت معتقد ہو گیا اس کی سازش کا ایک رکن بن گیا، دیوبند کی خفیہ میٹنگوں میں شریک ہوا کرتا تھا، مولانا محمود حسن کے سفر حجاز کے لئے میرٹھ، دہلی، راندیر، کلکتہ، رنگون وغیرہ سے رقوم جمع کی (تحریک شیخ الہند ۴۵۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز سے بہت پہلے انگریزوں کے خلاف اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

[۲] صاحبزادہ مولانا حکیم محمد صدیق صاحبؒ مرادآبادی۔ [۳] رئیسہ سے مراد سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال ہیں، جو قاضی نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادی کے واسطہ سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھیں۔ [۴] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون سی کتاب ہے

قصہ طے اور معلوم ہونا چاہیے دوسرے اس کام کے مناسب اور ہر طرح مفید اپنے جماعت کے اور حضرات ہیں ان کو اس کام میں بشاشت ضروری ہے آپ جیسے سلیم الصدر کی خدمت میں اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ اس کام کو احقر کی سپرد کرنے میں خدشات محقرہ ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے دیو بند میں سے میں کسی کی شرکت میں کام کرنے سے مجبور و معذور ہوں۔

اگر مولوی اشرف علی صاحب وغیرہ کسی کو لے کر مولوی حبیب الرحمٰن کو مُعین و کار پرداز کر دیا جائے تو سبحان اللہ نہایت ہی سہل صورت ہے، اور میں ایسے درجہ میں پہنچ گیا ہوں اور وقتاً فوقتاً پہنچتا جا رہا ہوں کہ کسی کام کی شرکت میں ہرگز مستقل نہیں ہوں صرف دیو بند میں ہوں، یہی تعجب ہے۔ مولوی محمد حسن[1] صاحب کو سلام۔ والسلام فقط۔ بندہ محمود

(مکتوب سوم)

ذو المجد والکرم دام ظلکم۔ بندہ محمود پس از تسلیمات مسنونہ عرض می نماید۔

نامہ سامی سرمایہ اعزاز شد حالت ضعف جناب پر ظاہر است کہ گنجایش سیر و سفر ندارد[2]۔ حق سبحانہ برحمت خود ذات سامی را تا دیر از حوادث دہر محفوظ داشتہ بر سر نیاز مندان سایہ گستر دارد۔

اصحاب مدرسہ بخیر ہستند مکرمی امیر شاہ خان صاحب[3] سہ چہار روز گذشت کہ بہ میرٹھ رفتہ بودمی فرمود کہ از میرٹھ بہ مراد آباد می رسم غالباً بخدمت رسیدہ باشند ورنہ عنقریب می رسند بہ مولوی محمد حسن صاحب

---

۱ مراد آباد میں اس نام کی دو مشہور شخصیتیں تھیں ایک مولانا قاضی محمد حسنؒ ساکن محلہ مغل پورہ، جو نواب محی الدین خاں فاروقیؒ کے بعد قاضی بھوپال رہے اور دیو بند کی مجلس شوری کے رکن تھے دوسرے مولانا محمد حسنؒ ساکن محلہ نواب پورہ تھے یہ دونوں حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ ۲ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حکیم صدیق مراد آبادیؒ نے حضرت شیخ الہند کے ساتھ سفر حجاز کا ارادہ کیا ہوگا ان کے مسلسل ضعف و نقاہت اور نابینائی کو پیش نظر رکھ کر حضرت نے یہ جملہ لکھا ہے۔ ۳ امیر شاہ خاں صاحب اکابر دیو بند سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور انکی حکایات بھی بہت یاد تھیں حضرت مولانا تھانویؒ نے ان سے نقل کی ہوئی روایتوں کو جمع کرا کے ''امیر الروایات'' کے نام سے شائع کرا دیا ہے گورنمنٹ برطانیہ کی سی آئی ڈی نے انکے متعلق یہ الفاظ تحریر کیے ہیں کہ ''امیر شاہ خاں کنور لیاقت علی خاں رئیس مینڈھو کا ملازم ہے جدہ کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے عبید اللہ (سندھی) نے جو خط لکھا ہے اس میں اس کا تذکرہ ہے''
تحریک شیخ الہند ص ۳۹۴

سلام برسانند معلوم نیست کہ تا کے مقیم وطن باشند۔ بہ جملہ متعلقین سلام از من برسد۔ والسلام فقط بندہ محمود عفی عنہ، (دیوبند سہ شنبہ)

(ترجمہ اردو) ذوالمجد والکرم دام ظلکم بندہ محمود وپس از تسلیمات مسنونہ عرض کرتا ہے کہ گرامی نامہ باعث اعزاز ہوا جناب کی ضعیفی بالکل ظاہر ہے وہ گنجایش سیر وسفر نہیں رکھتی ہے حق سجانہ وتعالیٰ اپنی رحمت سے ذات والا صفات کو تادیر حوادث زمانہ سے محفوظ رکھ کر ہم نیازمندوں کے سروں پر سایہ گستر رکھے اصحاب مدرسہ (دیوبند) خیریت سے ہیں۔ مکرمی امیر شاہ خان صاحب تین چار روز ہوئے میرٹھ گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میرٹھ سے مرادآباد پہونچوں گا۔ غالباً وہ آپ کی خدمت میں پہونچے ہوں گے۔

مولوی محمد حسن کو میرا سلام پہونچادیں معلوم نہیں کہ وہ کب تک مقیم وطن (مرادآباد) رہیں گے میری طرف سے تمام متعلقین کو سلام پہونچے۔ والسلام فقط بندہ محمود دیوبند سہ شنبہ

(مکتوب چہارم)

مطاع معظم السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

حضرت سے رخصت ہوکر مع الخیر ''عدن'' کے کنارہ آلگا سب رفقاء خیریت سے ہیں مولوی محمد حسن صاحب، مولوی محمد فاروق صاحب اور سب حضرات سے سلام مسنون عرض کر دیجیے مولوی سعیدالدین صاحب سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے عرصہ سے ملنا نہیں ہوا۔ ان سے سلام فرمادیں اور فرمادیجیے کہ چلنا ایسے وقت قرار پایا کہ کوئی صورت ملنے کی نہ ہوسکی میرے سب رفقاء سلام عرض کرتے

---

[1] گورنر یوپی نے مرکزی حکومت کے واسطے سے عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن کو جہاز سے اتارلو مگر تار دینے والے ڈاکٹر انصاری کے آدمی تھے انھوں نے تار دینے میں اتنی تاخیر کردی کہ جہاز عدن سے روانہ ہوگیا پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا کہ مولانا کو جہاز پر گرفتار کرلو'' جہاز سے اترنے نہ دو'' لیکن اس وقت گورنمنٹ حجاز کا انتظام یہ تھا کہ ''جدہ'' پہنچنے سے پہلے تمام حجاج کو ''جزیرۂ سعد'' میں اتارلیا جاتا تھا اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچایا جاتا تھا یہ تار کپتان کو اس وقت ملا کہ حضرت شیخ الہندؒ عام حجاج کے ساتھ جزیرۂ سعد میں اتر چلے تھے بہرحال گرفتاری کی کوششیں پیچھے پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہند اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے اسی طرح محفوظ ہوکر مکہ معظمہ پہنچ گئے (اسیران مالٹا بحوالہ نقش حیات) (فریدی)

ہیں جناب کو معلوم ہے کہ میرا چلنا ایسی عجلت میں ہوا کہ امور ضروریہ متعلقہ کا بندوبست پورا نہیں کر سکا اور ادھر دل چاہتا ہے کہ ہو سکے تو کچھ دن عرب میں گذار دوں اس لیے جناب میرے امور متعلقہ پر نظر فرما کر اگر کسی ذریعہ سے مجھے اطلاع دے سکیں تو ضرور مطلع فرمائیں' تاکہ میں یہ بات طے کر سکوں کہ عرب میں رہنے کی مجھ کو گنجائش ہے، یا مجھ کو جلد واپس ہو کر اپنے متعلقہ امور کی خبر لینی ضروری ہے آپ کی توجہ سے یہ بات حل ہو سکے تو بہتر ہے اور جناب بھی اپنے احوال سے مطلع فرمادیں تو موجب اطمینان ہو۔ ''عزیز گل'' سلام کے بعد طالب دعا ہیں مولوی سہول صاحب[۱] کا سلام۔

والسلام فقط

پتا یہ ہے:۔ ''ہندوستان، بھوپال ریاست خاص شاہجہان آباد، بخدمت عالی حضرت قاضی صاحب دام مجدکم''۔

(مکتوب پنجم)

نامۂ مبارک از مالٹا

عزیزم عالی قدر ذوالاشان دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بندہ معہ جملہ رفقاء کرام اللہ کے فضل اور احباب کی دعا سے اس بعید و بغیض دیار میں خیریت اور عافیت سے ہے......والحمدلله ثم الحمدلله.........مختلف اصحاب کے خطوط بندہ کے پاس آتے رہتے ہیں جن سے مکرمین اصحاب کی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے مگر مراد آباد سے کسی صاحب کا کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی نے اپنے خط میں ان کی خیریت تحریر کی اس لیے آپ حضرات کی خیریت معلوم ہونے کا بہت انتظار رہتا ہے۔ مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دیتا ہوں دیوبند سے برابر خطوط آتے رہتے ہیں مگر

---

۱ مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے۔ تذکرۃ الرشید میں بھی آپکا ذکر آیا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے کثرت سوال کی وجہ سے آپکو سئول فرمایا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ میں ہے مولوی محمد سہول نے دیوبند میں مولانا محمود حسن سے تعلیم حاصل کی وہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا مرید تھا، تکمیل درس کے بعد مولوی سہول نے دیوبند کے مدرسہ میں چند سال تک مدرس کی حیثیت سے کام کیا جس کے بعد وہ مدرسہ عالیہ عربیہ کلکتہ کے اسٹاف میں شامل ہو گئے جہاں اب وہ سینیر مدرس ہیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسن کے ہمراہ عرب چلے گئے تھے (تحریک شیخ الہند)۔ (فریدی)

کسی نے آپ صاحبوں کا کچھ تذکرہ نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس عرصہ میں آپ کے یہاں سے کوئی دیوبند نہیں گیا۔ چند ماہ گذرے ایک خط ہندوستان سے میرے پاس پہونچا خط اور طرز تحریر نیا تھا۔ شبہ ہوا کہ یہ خط کسی صاحب نے مراد آباد سے بھیجا مگر کوئی امر یقین دلانے والا نہ تھا۔ بہر حال اب آپ کو لکھتا ہوں کہ اپنی اور اپنے جمیع متعلقین کی خیریت سے مطلع فرمائیں اور سب کی خدمات میں درجہ بدرجہ سلام مسنون فرمادیں رضا[1] و شجاع[2] کیا پڑھتے ہیں۔ خدا کرے خریت سے ہوں۔ مدرستہ الغرباء[3] میں مہتمم اور اساتذہ کی خدمت میں سلام۔ مدرسہ امدادیہ میں اگر کوئی مدرس بندہ کے واقف بھی ہوں اور بندہ کو یاد دلانے سے سمجھ بھی جائیں تو سلام عرض کر دینا اور جملہ واقفین میں جس کو چاہو سلام پہنچا دینا میرے رفقاء آپ کی اور سب کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔

والسلام فقط محمود حسین ۲۲۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ (مطابق ۱۹۱۷ء)۔ مالٹا سینٹ کلیمنٹ براکس

(مکتوب ششم)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

تمہارا خط پہنچا، نہایت مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ سب کی خدمت میں میرا سلام درجہ بدرجہ پہنچا دینا۔ مجھے عید کی دوسری تاریخ کو فتح پور[4] جانے کی ضرورت تھی، اس

---

[1] نواب محی الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ کے بڑے لڑکے نواب معزالدین خاں تھے، نواب معزالدین خاں کے لڑکے کا نام عضد الدین عرف رضا میاں تھا۔ [2] نواب رشید الدین خاں، نواب محی الدین خاں فاروقی کے چھوٹے صاحبزادے تھے انکے دو لڑکے تھے ایک شجاع میاں اور دوسرے سلطان میاں (ماخوذ از مکتوب مولانا صلاح الدین نبیرہ مولانا محمد صدیق قاسمی مرادآبادیؒ)

[3] ''مدرستہ الغرباء'' مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کا اصلی اور قدیمی نام ہے [4] ''کوڑا جہان آباد'' ضلع فتح پور ہسوہ مولانا حکیم سید نصرت حسینؒ صاحب کا وطن تھا۔ مالٹا سے واپس آنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ان کے اعزا کو تسلی دینے کے لئے فتح پور پہنچے تھے مولانا حکیم نصرت حسینؒ نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اور حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے تھے۔ خاندانی زمیندار تھے اور ایک کامیاب طبیب تھے جس کی وجہ سے اپنے علاقہ میں باعزت تھے۔ حج بیت اللہ کے ارادے سے اپنے وطن سے روانہ ہوئے اور مکہ معظمہ پہنچے حضرت شیخ الہندؒ پہلے ہی مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے حکیم صاحب، حضرتؒ کے ساتھ ''مکہ معظمہ'' سے ''مدینہ منورہ'' پہنچے اور حضرت کے ساتھ ہی وہاں اقامت اختیار کر لی بالآخر حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق اسارت مالٹا ہوئے اور تادم آخر حضرت کے دامن سے وابستہ رہ کے مالٹا ہی میں ۹ / ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ کو وفات پائی مالٹا ہی میں قبر ہے قبر پر عربی زبان میں تاریخ وفات کندہ ہے۔ (فریدی)

لیے عزم کرتا ہوں کہ وہاں سے فارغ ہو کر پھر دیو بند آ جاؤں۔ باقی خیریت ہے سب گھر کے آدمی سلام کہتے ہیں۔ والسلام فقط بندہ محمود عفی عنہ

(کارڈ پر دیو بند کے ڈاکخانے کی مہر ۱۸ر جون ہے مراد آباد ۱۹ر جون کو پہنچا ہے۔)

خمخانہ قاسمی کا ایک جرعہ نوش

مولانا حکیم محمد صدیق صاحب قاسمی مراد آبادیؒ

مراد آباد میں مدرسہ شاہی سے بہت دور شہر کے ایک کنارے پر ایک محلہ ہے، جو محلّہ ''بغیہ'' کے نام سے مشہور ہے. شیخ الاسلام حضرت مدنی مدظلہ جب کبھی مراد آباد تشریف لاتے ہیں، تو اسی محلے کے ایک قدیم طرز کے مکان میں قیام پذیر ہوتے ہیں، حتی کہ چند گھنٹے کے لئے بھی مراد آباد میں ورود مسعود ہوتا ہے، تو سامان سفر، اسی مکان میں پہنچا دیا جاتا ہے. اس مکان کے مکین کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا تھا، ان کے نام کے مکتوب بھی ''لطائف قاسمیہ'' میں میری نظر سے گذرے تھے، لیکن تفصیلی حالات معلوم نہ تھے. حکیم محمد عمر صاحب مراد آبادی نبیرۂ حضرت مولانا محمد صدیق قاسمیؒ سے چند ماہ ہوئے، اس غرض سے ملاقات کے لئے گیا کہ وہ اپنے دادا کے سوانح سے مجھے مطلع فرمائیں، انھوں نے از راہ کرم حضرت مولاناؒ کے غیر مطبوعہ ''دیوان فارسی'' اور ایک مختصر مجموعہ کلام اردو کی زیارت کرائی اور اس دیوان فارسی پر جو مقدمہ ان کے والد ماجد مولانا محمد فاروق صاحب مراد آبادیؒ کا ہے، وہ بھی دکھایا. اس میں سوانح بھی ہیں اور حضرتؒ کے طبی کمالات اور کلام فارسی پر سیر حاصل تبصرہ بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے ان غیر مطبوعہ مکتوبات کی زیارت بھی کرائی، جو قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ وغیرہم اکابر کے قلم مبارک سے لکھے ہوئے محفوظ رکھے ہیں۔

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا تو شیخ الاسلام حضرت مدنی بقید حیات تھے۔ ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۷۷ھ کو آپ کی وفات ہوئی۔ ۱۲، ۱۳ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ موافق ۵، ۶ دسمبر ۱۹۵۷ء کی درمیانی شب میں اس خزینۂ علم و معرفت کو قبرستان قاسمی دیو بند میں سپرد رحمت کر دیا گیا۔ (محب الحق)

ان مکتوبات میں سے چند مکتوب تو پھر کسی موقع پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرونگا، اس وقت مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا قاسمی مرادآبادیؒ کے حالات زندگی، ان کے کمالات اور خصوصیات کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالوں. اور مدیر رسالہ ''دارالعلوم'' کی فرمائش پر ان کی خدمت میں برائے اشاعت روانہ کردوں۔ اس مضمون کا ماخذ حضرت مولانا محمد فاروق مرادآبادیؒ کا ''مقدمہ دیوان فارسی'' ہے. میں عالی جناب حکیم محمد عمر صاحب مدظلہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ انھوں نے کئی مرتبہ اپنا قیمتی وقت اپنے دادا کے علمی تبرکات دکھانے میں صرف کیا۔ ایک مطبوعہ مجموعہ قصائد'' گلستان مناقب'' بھی برائے مطالعہ مجھے عنایت کیا اور مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے ایک حقیر طالب علم کے ذوق جستجو کی رہنمائی فرمائی۔

اب آپ قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایک باکمال شاگرد اور خلیفہ کے کچھ حالات وسوانح ملاحظہ فرمائیں۔

نام ونسب:

مولانا حکیم محمد صدیق صاحب قاسمیؒ صدیق اور قاسمی تخلص، تاریخی نام آپ کا مظہر حسن۔ ۲۰رذیقعدہ ۱۲۶۳ھ یوم چہارشنبہ (۱۶راپریل ۱۸۴۷ء) کو ولادت ہوئی۔

آپ کے والد ماجد کا اسم مبارک مولانا محمد امین الدین ہے۔ آپ نسباً صدیقی ہیں، آپ کے اجداد فتنہ چنگیز خانی میں'' تبریز'' سے ہندوستان آئے، بزرگوں کا وطن مرادآباد آنے سے پیشتر'' گڑھ مکتیسر'' تھا جہاں حضرت خواجہ اللہ بخش گڑھ مکتیسریؒ کا مزار مبارک ہے، آپ حضرت گڑھ مکتیسریؒ کی ہمشیرہ مسماۃ جیابی بی کی اولاد میں تھے۔

اس لحاظ سے آپ حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کے خواہرزادے ہوتے ہیں۔

شاہجہاں کے عہد میں آپ کے بزرگ مرادآباد آئے۔ اجداد میں قدیم سے علم وفضل اور فن سپہ گری کا اجتماع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے صرف علم باقی رہ گیا۔

ابتدائی تعلیم:

ابتدائی تعلیم فارسی اپنے والد ماجد سے پائی، نیز میر بشارت علی سنبھلی اور مولوی محبوب علی صاحب (سنبھلی دروازے والے) سے فارسی اور دینیات پڑھی۔ (مولوی محبوب علی فریدیانِ رجب پور سے تھے)

آپ نے اپنے نانا حکیم محمد عطاء حسین صاحب کے ظلِ عاطفت میں پرورش وتربیت پائی۔ حکیم محمد عطاء حسین مراد آباد کے بڑے نامی گرامی طبیب ونباض تھے۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک لڑکی' مولانا محمد صدیق صاحبؒ کی والدہ تھیں۔ جب مولانا محمد صدیق صاحبؒ پیدا ہوئے تو ننہیال میں بڑی خوشیاں ہوئیں اور نانا نے اپنے نواسے کو متبنیٰ بنا کر نہایت ناز ونعم کے ساتھ پالا۔ حکیم محمد عطاء حسین صاحب اور ان کے والد حکیم حفیظ الدین صاحب نے مولانا محمد صدیق صاحبؒ کو ان کی کم سنی ہی سے فن طبابت سکھانا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو شروع ہی سے حافظہ، ذہن، ذکاوت اور سلامت فہم منجانب اللہ غیر معمولی طور پر عطا کئے گئے تھے، حاذق حکماء کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیا۔ آپ کے نانا اور مشہور طبیب حکیم محمد نثار علی صاحب امروہیؒ کے درمیان بہت خلوص اور اتحاد تھا، جب کبھی حکیم صاحب امروہیؒ مراد آباد تشریف لاتے تو اپنے دوست کے ہونہار نواسے کو بلالیا کرتے تھے اس طرح امروہہ کے اس باکمال طبیب سے بھی استفادہ کا موقع ملتا رہا۔

حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضری:

مولانا محمد صدیق صاحبؒ میں ابتدائے عمر ہی سے شوق تحصیل علوم کمال درجے تھا جس کی تکمیل مکان پر رہ کر نہیں ہوسکتی تھی' اسی شوق میں' آپ ایک مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی مولوی شمس الدین[1] صاحب کے ہمراہ بغیر اطلاع اور بغیر مکان سے خرچ لئے حضرت قاسم العلومؒ کی خدمت بابرکت میں میرٹھ چلے گئے، جو رقم

[1] مولوی شمس الدین صاحب آخر میں مجذوب ہو گئے تھے۔ ان کو مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار بہت یاد تھے۔ خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ جامع مسجد مراد آباد میں حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کا وعظ ہو رہا تھا اور مولوی شمس الدین صاحب خوش ہو رہے تھے اور جامع مسجد کے صحن اور دالانوں میں گھوم رہے تھے کہ حضرت قاسم العلومؒ کے ابن الابن وعظ فرما رہے ہیں۔ قاسمی نسبت کی بنا پر امروہہ میں حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن مفسر کی خدمت میں بھی اسی حالت جذب میں آتے رہتے تھے۔ حضرت حافظ صاحبؒ کی درس گاہ میں آئے کچھ دیر بیٹھے اور تمام احاطے میں چکر لگا کر تشریف لے گئے۔ بس یہ ان کا معمول تھا۔ (فریدی)

بطور جیب خرچ پاس تھی بس وہی تھی، آپ کے نانا کو بے اطلاع اور بے سرو سامانی کے ساتھ چلے جانے کا بڑا قلق تھا، بار بار فرماتے تھے کہ بلا خرچ لئے خدا جانے کہاں چلے گئے؟ کئی آدمی مختلف اطراف میں دوڑائے گئے۔ احتیاطاً مولوی محبوب علی صاحب کے ذریعے حضرت قاسم العلومؒ کی خدمت میں ایک عریضہ میرٹھ کو اس مضمون کا لکھوایا گیا کہ دولڑکے محمد صدیق اور شمس الدین آپ کی خدمت میں پہونچیں تو فوراً مطلع فرمایئے، یہ لڑکے مراد آباد سے بلا اطلاع چلے گئے ہیں، یہ خط ۲۶ / جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ کو میرٹھ روانہ کیا گیا، اس زمانہ میں حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں مقیم تھے۔

ادھر یہ خط پہونچا ادھر یہ دونوں پہونچے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے ان دونوں کو دیکھ کر مولانا حکیم محمد صدیق صاحب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ تمہارا نام محمد صدیق ہے اور آپ کے بھائی کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا، تمہارا نام شمس الدین ہے۔ مولوی شمس الدین نے عرض کیا کہ یہ تو حضرت والا کی کھلی کرامت ہے کہ ہم دونوں کے نام بتلا رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کرامت کہاں سے آئی، دیکھو یہ خط آیا ہوا رکھا ہے دونوں کے نام اس میں لکھے ہوئے ہیں۔

مولانا محمد صدیق صاحبؒ اس واقعہ کو بیان کر کے فرمایا کرتے تھے کہ

میں نے اس وقت ادباً کچھ عرض نہیں کیا ورنہ کرامت پھر بھی تھی کیوں کہ اس خط میں علامات وتعینات کے ساتھ یہ کب تحریر تھا کہ فلاں کا نام محمد صدیق ہے اور فلاں کا شمس الدین۔

حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان کے میرٹھ میں موجود ہونے کی اطلاع مراد آباد بھیجی اور ان دونوں سے بھی خط لکھوا کر بھجوا دیا۔ کچھ دنوں بعد یہ دونوں مراد آباد بلا لئے گئے۔

دیوبند روانہ ہونا:

آپ کچھ عرصے بعد دیوبند روانہ ہو گئے اور تحصیل علم میں مشغول ہوئے یہاں تھوڑے عرصہ تعلیم حاصل کرنے پائے تھے کہ مکان پر پھر بلا لیا گیا دیوبند میں جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا فتح محمد صاحب متعلم جماعت اول دارالعلوم دیوبند بھی تھے، آپ کے مراد آباد آجانے پر مولانا فتح محمد

صاحب بھی مراد آباد آ گئے۔ آپ کے مکان پر ہی رہے، اور آپ کو پڑھاتے رہے، وہ یہاں پر خود حضرت مولانا عالم علی نگینوی ثم مراد آبادی سے علم حدیث پڑھتے تھے۔

دوبارہ میرٹھ کو روانگی:

۶ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ (۱۵ مئی ۱۸۷۳ء) چہار شنبہ کے دن مراد آباد سے میرٹھ کو روانہ ہوئے اور حضرت قاسم العلوم قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست کی حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس قابل کہاں؟ آپ فلاں فلاں بزرگوں میں سے کسی سے بیعت ہو جائیں۔ ان میں سے ایک نام مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کا بھی تھا۔ حکیم صاحب نے ہر بار یہی عرض کیا کہ میں تو حضرت ہی سے بیعت ہوں گا۔ حضرت والا مرتبت نے آخر میں فرمایا کہ آپ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہو جائیں آپ نے پھر عرض کیا کہ میں تو آپ سے ہی بیعت ہوں گا، اس پر حضرتؒ نے فرمایا، کہ ان کا (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا) تو میں بھی معتقد ہوں۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت والا کے اعتقاد سے مجھے کیا۔ مجھے تو اپنا اعتقاد کار آمد ہوگا۔ آٹھ روز تک حضرتؒ نے بیعت نہیں کیا برابر ٹالتے رہے اور یہ بھی جمے رہے۔ آخر میں حضرت قدس سرہٗ نے از راہ انکساری فرمایا، کہ ''یہ شیطان کا دھوکا ہے جب وہ کسی ہونہار کو دیکھتا ہے اور کچھ نہیں بن آتا، تو ایسی جگہ پھنسا دیتا ہے جسے کچھ نہ آتا ہو''۔ غرض بڑی سفارشوں سے بمشکل تمام ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ (۲۳ مئی ۱۸۷۳ء) کو بیعت فرمالیا۔ وہاں رہ کر آپ تحصیل علوم بھی کرتے رہے اور ذکر و شغل میں بھی مشغول رہتے تھے۔ اسی زمانے میں حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ نے اپنے استاذ معظم حضرت قاسم العلومؒ سے عرض کیا کہ ان کو میرے سپرد کر دیجئے۔ حضرتؒ نے فرمایا، اچھی بات ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب کو حکم فرمایا، کہ ''میر صاحب'' کے ہمراہ خورجہ چلے جاؤ، حضرت محدث امروہیؒ اس وقت مدرسہ خورجہ میں صدر مدرس تھے۔

اگر چہ حکیم صاحبؒ کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ حضرت پیر و مرشد کی خدمت بابرکت میں رہیں، اور انہیں سے پڑھیں مگر پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ حسب الحکم حضرت محدث امروہیؒ کے پاس خورجہ

چلے گئے، وہاں پڑھتے بھی تھے اور ذکر و شغل بھی جاری تھا۔ جو حالات ہوتے وہ مرشد کی خدمت میں تحریر کرتے رہتے تھے۔ ایک بار عرض حال سنکر مرشد نے حکم دیا کہ اب ذکر و شغل بالکل ترک کر دو۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک خاص توجہ بھی حکیم صاحب کی طرف مبذول فرمائی۔ اس وقت حضرت نانوتویؒ کا قیام دہلی میں تھا۔

خورجہ میں جس مکان میں حکیم صاحبؒ رہتے تھے بالکل تنہا تھا۔ حضرت پیر و مرشد کی توجہ کا ایک خاص اثر قلب پر تھا، مدرسہ کی تعطیل تھی۔ بے چین اور سوز و گداز والی طبیعت، کہاں مانتی تھی۔ بجائے ''ترک ذکر'' کے بے اختیاری کے ساتھ دن رات ذکر کا مشغلہ جاری رہا۔ اتفاق سے آپ کے پیر بھائی اور آپ کے باطنی کمالات کے رازدار حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم بھی کہیں باہر چلے گئے تھے، آپ کی حالت، استغراق کی ہوگئی، یہ ایک خاص کیفیت تھی جس کی اطلاع مرشد کامل کو ہونی چاہئے تھی یا دخود ان کو پیر و مرشد کی خدمت میں دہلی بھیجا جاتا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ آپ نے اس حالت میں پیر و مرشد کے پاس جانے کو کہا بھی، لیکن کسی نے خیال نہیں کیا اور بجائے دہلی کے مراد آباد مکان پر بھیج دیا گیا۔

۶ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو اسی استغراقی حالت میں خورجہ سے مراد آباد آ گئے۔ یہاں احباء اور اطباء کا یہ خیال ہوا، کہ مرض جنوں لاحق ہوگیا ہے اور اسی مرض کا علاج شروع کر دیا گیا جو بالکل منافی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالت بدستور رہی، اور مبرّدات کے ساتھ علاج ہونے اور سر پر مشکیں چھڑوانے سے آنکھیں آشوب کر آئیں اور بالآخر اسی میں آنکھیں جاتی رہیں چھ ماہ کے بعد پیر و مرشد کو اس حال کی اطلاع ہوئی۔ بہت افسوس کیا اور یوں فرمایا کہ ''ہمیں کسی نے خبر تک نہ کی''۔ اُدھر پیر و مرشد کا مطلع ہونا اور ادھر حکیم صاحبؒ کا ہوش میں آنا۔ طبیعت تو اچھی ہوگئی لیکن آنکھیں جا چکی تھیں۔ آنکھوں کے متعلق پیر و مرشد نے یوں فرمایا:

''دو آنکھوں کے عوض جنت بہت سستی ہے''۔

ایک دوسرے موقع پر مولانا محمد فاروقؒ نے حضرت نانوتویؒ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ حضرت نے ایک بار فرمایا، کہ دو آنکھوں کے عوض جنت بہت ارزاں ہے۔ اس لئے کہ جنت محل دیدار خداوندی ہے۔ آپ کو اس ارشاد کے بعد اپنی نابینائی پر بڑا ناز تھا، اپنے کلام فارسی میں مختلف طریقے سے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا

ہے، ایک شعر میں لکھتے ہیں۔

برکورئ ایں چشم بنازم کہ الیٰ حشر ☆ جز بررخ زیبائے تو بیناشدنی نیست

ایک اور شعر میں فرماتے ہیں، اور کس انداز سے فرماتے ہیں۔

گرننگرد جمال رخ دل فروزتو ☆ صدیق را بہ دیدۂ بینا چہ حاجت است

دربارنانوتویؒ سے خلافت:

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ بیعت ہی بہت کم کرتے تھے چہ جائیکہ کسی کو اپنے خدام میں مجاز بیعت بنائیں، مگر حکیم صاحبؒ کے حالات محمودہ دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اجازت مرحمت فرمائی:

''حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف سے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت ہے[1]''۔

حضرت نانوتویؒ مرادآباد کے جس کسی شخص کو بیعت فرماتے تھے تو خاص طور پر فرمادیا کرتے تھے کہ ''تم کو ذکر و شغل کی تعلیم مولوی محمد صدیق کریں گے''۔

حضرت نانوتویؒ کی ایک کرامت:

ایک بار حضرت نانوتویؒ امروہہ تشریف لائے، حکیم صاحب پیادہ پا مرادآباد سے حاضر خدمت ہوئے شب میں جب کہ کوئی نہ تھا حضرتؒ نے دریافت فرمایا کہ (پیدل آنے میں) تھکے تو نہیں؟ عرض کیا بالکل نہیں، حضرتؒ نے فرمایا ''تم کاہے کو تھکتے'' اور یہ شعر زبان مبارک سے پڑھا۔

ہر چند پیر وخستہ دل ناتواں شدم ☆ ہر گہ کہ ''نام یار شنیدم جواں شدم[2]

دوسرے روز صبح کو ارشاد فرمایا کہ اچھا (اب) جاؤ (حضرتؒ کو یہ خیال تھا کہ کثرت مہمانان میزبان پر بار نہ ہونے پائے)

---

[1] مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ کی طرف سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی۔ مولانا نانوتویؒ کے مجاز بیعت مولانا مراد فاروقی فریدی بھی تھے۔ (محب الحق) [2] غالباً الفاظ کا یہ تصرف حکیم صاحبؒ کی نابینائی کی رعایت سے فرمایا ہے۔ مصرعہ ثانی یوں مشہور ہے ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم (فریدی) یوں بھی مشہور ہے: ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم (محب الحق)

ایک صاحب نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت ابر ہو رہا ہے بارش کا اندیشہ ہے حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ "ہم تو آٹھ آٹھ کوس تک بھیگے ہیں"۔ مولانا محمد فاروق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ والد ماجد صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب مراد آباد ٹھیک آٹھ کوس رہ گیا تو بارش شروع ہوگئی اور پورے آٹھ کوس جس طرح حضرتؒ نے ارشاد فرمایا مجھ کو بھیگنا پڑا۔

مولانا محمد صدیقؒ کے نام قاسم العلومؒ کے مکتوب:

غیر مطبوعہ مکتوبات کے علاوہ "لطائف قاسمیہ" میں دو مکتوب مولانا حکیم محمد صدیق صاحبؒ کے نام نظر سے گزرے، لطائف قاسمیہ کا مکتوب اول آپ ہی کے نام ہے جس میں مسئلہ حیات النبی ﷺ کو نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں مدلل طریقے پر ثابت فرمایا ہے اس کی چند تمہیدی سطریں یہ ہیں:

"سراپا عنایت۔ السلام علیکم! کل جو آپ کا مرسلہ خط پہنچا کیفیت مندرجہ کو دیکھ کر طبیعت بہت گھبرائی۔ ہنوز اور تحریروں سے چنداں فراغت نہ ہوئی تھی کہ ایک اور سر پر آن پڑی۔ تسپر مفصل لکھوں تو کہاں تک لکھوں۔ یہ بحث ایک دریائے ناپیدا کنار ہے اور اختصار کیجئے تو کہاں تک دریا کو کوزے میں لانا دشوار۔ اس لئے فقط عقیدہ دل سے آگاہ کئے دیتا ہوں۔ اس ضمن میں کسی دلیل یا مثال کی طرف بھی اشارہ ہو جائے تو ہو جاؤ میں انبیاء کرام کو انھیں اجسام دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں" الخ

دوسرا مکتوب فضیلت علم کے بیان میں ہے۔ یہ "لطائف قاسمیہ" کا مکتوب چہارم ہے۔ فارسی زبان میں ہے اس کا ترجمہ اردو ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

"بندۂ ہیچمداں محمد قاسم بخدمت بابرکت وسراپا عنایت مولوی محمد صدیق صاحب زادکم اللہ علماً وکمالاً پس از سلام مسنون، لکھتا ہے کہ عنایت نامہ سرمایہ منت وموجب یاد آوری ہوا۔ میں احباب کی عنایتوں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ اُن کی محبت کا بدلہ کس طرح پیش کروں مجھے یہ بھی معلوم نہیں، البتہ ایک دعاء ہے اُس کے علاوہ ہم تہید ستوں کے پاس کوئی تحفہ نہیں ہے، اگر وہ درگاہ بے نیاز میں قبول ہو جائے تو اس سے دریغ نہیں۔ خداوند کریم مقاصد دلی تک پہونچائے۔ دنیا کو اگر دیکھا جائے تو وہ عاقلوں کے نزدیک متاع قلیل سے زیادہ نہیں

ہے۔ اس کی طرف کیا نظر کی جائے علم کا رکن اعظم حدیث و تفسیر ہے، تم ان دونوں علموں کو چھوڑ کر وطن (مراد آباد) چلے گئے، آخر وہ کونسی خوبی تھی جو اس خوبی علم دین کے مقابلہ میں نظر آئی کہ افتاں و خیزاں چلے گئے۔ عنایت فرمائے من دنیا کے غم و رنج یوں ہی آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ مقصود کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ جو ہر ذاتی اور وراثتِ نبوی کو چھوڑنا اور متاعِ قلیل کو حاصل کرنا یہ ''کارخردمندان'' نہیں ہے۔ خلافت حضرت آدم علیہ السلام کا سرمایۂ استحقاق یہی ''وفور علم'' تھا، ورنہ ''معصومیت ملائکہ'' اور ''فساد بنی آدم'' میں کلام نہ تھا۔ میری مصلحت دید یہ ہے کہ جب علم کو تم نے شروع کیا ہے تو ناتمام نہ چھوڑو، بس چھ مہینے یا ایک سال میں کتب باقیہ ختم ہو جائیں گی۔ اگر تمہیں یہی اضطراب وتلون تھا تو پھر تم سے کہا کس نے تھا کہ تم علم کو سیکھنا شروع کرو۔'' الخ

حکیم صاحب کے اشعار میں حضرت مولانا نانوتویؒ کا ذکر:

آپ نے اپنے اشعار میں اپنے استاذ و مرشد حضرت مولانا نانوتویؒ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ذیل کے تین اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ما غلام قاسم فرزانہ ام اے قاسمی ☆ نظم خو بم آبِ نظم قاسم دیوانۂ[1] ریخت
بسے چون قاسم دیوانہ رافرزانہ می سازد ☆ بہ بین صدیق فیض قاسم فرزانۂ مارا
فیوض قاسم الخیراتؒ راصدیق می نازم ☆ رود دیوانہ گردر بزم او فرزانہ می آید

حضرت گنگوہیؒ سے تعلق:

حضرت نانوتویؒ کے وصال کے بعد جب حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ مراد آباد تشریف لائے تو حکیم صاحبؒ نے عرض کیا کہ شیخ المشائخ حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر تو مکہ معظمہ میں ہیں بذریعہ عریضہ بھی وہاں اپنے حالات بھیجنا اور وہاں سے جواب آنا معمولی بات نہیں۔ اب ہم ''وابستگانِ دامنِ قاسمی'' کو کیا کرنا چاہیے؟ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے ارشاد فرمایا کہ اب ہندوستان میں ہم سب کے

[1] قاسم دیوانہ فارسی کے ایک مشہور شاعر گذرے ہیں، اُن کے مقابلے میں اپنے شعروں میں حکیم صاحبؒ نے اپنے استاذ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو قاسم فرزانہ کہا ہے اور کس عمدگی سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ (فریدی)

بڑے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ اپنے ہمراہ حکیم صاحبؒ کو دیو بند تک لے گئے۔ حکیم صاحبؒ دیو بند سے گنگوہ گئے اور کچھ دنوں حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے بہت کچھ توجہات اور عنایات فرمائیں اور حکیم صاحبؒ سے براہِ راست یوں فرمایا'' کہ مجھ کو مولوی محمد قاسمؒ کے خدام اپنے لوگوں سے زیادہ عزیز ہیں۔''

ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ دیو بند تشریف فرما ہوئے۔ حکیم صاحبؒ مراد آباد سے دیو بند گئے وہاں مظفر نگر کے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے (جو حضرت نانوتویؒ کے خدام میں سے تھے) مولانا گنگوہیؒ نے حکیم صاحبؒ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا: ''ڈاکٹر صاحب مولوی محمد صدیق صاحب سے ملیئے یہ مولوی محمد قاسمؒ (صاحب) کے نمونہ ہیں اور اُن کی یادگار۔''

ایک بار حضرت گنگوہیؒ نے حکیم صاحب کی موجودگی میں یہ رُباعی پڑھی۔

مارا نہ مُرید درد خواں می باید ☆ نے زاہد و حافظ قرآں می باید
صاحبدردے سوختہ جاں می باید ☆ آتشزدۂ بخان و مانے می باید[۱]

مولا محمد فاروق صاحبؒ نے اس رُباعی کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ مولانا محمد حسن صاحبؒ مراد آبادی ساکن محلّہ نواب پورہ (جو دورۂ حدیث میں حضرت گنگوہیؒ کے شاگرد تھے) ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ہم نے حضرت گنگوہیؒ سے سوائے اس ایک شعر کے کوئی شعر نہیں سنا۔

از ادب دوراست رفتن بے طلب در بزم شاہ ☆ ورنہ پائے شوق رامانع درو دیوار نیست

اس کے ساتھ ہی ساتھ مولانا محمد فاروق نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت والد ماجد صاحب (مولانا محمد صدیق صاحبؒ) نے (ایک دن) فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ و حضرت نانوتویؒ وغیر ہما تلامذۂ مولانا مملوک علی صاحبؒ کو دہلی کے شعراء ذوق، مومن، غالب اور امام بخش صہبائی وغیرہم کے مشاعرے کے مشاعرے یاد تھے۔ یہ ان حضرات کی عالی ظرفی ہے کہ زبان پر شعر کا نام تک نہیں آتا۔ فرماتے تھے کہ

[۱] مولانا محمد فاروق صاحبؒ نے اس رباعی پر ایک نوٹ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حفظ قرآن وغیرہ یقیناً امور محمودہ ہیں لیکن وصول الی اللہ کے لئے بیتابی، بے قراری اور سوز و گداز زیادہ درکار ہے۔ (فریدی)

مولانا مملوک علی صاحبؒ مع اپنے تمام شاگردوں کے دہلی کے مشاعروں میں جایا کرتے تھے تاکہ طلباء میں جولانی طبع پیدا ہو۔ پھر فرمایا کہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے اور اشعار بھی تنہائی میں سنے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

عقل گوید شش جہت حدیست بیروں راہ نیست ☆ عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ

شیخ المشائخ سے اجازت بیعت:

کسب طریقت میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی آپ نے استفادہ کیا ہے۔ اپنے حالات حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھتے رہتے تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی بلا طلب آپ کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔

آپ کے اساتذہ کی فہرست:

قرآن شریف اور ابتدائی تعلیم کے اساتذہ کے علاوہ آپ کے اساتذۂ کرام حسب ذیل ہیں:

تجوید: قاری محمد تقی صاحب بچھرایونی (شاگرد حضرت قاری نجیب اللہ) سے حاصل کی۔ خوشنویسی: میں دو استاد تھے (۱) مولوی محمد عنایت حسین خوشنویس ساکن محلہ نواب پورہ، مرادآباد (۲) مولوی الٰہی بخش صاحب مرجان رقم رامپوری۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صدر مدرس اور مولانا سید احمد دہلویؒ مدرس دوم کے علاوہ مولانا فتح محمد اور مولانا محمد فاضل متعلمان دارالعلوم سے بھی پڑھا۔

میرٹھ میں: حضرت قاسم العلوم والمعارفؒ سے اور خورجہ میں حضرت محدث امروہیؒ سے پڑھا۔ علم حدیث کی سند آپ کو حضرت مولانا سید عالم علیؒ (نگینوی مولداً مرادآبادی مسکناً و مدفناً) سے بھی ہے جو کہ شاگرد خاص تھے۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ (نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ) کے مولانا سید عالم علی صاحبؒ نے حکیم صاحبؒ کو ان کی نابینائی کی حالت میں ہی وصیت فرمائی تھی کہ تفسیر و حدیث ہمیشہ پڑھاتے رہنا۔ حکیم صاحبؒ نے اس کی حتی الامکان تعمیل کی اور تا آخر عمر جب تک قویٰ نے

کام دیا اپنے یہاں سہ پہر کو خالصاً لوجہ اللہ تفسیر و حدیث کا درس دیا۔

نظم فارسی میں آپ کے پہلے استاذ سید عبدالرشید غازی پوری ثم مرادآبادی تھے جن کو ایرانی اُستاذ سے تلمذ تھا۔ آخر میں آغا کمال الدین سنجر طہرانی سے رامپور میں ملاقات ہوئی اور فتح یونان کی مبارک باد اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید[1] خان صاحب کی تعریف میں جو تازہ قصیدہ لکھا تھا آغا صاحب کو سنایا یہ (۱۰۳) اشعار کا قصیدہ تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ اپنا کل کلام حکیم صاحبؒ نے آغا صاحب کو بنظر اصلاح دکھایا۔ مرادآباد سے کچھ حصہ نقل کر کے آغا صاحب کے پاس بھیج دیا جاتا تھا اور وہ اس کو دیکھ کر اور کہیں کہیں تغیر فرما کر واپس کر دیتے تھے۔ آغا صاحب نے بہت سے اشعار پر صاد بنائی بہت سے شعروں پر بسیار خوب لکھا۔ کسی کسی شعر پر تحریر کیا ''فہم نباید''۔ بہت جگہ حکیم صاحبؒ کا مضمون اعلیٰ وارفع تھا اور آغا صاحب کی اصلاح سے مضمون پہلے کے مقابلے میں گر گیا جس سے سمجھا گیا کہ آغا صاحب کا خیال اصل معنی تک نہیں پہونچا۔

حافظہ:

آپ کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ حضرت حکیم صاحبؒ کا حافظہ بہت قوی اور بہترین تھا۔ آپ جب رات کو بسترِ خواب راحت پر لیٹتے تھے تو جس زمانہ میں آپ کی طبیعت نظم کی طرف متوجہ ہوتی تھی دس پندرہ اشعار سوتے وقت کہہ لیتے تھے اور صبح کو بغیر سوچے اُن کو لکھوا دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے بیس بیماروں کی نبض دیکھی اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حال سنا، مرض بھی سب کے مختلف تھے۔ مکان پر آ کر بلا تکلف ترتیب وار ہر ایک کو نسخہ لکھا اور غذا بتائی۔

جب کبھی کسی نے کوئی شعر یا بات دریافت کی کہ کہاں ہے اور کس نے ایسا لکھا ہے فوراً بتا دیا کرتے تھے کہ فلاں صاحب نے فلاں کتاب میں، فلاں صفحہ و سطر میں لکھا ہے۔

حکمت کے متعلق کوئی بیان دیکھنا ہوا یا کوئی نسخہ نکالنا ہوا تو فرمایا کہ فلاں کتاب لاؤ اور میرے

---

[1] یونان کی فتح پر حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ نے بھی خلیفۃ المسلمین کو مبارک باد کا تار بھیجا تھا۔ (محب الحق)

سامنے سیدھی کر کے رکھ دو، انداز سے اُسے کھولا اور فرمایا کہ اول سطر سناؤ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہی صفحہ نکل آتا ورنہ داہنے اور بائیں ایک آدھ ورق لوٹا اور فرما دیا کہ یہاں فلاں سطر پڑھو جو بات دیکھنی ہوتی وہیں نکلتی تھی۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جبکہ آپ کی نظر کو گئے ہوئے چالیس پچاس سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔

مثنوی مولانا رومؒ:

مثنوی مولانا رومؒ ایک بحر ذخار ہے۔ آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کسی نے مثنوی کا پہلا مصرعہ کہیں سے پڑھ دیا تو آپ نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا اور دوسرا پڑھا تو آپ نے پہلا پڑھ دیا اور ساتھ ہی ساتھ بہت سے اشعار مثنوی کے ترتیب وار سنا دیئے۔

دیوان حافظ اور مثنوی پڑھانا بھی آپ کا حصہ تھا۔ مولوی محمد دین صاحب پنجابی ایک جامع منقول ومعقول شخص تھے۔ اُن کو مثنوی پڑھنے کا شوق ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی سے بہتر اس وقت ہندوستان میں کوئی مثنوی پڑھانے والا نہیں۔ وہ صرف مثنوی پڑھنے مراد آباد آئے اور تمام حواشی اور شرح بحر العلوم کا لفظ بلفظ مطالعہ کر کے مثنوی پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے بارہا فرمایا کہ مولانا بحر العلومؒ مولانا محمد صدیقؒ کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ جب یہ مطلب بیان کرتے ہیں تو اکثر مواقع میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بحر العلومؒ مطلب کو پہونچے ہی نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ بحر العلومؒ بہت بڑے شخص ہیں۔ مگر تصوف میں مولانا محمد صدیقؒ صاحب سے پیچھے ہیں۔

معمولات:

مولانا محمد فاروق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

”آپ نے بچپن ہی سے شرک و بدعت کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ توحید وسنت کے رواج دینے کی طرف مائل تھے۔ “لا یخافون لو مة لائم” کے مصداق تھے۔ اذکار واشغال اور تہجد کے لئے رات وقف تھی۔ علاوہ فرائض و واجبات اور سنن موکدہ کے بعد مغرب بیس رکعات نفل پڑھتے

تھے اور نماز اشراق و چاشت تک قضا نہ ہوتی تھی۔"

مطب:

اپنے نانا حکیم محمد عطا حسین صاحبؒ کے انتقال کے بعد سے التزاماً صبح کے وقت مطب کرتے تھے۔ اس سے پہلے خورجہ ضلع بلند شہر میں مطب کیا تھا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ آپ کے مطب میں مشکل مشکل امراض کے مریض دہلی و لکھنؤ جیسے مرکزی مقامات سے مایوس ہو کر آتے اور آپ کے ہاتھ سے بفضلِ الٰہی شفایاب ہوتے تھے۔ آپ کے طبی کمالات لکھنے کے لئے ایک مستقل دفتر چاہئے۔ مولانا محمد فاروقؒ نے اس سلسلے میں بہت سے حیرت انگیز واقعات لکھے ہیں۔ نبض میں آپ کو خاص مہارت حاصل تھی جو کرامت کے درجے پر پہونچی ہوئی تھی۔ حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی مرحوم سے جب آپ کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ: "میں نے آپ کی نباضی کی بہت تعریف سنی ہے۔ فن طب میں کمال حاصل ہونا بھی پیر و مرشد کی توجہ کا نتیجہ تھا۔ آپ نے خورجہ میں حضرت محدث امروہیؒ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے قیام فرمایا تھا وہاں مدت تک کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ آپ کو طب میں دخل ہے۔ آخر بعض معرکۃ الآراء علاج کرنے کی وجہ سے آپ کا تمام میں شہرہ ہو گیا مگر تعلیم میں حرج واقع ہونے کے خوف سے آپ مستقل مطب نہیں کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد آپ کے پیر و مرشد حضرت قاسم العلومؒ خورجہ تشریف لائے، بعض لوگوں نے حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی محمد صدیق صاحب بہت اچھے حکیم ہیں مگر مطب نہیں کرتے۔ اگر حضرت حکم دے دیں تو مخلوق خدا کو بہت نفع پہونچے۔ حضرتؒ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ آپ جب طبیب ہیں تو مطب کیوں نہیں کرتے، مطب کیا کیجئے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، پھر تو حکیم صاحب کی طرف خلقت بہت زیادہ رجوع ہوئی۔

نبض دیکھ کر حالات سننے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اکثر سابقہ اور آئندہ کے حالات بیان کر دیتے تھے۔ آپ کا قاعدہ آج کل کے سے معالجوں کا سا نہ تھا کہ مریض کے سامنے دلشکن باتیں جلب منفعت کے لئے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کی تشخیص نہ ہوتی کہ مریض بچنے کا نہیں تو اپنے احباب

سے فرمادیا کرتے تھے (مریض اور مریض کے تیمارداروں سے نہیں) اگر مرض توجہ کے ساتھ علاج کرنے کے قابل ہوتا تو آپ علیحدہ مریض کے تیمارداروں اور سنجیدہ احباب واعزا سے فرمادیا کرتے تھے کہ اس کو فلاں مرض (مثلاً دق یا سل) ہے اور ابھی قابل علاج ہے، بہت خیال کر کے علاج کرنے سے آرام ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت غفلت ہوئی تو پھر مرض قابل علاج نہ رہے گا۔ مقصود علاج کی طرف متوجہ کرنا ہوتا تھا۔ آپ نے اپنے صاحبزادوں کو نصیحت فرمائی تھی کہ جو شخص تمہارے پاس بغرض علاج آئے تو چاہے وہ تمہارا جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو اس کا علاج بہت غور سے اس طرح کرنا جیسا کہ کسی خاص دوست کا کرسکتے ہو۔ اگر اس کے خلاف کیا تو خداوند عالم کے دربار میں گرفت کی جائیگی اور مواخذہ ہوگا۔

نباضی کے دو محیر العقول واقعات:

(۱) ایک شخص نے آپ کو نبض دکھائی آپ نے فرمایا تمہاری نبض میں سنکھیا کا اثر ہے۔ اُس نے کہا کہ سنکھیا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ فرمایا کہ نبض میں تو اثر ہے، غور کرو۔ انھوں نے بہت سوچا اور سوچ کر اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا کہ سر پر ورم ہو گیا تھا اور اُس کو آرام نہ ہوتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے سر پر شگاف دیا۔ اندر کیڑے نکلے، صاف کر کے زخم میں سنکھیا بھر دیا تھا۔ اُس سے آرام ہوا تھا۔ دیکھئے بچپنے کے جلدی اثر کو مریض کی عمر کے آخری حصے میں آپ نے نبض سے کس طرح شناخت کرلیا۔

(۲) مرادآباد محلّہ کسرول کے ایک صاحب پولیس ٹریننگ اسکول میں ماسٹر تھے۔ ایک شریر گھوڑی پر سوار جا رہے تھے کہ اُس نے ایک موڑ پر اُن کو گرادیا۔ اُن کو فوراً مکان پر لایا گیا اور وہ قبل مغرب انتقال کر گئے۔ رات کو جب اُن کو غسل دینے کے لئے تختے پر اُتارا تو بعض اعضاء میں حرکت سی معلوم ہوتی تھی۔ فوراً ایک شخص سول سرجن کو لینے گیا اور ایک آدمی حضرت حکیم صاحبؒ کے لینے کو آیا۔ جب حکیم صاحبؒ وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ سول سرجن ابھی ابھی دیکھ کر چلا گیا ہے اور یہ کسی نے نہ بتایا کہ سول سرجن نے کیا کہا ہے؟ حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور فرمایا کہ ضرب داہنی طرف ہے اور اب ان میں کچھ نہیں رہا۔ سب ششدر رہ گئے کہ مُردے کی نبض دیکھ کر یہ بتا دیا کہ اس سمت میں ضرب آئی ہے۔

دیکھا گیا تو اُسی سمت میں ضرب تھی ہاتھ میں کہیں دور تک ضرب کے آثار نہ تھے۔ اُس وقت لوگوں نے کہا کہ دیکھئے حکیم صاحبؒ نے سول سرجن۔ سے بھی زائد بتا دیا۔ سول سرجن نے آنکھوں سے دیکھا، آلات سے دیکھا اور آپ نے فقط نبض دیکھی اور یہ بھی بتا دیا کہ ضرب اس سمت میں ہے۔

نظم میں قادرالکلامی:

حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ نے مولانا محمد فاروق صاحبؒ سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''مولانا محمد قاسم صاحبؒ میں بہت سے کمالات تھے اُن کو نظم سے بھی غایت درجہ طبعاً دلچسپی تھی۔ اُن کا یہ کمال تمہارے والد میں آیا ہے۔''

حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندیؒ (مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے والد ماجد) نے بھی مولانا محمد فاروق صاحبؒ سے ارشاد فرمایا تھا کہ ''مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا سوز و گداز آپ کے والد کے حصے میں آیا ہے۔''

آپ کا کلام اُردو میں کم اور فارسی میں زیادہ ہے۔ جس شاعر کے طرز پر آپ نے لکھا ہے اُس کا رنگ آپ کے کلام میں ایسا موجود ہے کہ واقف کاروں کو دونوں کلاموں میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ خاقانی، حافظ، خسرو، عرفی، نظیری، قدسی، کلیم، مرزا جلال اسیر،، مرزا صائب، مرزا بیدل، مرزا غالب کی غزلوں پر غزلیں کہیں اور کامیاب طریقے پر۔

مولانا محمد فاروق صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''حکیم صاحبؒ کے استاد فارسی مولوی سید محمد عبدالرشید مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد صدیق صاحب کی طبیعت شاہ نصیر کی سی مشکل پسند واقع ہوئی ہے۔ جتنی مشکل زمین ہو۔ اُتنا ہی کلام بہترین اور بلند ہوتا ہے۔

جو قافیہ کسی اُستاذ نے ایسا بہتر باندھا ہے کہ وہ اُس کا حصہ ہو گیا ہے وہ قافیہ یا تو آپ نے باندھا ہی نہیں اور باندھا تو اُس کے ہم پلہ یا اس سے بہتر قدسی کا مشہور شعر ہے۔

دل دادن و نگاہ نمودن گناہِ من ☆ دل بردن و نگاہ نہ کردن گناہِ کیست

اس ''گناہِ من'' اور ''گناہِ کیست'' پر بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے مگر مسلم یہ ہے کہ قدسی کا حصہ ہو گیا ہے، قدسی کو کوئی نہ پہنچ سکا، حتیٰ کہ مرزا غالب جیسے قادر الکلام فارسی گو شاعر نے بھی توسن طبع کو اس میدان میں دوڑایا ہے اور اپنی شوخی اور جدت کا کمال دکھایا ہے مگر وہ بھی شاہراہِ قدسی سے بچکر نکل گئے اور قدسی کے مضمون کا مقابلہ نہ کر سکے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

بیخود بوقت ذبح طپیدن گناہِ من ☆ دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

خوبی یہ ہے کہ دوش بدوش رہتے ہوئے سبقت کی جائے۔ یہ میدان حکیم صاحبؒ نے سر کیا ہے۔ دیکھئے کتنا بیساختہ شعر ہے۔

بے اختیار روئے تو دیدن گناہِ من ☆ بے باک رُخ ز پردہ نمودن گناہِ کیست

آپ کے صاحبزادے تحریر فرماتے ہیں کہ حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ''مولوی محمد صدیق صاحب کے کلام میں اول اول بہت شوخی تھی۔ مولوی سید محمد عبدالرشید صاحب مرحوم کے جب یہ شاگرد ہوئے تو انھوں نے ان کی شوخ طبیعت کو اپنی پیرانہ سالی کے تابع کر لیا اور اُن کے کلام کو بوڑھوں کا سا کلام بنا دیا۔ آخر میں مولوی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد کلام پھر اصلی رنگ پر آ گیا۔

نمونۂ کلام اُردو:

تلمذ معنوی ہے مجھ کو حسان بن ثابتؓ سے ☆ نہیں میں خوشہ چین خاقانی و بابا فغانی کا

آسمانِ علم و معرفت کے آفتاب و ماہتاب حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی شان میں ایک مشترکہ قصیدہ لکھا ہے، اس میں کمال عقیدت، جذبات قلبیہ اور روانی طبع کے خوب جوہر دکھائے ہیں، اس کے چند شعر یہ ہیں:

چمن آرا تھا وہ کیسا کہ چمن سے اُس کے ☆ ہیں رشید احمدؒ و قاسم گلِ خنداں دونوں

حجۃ اللہ انھیں کہیئے تو لاریب ہے راست ☆ کیوں کہ ہیں دعوئے توحید کے بُرہاں دونوں

ہیں یہ وہ گوہرِ مکنوں کہ خریدار ان کے ☆ دیکے کونین جو لیں تب بھی ہیں ارزاں دونوں

علم و حکمت کے یہ میزاب ہیں بحر طلّاب ☆ رشد اور فیض کے ہیں قلزم و عمّاں دونوں
نور سے اُن کے منور نہ ہوں کیوں دونوں جہاں ☆ چرخ ارشاد کے ہیں نیّر تاباں دونوں
خُرمی کو مدد اُن سے نہ ہو کیوں عالم میں ☆ باغ امدادؒ کے ہیں سروِ خراماں دونوں
فخر مرشد ہوئے فارغ جو سبق سے یہ ہوئے ☆ فخرِ استاد تھے جب تھے یہ سبق خواں دونوں
ان بزرگوں کی ثنا مجھ سے بیاں ہو کیوں کر ☆ جن کے استاد ہوں اور پیر ثنا خواں دونوں
جن کی تحریر سے قاصر ہے زبانِ خامہ ☆ رکھتے ہیں ایسے یہ اوصاف فراواں دونوں[1]
ے آتا ہے عیادت کو طبیب دل و جاں پھر ☆ یہ مژدہ کوئی عشق کے بیمار سے کہدو
ے الٰہی دکھا دے فضائے مدینہ ☆ وہ روضہ وہ دولت سرائے مدینہ

ایک نعت کے چند شعر یہ ہیں:

ہم روئے نبیؐ کو مہ انور نہ کہیں گے ☆ خورشید کو ذرّے کی برابر نہ کہیں گے
ذرّہ درِ اقدس کا ہے تاجِ سرِ خورشید ☆ اے ماہ اُسے ہم کبھی اختر نہ کہیں گے
تاجِ سرِ جبریل ہے نعلِ شہ دارینؐ ☆ ہم اُس کو کبھی تاجِ سکندر نہ کہیں گے
اُس در کے گدا کا ہے یہ رُتبہ کہ فرشتے ☆ رضواں کو بھی اُس کا کبھی ہمسر نہ کہیں گے
میلاد کا جلسہ ہے کہاں وعظ کی محفل ☆ بدعات کو سنت کے برابر نہ کہیں گے
پھر کون ہے کہلائے جو عالم میں سخنور ☆ صدیق کو گر لوگ سخنور نہ کہیں گے

---

[1] اس ردیف و قافیہ میں مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ نے بھی دونوں صاحبان کی شان میں قصیدہ لکھا ہے۔ جس کے آٹھ شعر ہیں۔ ان میں سے دو شعر پیش خدمت ہیں۔

مدح لکھے ان کی جو ہیں حافظ قرآں دونوں ☆ حامیٔ بیت حرم صاحب عرفاں دونوں
احمد خستہ جو ہے محو کمال قاسم ☆ اس پہ ہو لطف نبیؐ رحمت یزداں دونوں

اس زمین میں حضرت شیخ الہند اور ڈاکٹر عبدالرحمن مظفر نگری مرحوم نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ (محب الحق)

نمونۂ کلام فارسی:

پہلے نعت کے چند کیف آور اشعار پڑھیئے:۔

تاکے نشوم بادیہ پیمائے مدینہ ☆ دل میکشدم شوق تماشائے مدینہ

۔ برترز عرش ذر وہ شان محمد است ☆ ازلا مکاں بلند مکانِ محمد است

تاجستہ خوں کند جگر سر کشان دہر ☆ تیریکہ از قضا بکمان محمد است

۔ شان خداست جلوہ گر از روئے مصطفیٰ ☆ عین عطاست جنبش ابروئے مصطفیٰ

ایک اور نعتیہ رباعی بھی پڑھیئے جو جذبات محبت سے لبریز ہے:

این ہفت فلک بہفت اختر نازد ☆ ایں ہفت زمیں بہفت کشور نازد

بر جامِ[ن] جم و بآئینہ اسکندر ☆ صدیق بحضرت پیمبر نازد

چند شعر اور پڑھیئے اور جان ودل کو دعوت کیف ونشاط دیجئے:

بگو باد صبا پیغام ما جانانۂ مارا ☆ کہ خرم از قدوم خود نماید خانۂ مارا

۔ چوں سر شکم بجہاں گوہر شہوار کجاست ☆ دارم ایں گوہر نایاب خریدار کجاست

۔ خواب و خور جملہ زمن رفت بنظارۂ دوست ☆ روز عیدم برکات رمضانے دارد

۔ ہر قطرۂ اشک مرا صد جوش طوفاں در بغل ☆ صد کوہ غم بالائے سر صد دشت حرماں در بغل

۔ مذ موم گر چہ پیری نزد جہا نیا نست ☆ پیر یکہ عشق دارد بہتر زصد جوانست

۔ اے کہ در محفل دلدار رسیدن خواہی ☆ نرسی، ہاں مگراز یُمن مددگاریٔ دل

۔ بہ پیری می کشد عہد شباب آہستہ آہستہ ☆ بنائے زندگی گرد د خراب آہستہ آہستہ

۔ ابر لطفت چو کند قطرہ فشانی یا رب ☆ باز سر سبز شود باغ و بہار دہلی

حافظ اینجا اگر آید طلبد اے صدیق ☆ ساغر فیض ''مصلائے'' دیار دہلی

ن: آئینہ اسکندر و جام جمشید

قیامت[1] را نسنجم با قیامت تا قیامت هم ☆ کہ شرمندہ نماید یک قیامت صد قیامت را

وقت کم ہونے کی وجہ سے اور طوالت کے خوف سے میں حکیم صاحبؒ کے کلام فارسی کا بہت کم انتخاب کر سکا ہوں، کاش حکیم صاحبؒ کا پورا دیوان شائع ہونے کی کوئی صورت نکل آئے تاکہ ان کے بہترین فارسی کلام سے اہل ذوق استفادہ کر سکیں اور اُن کے تمام جگر پارے گوشۂ خمول سے نکل کر جریدۂ عالم پر ثبت ہو جائیں اور سند دوام حاصل کریں۔

حضرت سید احمد شہید کی شان میں:

حکیم خاقانی کا مشہور قصیدہ کا ایک مصرعہ یہ ہے۔ ع

دل من پیر تعلیم است و من طفل دبستانش

اس پر آپ نے تقریباً تین سو شعر کا ایک بہترین نعتیہ قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں ضمناً حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مدح بھی آ گئی ہے۔ درحقیقت یہ قصیدہ حکیم صاحب کا زبردست شاہکار ہے۔ ۱۳۰۹ھ میں مطبع گلزار ابراہیم مراد آباد میں ''گلستان مناقب'' کے اندر یہ قصیدہ شائع ہوا ہے۔ اس قصیدہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مطالعہ سے گزر چکا ہے۔ اب ''گلستان مناقب قریب قریب نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ اپنے کتب خانہ سے بڑی تلاش کے بعد حکیم محمد عمر صاحب مدظلہٗ نے احقر کے لئے برآمد کیا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

دل من نسخۂ دیں شرح بسم اللہ عنوانش ☆ بہار گلشن توحید و سنت خط ریحانش

اس قصیدے کے چند اشعار جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی شان میں ہیں، پیش کرتا ہوں۔

مجدد سید احمدؒ شد صدیٔ عشر و ثالث را ☆ کہ حق در کشور تحقیق حق بخشید سلطانش

زباد تند باطل در شبستان جہاں مردے ☆ چراغ دین حق گر خود نہ بودے زیر دامانش

[1] آغا کمال الدین سنجر طہرانی نے اس شعر کی ان الفاظ میں تحسین کی ہے: ''خوب است'' فریدی

بہیں تفسیر آیات کلام اللہ گفتارش ☆ مہیں شرح احادیث رسول اللہ تبیانش
زہے ماہے کہ شد اسلام روشن از جبین او ☆ خہے مہرے کہ ظلم وکفر رفت ازروئے تابانش
سریر آرائے ملک شرع احمدؐ افتخار دیں ☆ کہ زیب فرق باشد خاص تاج لطف یزدانش
ازو در ہر طرف توحید و سنت جلوہ آرا شد ☆ زعالم شرک و بدعت رخت بربستہ بدورانش
زگلزار رسول اللہ ایں گلبن دمید الحق ☆ کہ مغز عارفاں راعطر پرور کرد ریحانش
زعہد خود ہمی آثار بزرگی بر جبین او ☆ بزرگش داشتے ہر کس کہ میدید از بزرگانش
بہ دیوانِ عدالت پیش حق دانان وحق جویاں ☆ بدعوائے امامت خود شہادت ہست برہانش
زبالاسحار ھم یستغفرون رمزے شنیدازوے ☆ کہ مولانائے اسماعیل آمد از مریدانش
ہزاراں سنت مردہ ازو شد زندہ در عالم ☆ بہ احیاء یکے سنت ثواب صد شہید انش

تاریخ گوئی کے چند نمونے:

میں نے اس ضمن میں چند ایسی شخصیتوں کے متعلق قطعات تاریخ وفات منتخب کئے ہیں جو مشاہیر ملت اور اکابر دیو بند میں سے ہیں یا اکابر دیو بند سے اُن کا گہرا تعلق رہا ہے۔ حضرت مولانا سید عالم علی محدث مرادآبادیؒ کا قطعہ تاریخ وفات حکیم صاحب نے لکھا ہے جس کے پہلے مصرعہ میں وقت دن تاریخ اور مہینہ ہے اور آخری مصرعہ بلا تعمیہ وتخرجہ مادہ تاریخ ہے۔ قطعہ

بعد عصر از پنجشنبہ بستم از ماہ صیام ☆ شد زدرد واقع جانکاہ عالم ممتلی
سال و حال آں زصدیق حزیں باید شنید ☆ ہائے رحلت کرد سید مولوی عالم علی

۱۲۹۵ھ

قطعہ تاریخ وفات مولانا ذوالفقار علی صاحب دیو بندیؒ:

ذوالفقار آن صاحب فضل و کمال ☆ آنکہ خلقے از و فاتش بے خود است
ساغرے بخشیدش از آبِ حیات ☆ موت کزوے عالمے را لا بدست

در حیات خود چو آں نیکو خصال ☆ ہم نشین حضرت قاسمؒ بدست
یافت نزدش جائے ہم بعد از وفات ☆ آن ہم از آثارِ پنہان وُ دست
سالش از روئے یقیں صدیق گفت ☆ جاگزیں در پہلوئے قاسمؒ شدست

۱۳۱۲ ۱۳۲۲ھ
۱۰ =
۱۳۲۲

دیگر بلاتعمیہ:

ذوالفقار دینی سر دفتر ارباب دیں ☆ ناظم و ناثر دبیر نغز معنی آفریں
آنچناں کارند معانی و بیاں بمثیل بود ☆ در ریاضی دستگاہے داشت کامل ہمچنیں
شدز تسہیل حسابش عالمے راسہل کار ☆ تذکرہ اندر بلاغت یادگار او ببیں
بازبان حال از صدیق سال نقل جست ☆ گفتمش۔ در پہلوئے قاسمؒ شدتی جاگزیں

۱۳۲۲ھ

قطعہ تاریخ وفات مولانا فضل الرحمٰن دیوبندیؒ

فضل سر حلقۂ ارباب ذکاء ☆ شدز دنیا چو بسوئے عقبیٰ

---

[1] اس قطعہ پر مولانا محمد فاروق صاحب مرلوآبادیؒ نے ایک تشریحی نوٹ بزبان فارسی لکھا ہے۔ ناظرین کے اضافہ معلومات کے لئے پیش نظر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو حضرت مولانا نانوتویؒ کے پائیں بسمت مشرق دفن کیا جائے۔ حضرت نانوتویؒ کے پہلوئے مزار میں مشرق کی طرف اُن کے برادر عم زاد مولانا محمد احسن صاحب نانوتویؒ کی قبر اس طرح متصل تھی کہ دونوں قبروں کے درمیان بظاہر کسی قبر کی جگہ نہیں تھی۔ مولانا محمد فاروق جیسے ثقہ بزرگ کا بیان ہے کہ دیوبند کے ہزار ہا باشندے اور بیرونجات کے حضرات اس امر سے واقف ہیں اور میں نے خود بھی مزار حضرت نانوتویؒ پر حاضری دی ہے اور مولوی محمد احسن صاحب نانوتویؒ کی قبر کو حضرت نانوتویؒ کے مزار پاک سے متصل دیکھا ہے لیکن جب بعد وفات مولانا ذوالفقار علیؒ لوگ قبر کی جگہ تجویز کرنے کے لئے قبرستان گئے تو دیکھا گیا کہ مابین مزار حضرت قاسم العلومؒ و قبر مولانا محمد احسنؒ فراخی بقدر ایک قبر ظاہر ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ایں از کرامات حضرت نانوتویؒ است'' (فریدی)

گفت تاریخ وفاتش صدیق ☆ فضل رحمٰن بمینو بادا

۱۳۲۵ھ

دیگر تاریخ صوری:

مولوی فضل رحمٰن دینیؒ ☆ ناظم و ناثر دبیر بذلہ سنج
چوں ز دنیا جانب عقبیٰ برفت ☆ جان پاک اور میدازد رد و رنج
گفتمش صدیق صوری سال نقل ☆ بر ہزار و سہ صد افزا بست و پنج

۱۳۲۵ھ

قطعہ تاریخ وفات حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ:

شہ رائے پور شاہ عبدالرحیم ☆ چو خواندہ بدرگاہ خویشش کریما
بجستم ز صدیق سال و صالش ☆ بگفتا لقد فاز فوزاً عظیما

۱۳۳۷ھ

قطعۂ تاریخ وفات نواب محمد محمود علی خاں مرحوم:

فرشتہ خصلت محمود علی خاں نواب ☆ چوجان پاک بجان آفرین پاک سپرد
سروش ملہم غیبی بسال رحلت گفت ☆ زہائے ہائے گذر گو کہ مرد خیر نمرد
۱۳۴۸ ۱۶ ۱۶
۳۲ ۳۲
۱۳۱۶ =۱۳۱۶ھ

قطعۂ دیگر:

آنکہ چھتاری ازو مرجع آفاق بود ☆ برزخِ شوق دلش چوں در جنت کشود
ہاتف ازیں واقعہ سال زصدیق گفت ☆ بے سر و پاشد ہمہ بذل و سخا خیر وجود
ذ خ ی و
۷۰۰ ۶۰۰ ۱۰ ۶
۱۳۱۶ھ

وفات:

۳/شوال ۱۳۴۷ھ کو (شب جمعہ میں ساڑھے دس بجے) بعمر چوراسی سال حضرت مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادیؒ کا وصال ہوا۔ بعد نماز جمعہ مسجد شاہی مرادآباد میں آپ کے جنازے کی نماز مولانا نواب قاضی محی[1] الدین احمد خاں فاروقی مرادآبادیؒ (تلمیذ حضرت مولانا نوتویؒ وخلیفہ حضرت حاجی صاحبؒ) نے پڑھائی۔ بعد نماز جنازہ لوگوں کے اصرار پر آپ کا چہرہ دکھایا گیا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آپ تبسم فرمارہے ہیں۔ اپنے مکان کے قریب محلہ بغیہ میں اپنے خاندانی قبرستان کے اندر دفن کیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اولاد:

حضرت مولانا محمد صدیق مرادآبادی کے دو صاحبزادے تھے: (۱) مولانا حکیم عبدالرحمٰن صاحب (۲) مولانا حکیم محمد فاروق صاحب۔ مولانا محمد فاروقؒ نے آپ کی تمام کتابوں اور علمی تبرکات کو محفوظ رکھا۔ خود عالم، طبیب اور خوشنویس تھے۔ ایک ضخیم بیاض میں اپنے والد ماجد کا کلام فارسی بڑی محنت سے نہایت خوش خط طریقے پر نقل کیا اور ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اپنے بزرگ باپ سے جا ملے۔ ان کے صاحبزادگان یہ ہیں: (۱) جناب محمد احسن صاحب (۲) جناب محمد محسن صاحب (۳) حکیم محمد عمر صاحب (۴) حکیم صلاح الدین صاحب (۵) پروفیسر محمد عثمان صاحب لیکچرار شعبہ انجینئرنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی[2] علی گڑھ۔

---

[1] ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ میں شب جمعہ کو حضرت قاضی نواب محی الدین احمد خاں فاروقیؒ نے بھی وصال فرمایا، اُن کے بعد ضلع مرادآباد میں سوائے مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی مفسر امروہیؒ کے کوئی اور عالم ایسا باقی نہ رہا تھا کہ جو براہ راست حضرت قاسم العلوم والمعارفؒ سے فیض یاب ہو۔ ۱۳۶۷ھ میں وہ بھی عالم آخرت کو سدھار گئے۔ (فریدی) [2] محمد محسن صاحب کا وصال ۲۲/جون ۱۹۷۳ء میں ہوا، محمد احسن صاحب کا وصال ۱۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ہوا، حکیم صلاح الدین صاحب کا وصال یکم جنوری ۱۹۸۳ء میں ہوا، حکیم محمد عمر صاحب کا وصال ۱۸/اپریل ۱۹۸۵ء میں ہوا، پروفیسر صاحب کا وصال ۲۲/جون ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ (محب الحق)

حضرت نانوتویؒ کی آخری یادگار

مفسر قرآن مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدّیقی امروہیؒ:

مفسر جلیل حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدّیقی امروہیؒ کے حالات وملفوظات مرتب کرنے کا کئی سال سے ارادہ تھا لیکن یہ ارادہ ہنوز عملی شکل میں متشکل نہیں ہوا تھا۔ اتفاق کی بات صاحبزادہ مولوی سید محمد از ہر شاہ قیصر مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند نے مجھے اس طرف توجہ دلائی اور میرے مضمون کے لئے یہی موضوع مقرر کیا۔ تعمیل کے بغیر چارۂ کار نہ تھا اپنے پاس ایک مختصر سی یادداشت تھی جو حضرتؒ کی زندگی میں بغیر کسی خاص اہتمام کے ضبط تحریر میں لائی گئی تھی اس کو سامنے رکھ کر کچھ حافظے پر زور ڈال کر نیز حضرت مولانا عبدالقدوس صدّیقی دام فضلہم سے مراجعت کر کے یہ چند صفحات لکھ رہا ہوں جو ایک رسالہ کے لئے کافی سے زائد ہیں توفیق الٰہی شامل حال ہوئی تو حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور حضرت حافظ صاحبؒ کی مبسوط و مفصل سوانح عمریاں ان کی شان علم وعلوئے مرتبت کے مطابق ملک کے سامنے پیش کیجائیں گی۔

حضرتؒ ایک علمی خاندان کے فرد، دارالعلوم دیوبند کے قدیم ترین فرزند خمخانۂ قاسمی کے جرعہ کش، رشحات رشیدی سے بہرہ یاب، فیوض امدادیہ سے مستفیض اور فیضان محدث امروہیؒ سے فیض یاب تھے۔ قرآن فہمی کی خداداد دولت سے حصہ وافر ملا تھا۔ اعلیٰ بصیرت اور بے انتہا ذہانت و ذکاوت قدرت کی جانب سے ان کو ودیعت کی گئی تھی ساٹھ سال سے زائد وہ مسند درس پر متمکن رہے ہزار ہا تشنگان علوم کو سیراب کیا ان کی محفل میں اللہ ورسول کا ذکر بزرگان دین کے تذکرے سن کر دل کو نشاط اور روح کو سرور حاصل ہوتا تھا۔ وہ اکابر دیوبند کی زندہ یادگار اور ناطق تاریخ تھے جب وہ اکابر کے چشم دید حالات اور ان کے ملفوظات سناتے تھے تو ستر اسّی سال پیشتر کے قدسی صفات مجسمے بغایت شان زیبائی نظروں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتے تھے افسوس کہ اچھا خاصہ موقع ملنے کے باوجود وہ سب واقعات من وعن قلمبند نہ

کیئے جا سکے۔احقر نے حافظ صاحبؒ کو بعد انتقال ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ وہ پھر بقید حیات ہو کر تشریف لے آئے ہیں معاً یہ تہیہ کیا۔بس اب ان کی تمام باتیں ایک ایک کر کے لکھوں گا لیکن یہ خواب میں خیال کی کرشمہ آرائیاں تھیں۔

تھا خواب میں خیال کو ان سے معاملہ ☆ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

اگر چہ فرمائش کے ساتھ ساتھ مجھ سے کہا گیا ہے بچپن خاندان وغیرہ عنوانات قائم کر کے نہ لکھا جائے پھر بھی اجمالاً ان باتوں پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ صاحبؒ کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے متصل ہو کر رفیق و جانشین مصطفیٰؐ حضرت صدیق اکبرؓ تک پہونچتا ہے۔آپ کا آبائی وطن سندیلہ تھا آپ کے والد ماجد مولانا عنایت اللہ صاحبؒ سندیلہ ہی میں ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوے۔عالم شباب میں وطن کو خیر باد کہہ کر بمبئی کو اپنا مستقر بنایا یہاں وہ ریاست بھوپال کی جانب سے محافظ حجاج تھے۔اسی بنا پر وہ اکابر جو حج بیت اللہ کو گئے تھے ان سے متعارف تھے مولانا نانوتویؒ، مولانا گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ وغیرہم بمبئی پہونچ کر ان ہی کے مکان پر فروکش ہوتے تھے ۱۳۰۲ھ میں مولانا عنایت اللہ کا بمبئی میں انتقال ہوا۔

حضرت حافظ صاحبؒ ۱۲۷۷ھ میں بمبئی میں پیدا ہوئے آپ کے دو بھائی اور تھے فرمایا کرتے تھے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ترتیب پر نام رکھے گئے تھے سب سے بڑے بھائی کا نام (مولوی) عبداللہ تھا، منجھلے خود (مولانا عبدالرحمٰنؒ) اور چھوٹے (حافظ) عبدالرحیم تھے۔

پانچ چھ سال کی عمر تھی کہ اپنی بہن کے ہمراہ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں اپنے بہنوئی (عبدالعزیز ساعتچی) کے پاس رہے مکہ میں اپنے ایک ہم نام حافظ صاحبؒ سے قرآن حفظ کیا یہ حافظ صاحب نگینہ کے باشندے تھے۔عبیدالرحمٰن صاحب معلم الحجاج انھیں کے پوتے ہیں۔''حفظ قرآن کے بعد پہلی محراب مسجد الحرام میں سنائی''۱۲۹۰ھ میں مکہ سے بمبئی واپس آئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲۹۲ھ سے ۱۲۹۷ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے

ساتھ ساتھ ترمذی شریف مولانا نانوتویؒ سے ان کے آخری دور میں پڑھی حضرت مولانا نانوتویؒ کی وفات کے بعد دیوبند سے مرادآباد آگئے اور یہاں سید العلماء حضرت مولانا امروہیؒ سے ۱۳۰۱ھ میں سند فراغ حاصل کی جوان کی ایک کتاب کے اندر موجود و محفوظ ہے۔

گنگوہ میں حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ سے بھی حدیث پڑھی۔ بھوپال میں قاضی محمد ایوب صاحبؒ اور حسین بن محسن یمنی خزرجی سے جو بیک واسطہ علامہ شوکانیؒ کے شاگرد تھے اور ان سے سند حدیث حاصل کی۔

گنگوہ میں حضرت حافظ احمد صاحبؒ ابن حضرت قاسم العلومؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی آپ کے ہمدرس تھے بعد فراغت چند سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں مدرس رہے پھر مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ سے تعلق ہو گیا اور اپنے استاد حضرت محدث امروہیؒ کے وصال کے بعد ۱۳۳۰ھ سے مستقل طور پر بعہدۂ صدر مدرسی و شیخ الحدیث والتفسیر فائز ہوئے۔ درمیان میں کچھ ماہ ریاست مینڈھو میں اور وفات سے چند سال پیشتر کچھ عرصہ ڈابھیل میں بعدہٗ دارالعلوم دیوبند میں درس دیا پھر امروہہ تشریف لے آئے اور آخر وقت تک باوجود ضعیفی کے درس قرآن وحدیث دیتے رہے۔

۲۳ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ کی صبح کو یہ آفتاب علم وعرفان اپنی پوری پوری تابانیوں اور ضو فشانیوں کے بعد غروب ہو گیا، صحن جامع مسجد امروہہ کے جنوبی گوشہ میں حضرت محدث امروہیؒ کے بالکل قریب جگہ پائی۔

امروہہ آپ کا وطن ثانی بن گیا تھا مگر آخر وقت تک کوئی مکان آپ نے اپنے لئے تعمیر نہیں کرایا۔ عمر کے آخری چند سال مدرسہ کی چہار دیواری میں گزارے یہاں پر کئی وقت آپ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔

آپ نے ایک بیش قیمت کتب خانہ جن میں چند نوادرات بھی ہیں مدرسہ امروہہ کو وقف کر دیا تھا حضرتؒ کو درسی مشاغل کی وجہ سے تصنیفات کا زیادہ موقع نہیں ملا بیضاوی شریف کامل، مطول اور مختصر المعانی کے حواشی آپ کے علمی آثار ہیں آپ کے شاگرد کثیر تعداد میں ملک کے ہر حصہ میں موجود ہیں

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ[1] نے بھی مدرسہ شاہی مرادآباد میں آپ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کے صاحبزادگان میں ایک صاحبزادے مولانا عبدالقیوم شفق[2] تھے۔ جو بہترین مناظر اور ملک کے مشہور قادرالکلام شاعر تھے۔ نوجوانی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت مولوی عبدالحی صاحب، مولانا عبدالقدوس[3] صاحب، حافظ عبدالسلام صاحب اور مولانا عبدالمومن صاحب چار صاحبزادے موجود ہیں۔

مولانا عبدالقدوس صاحب مدظلہ مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کے صدر مدرس اور اپنے والد ماجد کے جانشین ہیں حضرتؒ کے مریدین و مسترشدین بھی کافی تعداد میں ہیں۔

اب میں آپ کے چند ملفوظات پیش کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ ناظرین ان ملفوظات سے محظوظ ہوں گے اور ان کو پڑھ کر ان کی معلومات میں ایک مفید اضافہ ہوگا۔

حضرت مولانا نانوتویؒ سے متعلق!:

ایک مجلس میں فرمایا کہ ہم نے مولانا نانوتویؒ سے ایک مرتبہ علم لدنی کے معنی دریافت کئے تو فرمایا تم تو کھنکل ہو آئے ہو وہاں پر تم نے دیکھا ہوگا کہ گنگا سے نہر کاٹ کر نکالی گئی ہے بس یوں ہی سمجھ لو کہ جس طرح اس نہر کا پانی گنگا سے متصل ہے یہی صورت علم لدنی کی ہے کہ علم الٰہی سے اس کا اتصال ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا نانوتویؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولاناؒ نے دہلی کے مطبع مجتبائی اور میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں تصحیح کا کام کیا ہے دس روپے سے زائد تنخواہ نہیں لیتے تھے دو آدمیوں کے لئے جو ساتھ ہوتے تھے (غالباً طالب علم ہوتے ہونگے) کھانے کی بھی شرط کر لیتے تھے۔

---

[1] پاکستان کے مشہور و معروف مفتی اور صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ مفتی محمودؒ بھی آپ کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں پڑھ کر آپ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ مراجعت کی جائے مولانا عبداللہ سکھر کا مضمون مفتی صاحب پر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔

[2] مولانا عبدالقیوم شفقؒ ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم دینیہ عربیہ کی تحصیل و تکمیل جامع مسجد امروہہ میں کی۔ نہایت ذہین و ذکی تھے۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ ذہانت میں ابوالفضل اور فیضی کے مثل تھے۔ شاعری میں کم عمری کے باوجود ید طولیٰ حاصل کرلیا تھا۔ صرف ۲۴ سال کی عمر ہوئی۔ ۱۳۳۹ھ میں انتقال ہوا۔ [3] آپ کا ۹ رجون ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔ اپنے والد کے قریب دفن ہوئے۔ باقی تین صاحبزادوں کے انتقال کی تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔ (محب الحق)

فرمایا کہ میرٹھ میں مولانا احمد علی صاحب سہارن پوریؒ نے بخاری کے تحشیہ کا کام مولانا نانوتویؒ کے سپرد کر دیا تھا اس پر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ایک لڑکے کے سپرد اتنا بڑا کام کر دیا ہے یہ کیا حاشیہ لکھیں گے اس کی اطلاع جب مولانا احمد علی صاحبؒ کو ہوئی تو انھوں نے معترضین سے فرمایا کہ تم لوگ بخاری کے جتنے مشکل مقامات ہوں ان پر نشان لگالو پھر ان سے (مولانا نانوتویؒ سے) دریافت کرلو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا پھر ان مقامات کا حاشیہ منگوا کر دکھایا تو مولانا نانوتویؒ نے جو جو احتمالات پیدا کر کے ان کے جوابات دیے تھے وہ احتمالات اور شبہات ان حضرات کے احتمالات سے بھی زیادہ تھے۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ مولاناؒ کے تبحر علمی کو مان گئے۔

اسی موقع پر فرمایا کہ جہاں مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ مجھے عالم سمجھنے لگے ہیں بس انھوں نے کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر کی جس سے عام رجحان ان کی طرف نہ ہونے پائے، چنانچہ میرٹھ میں جب ان کے عالم ہونے کا پتہ چلا تو وہ ایک کتاب لیکر مولانا احمد علیؒ سہارنپوری کے پاس آجاتے اور بازاروں میں سے ہو کر گزرتے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ ایک طالب علم ہیں۔

فرمایا کہ مولاناؒ کا لباس بہت سادہ تھا ایک کرتہ ہوتا جس کو دھو کر پہن لیا کرتے تھے۔

احقر نے دریافت کیا کہ نیلی چادر کا جو کہیں کہیں ذکر آتا ہے اس کی کیا نوعیت تھی فرمایا کہ مولاناؒ چھتری تو رکھتے نہیں تھے دھوپ سے بچنے کے لئے نیلا کپڑا سر پر ڈال لیتے تھے، یہی چھتری کا کام دیتا تھا۔ فرمایا۔ مولاناؒ کے پاس (زیادہ) کتابیں نہیں تھیں صرف قرآن مجید ان کے پاس رہتا تھا اور ایک چٹائی پر بیٹھے رہتے تھے یہ سنا تھا کہ گھر میں مشکوٰۃ شریف بھی رکھی ہوئی ہے۔ فرمایا کہ مطبع احمدی میرٹھ کی مطبوعہ بخاری شریف کے حواشی کا کچھ حصہ مولانا نانوتویؒ کے دست خاص کا لکھا ہوا ہے (کاتب کی غیر حاضری کی وجہ سے کچھ حصہ کی خود ہی کتابت کی) فرمایا کہ مولانا نانوتویؒ کی ناک پر گولی کا نشان تھا (جو خفیف تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں گولی لگنے کی وجہ سے ہوا ہے)۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا نانوتویؒ ایک دن مکان کے اندر سے مٹھائی لے کر آئے اور مجھ کو دی۔ عادت اس طرح کی نہ تھی آج یہ نئی بات دیکھ کر میں نے عرض کیا یہ مٹھائی کیسی ہے فرمایا کہ ایک شخص

بیعت ہوا ہے اس کی مٹھائی ہے میں نے عرض کیا کہ حضور مجھ کو بھی اس شرف سے محروم نہ فرمائیں بیعت کرلیں فرمایا بیعت کا تعلق اصل میں تو عقیدت اور محبت سے ہے اور تم کو یہ بات حاصل ہے رسمی بیعت کی ضرورت نہیں ہے جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ جاؤ میں نے تم کو بیعت کرلیا فرمایا کرتے تھے اس طرح مجھے زبانی بیعت مولانا سے حاصل ہے یہ بھی فرمایا کہ مولانا بہت کم بیعت فرماتے تھے لیکن عورتوں کو بیعت سے منع نہیں فرمایا کرتے تھے، جب وہ بیعت ہونے کی درخواست کرتی تھیں تو بے تامل و بے اصرار بیعت فرمالیا کرتے تھے۔

دارالعلوم کا دوراول:

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں جب دیوبند پڑھنے کے لئے آیا ہوں تو وہاں شروع شروع میری طبیعت نہیں لگی میں رویا کرتا تھا مولانا رفیع الدینؒ صاحب عثانی مہتمم تھے انھوں نے اپنی فراست سے کام لیا اور مجھ کو ہم عمروں میں کھیلنے کی اجازت دیدی اس طرح میری طبیعت بہلی (کچھ عرصے بعد) میں نے مولانا نانوتویؒ سے ترمذی شروع کی ان کی طرز تقریر کے متعلق فرمایا کہ ایک ایک حدیث پر ایسی تقریر فرماتے تھے کہ سننے والے کو حیرت ہوتی تھی اس وقت تو سب باتیں سمجھ میں آجاتی تھیں پھر کسی سے اس تقریر کو دریافت کرو تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی تھی فرمایا جس زمانے میں میں دیوبند گیا تھا مدرسہ کو قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا نودرا بھی تعمیر نہیں ہوا تھا چند جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں اس زمانے میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ ملا محمود صاحبؒ مولانا منفعت علی صاحبؒ مدرس تھے اور مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم تھے۔احقر کے سوال کے جواب میں کہ کیا مولانا نانوتویؒ نے بھی مدرسہ دیوبند میں درس دیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ نہیں وہ دیوبند میں رہتے کب تھے کبھی آٹھ دس دن کو آگئے میں نے ان سے ترمذی دیوبند میں پڑھی اس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا بیمار ہوگئے تھے اور اس وجہ سے دیوبند ہی میں رہنے لگے تھے اور زیادہ عرصے تک رہے اس دوران میں ترمذی شروع کرادی میں بھی شریک ہوگیا۔

ترمذی کے درس کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ میں ترمذی کی قرآت زیادہ تر کرتا تھا ایک مرتبہ

ایک حدیث میں بے خیالی سے تَجَّر (بالتشدید) کو تجر (بغیر تشدید) پڑھ گیا۔ مولانا نے ایک خاص انداز سے باآواز بلند فرمایا تَجَّرْ۔ فرماتے تھے وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے[۱]

فرمایا اس زمانے میں دیوبند میں ۳۶ سیر کے گیہوں ملتے تھے اور ۱۷۔۱۸ سیر کا دودھ تھا میرے والد دس روپیہ ماہوار مجھے بھیجتے تھے جس میں سے پانچ روپے میں تمام کھانا ناشتہ، دودھ، چائے وغیرہ ہو جاتا تھا فرماتے تھے کہ دودھ اتنا اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا کہ اُس کی رنگت اوٹ کر سرخ ہو جاتی تھی۔

فرمایا کہ مولانا رفیع الدین عثمانی دیوبندیؒ صبح کے وقت طلبا کو نماز کے لئے یہ کہہ کر اٹھایا کرتے تھے۔ خفتو اٹھو (خفتن مصدر فارسی سے مشتق کر کے)

فرمایا کہ مدرسہ اسلامیہ امروہہ کی بنیاد مولانا نانوتویؒ کے ایما سے رکھی گئی ہے۔ حکیم عبدالصمد صاحب مرحوم نے (جو کے حضرت شاہ عبدالهادی قدس سرہٗ کی اولاد سے تھے) بیان کیا تھا کہ جب مولانا نانوتویؒ امروہہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تمہارے یہاں سے توفیض کا چشمہ جاری ہوا ہے اب بھی تم کو اجراء فیض کا انتظام کرنا چاہئے چنانچہ اسی زمانے میں مشورہ کر کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی جو مختلف محلوں میں رہا آخر میں جب مولانا امروہیؒ شاہی مدرسہ مراد آباد سے چلے آئے تو اہل امروہہ نے اُن کو یہیں روک لیا اور مدرسہ جامع مسجد میں قائم ہو گیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ حدیث جبرئیلؑ میں جبرئیلؑ نے جو حضور ﷺ سے ماالایمان، ماالاسلام اور ماالاحسان یہ تین سوال کئے ہیں اس میں ایمان سے متعلق جتنے شعبے ہیں اُن کو مولانا نانوتویؒ نے بیان کر دیا ہے اُن کی قوت بیانیہ اور علم کلام کا یہ کمال تھا کہ آدمؑ سے لے کر دورِ محمدیؐ تک جتنے شبہات ڈالے جا سکتے ہیں اُن سب کا ازالہ اپنی تصنیفات میں فرما دیا ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے الاسلام کی تشریح کی ہے اور اُن کی تصنیفات میں یہی رنگ غالب ہے اور مولانا تھانویؒ نے احسان کے مرتبہ کو

---

[۱] مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی کہتے تھے کہ یہی قصہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن نے مجھ سے بھی بیان فرمایا تھا مگر مولانا طاہر صاحب کی روایت کے مطابق اس وقت مولانا امروہی کے الفاظ یہ تھے کہ مولانا نانوتویؒ نے بڑے پرجوش آواز میں فرمایا کہ تَجَّبر! اور مولانا کی آواز کی دھمک میں اب تک اپنے سینہ میں محسوس کرتا ہوں۔ (قیصر)

واضح کیا ہے ان کے یہاں اسی کا غلبہ ہے اصلاح باطن اور تہذیب اخلاق کا سبق اُن کی ہر کتاب سے ملتا ہے۔

دیو بند سے مراد آباد:

فرمایا کہ جب مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دیو بند کی زمین مجھے پھاڑے کھاتی ہے میری طبیعت وہاں نہ لگی، امیر شاہ خاں صاحب کے ذریعہ میں وہاں سے مراد آباد مولانا امروہیؒ کی خدمت میں آ گیا[1]۔

فرمایا ادھر میرا مراد آباد آنا ہوا اُدھر میری شکایات میرے والد صاحب کے پاس پہونچیں ایک خط ایسا بھی پہونچا تھا جس پر مدرسہ کی مہر لگی ہوئی تھی میں نے اس امر کی مولانا رفیع الدین عثمانی مرحوم سے شکایت بھی کی تھی۔

ان شکایتوں کو پڑھ کر والد نے مجھے مراد آباد ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ تم نے مجھ کو بڑا سخت صدمہ پہونچایا ہے والد صاحب کی عادت اس قسم کے جملے لکھنے کی نہ تھی یہ انتہائی افسوس اور صدمہ کی وجہ سے لکھا تھا۔

اسی دوران میں مولانا عین القضاۃ صاحب کے چچا مولوی امیر علی صاحب مجھ سے ملنے کے لئے دیو بند اترے (مولوی امیر علی صاحب مکہ معظّمہ رہتے تھے میرے قیام مکہ کے زمانہ سے وہ مجھ سے واقف تھے) وہاں انھوں نے مجھے نہ پایا تو لوگوں نے اُن سے بھی میری شکائتیں کیں وہ والد کے ملنے والے تھے انھوں نے بھی والد کو خط لکھا کہ آپ کے لڑکے سے ملنے کے لئے میں دیو بند اترا اُن کو نہ پایا اور ان کی شکائتیں سن کر افسوس ہوا اتفاق کی بات اسی زمانے میں دہلی کے ایک صاحب جنکا نام محمد یوسف تھا جو نقشہ نویس تھے اور بہت ہوشیار اور قابل آدمی تھے مراد آباد آئے شاہی مدرسہ میں بھی آئے جب وہ

[1] فرماتے تھے کہ میں نے دیو بند میں مولانا نانوتویؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں ''تمہارا انتظام میر احمد حسن کے یہاں کر دیا ہے''۔ ادھر اسی زمانہ میں مولانا امروہیؒ نے استاذ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ تمہارے یہاں محی الدین پڑھنے کو آئیں گے۔ مولانا امروہی کو اس کا برابر خیال تھا کہ محی الدین سے کون مراد ہیں۔ رہے نواب محی الدین مراد آبادی وہ میرے ہمدرس ہیں۔ جب حافظ صاحب مراد آباد پہونچے اور انھوں نے اپنی ایک اور رویائے صادقہ کا تذکرہ مولانا امروہیؒ سے کیا تب ان پر منکشف ہوا کہ محی الدین یہ تھے۔ (فریدی)

مولانا امروہیؒ کے درس میں آئے تو حدیث کا سبق ہو رہا تھا مولانا امروہیؒ مجھ کو اپنے پاس مسند کے متصل بٹھایا کرتے تھے اُن صاحب نے کہا مجھ کو ایک حدیث میں شبہ ہو گیا ہے آپ کے طلبا اس کو حل کر سکیں تو اچھا ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ میں زیادہ انعام تو نہیں دے سکتا اس لئے کہ مسافر ہوں اور ابھی سفر کرنا ہے البتہ ایک چونی اُس صاحب کو انعام دونگا جو میرے شبہ کو دور کر دے اُن کا شبہ اس حدیث پر تھا۔

ولیضع یدیہ قبل رکبتیہ شبہ کی تقریر وہی مشہور تقریر ہے کہ اُس کہ شروع میں تو منع فرمایا جار ہا ہے اونٹ کی طرح سے سجدے میں نہیں جانا چاہئے ظاہر ہے کہ اونٹ پہلے اپنے اگلے قدم بچھاتا ہے جو بمنزلہ ہاتھ کہ ہیں اور بعد کو پچھلے پاؤں بچھاتا ہے آگے جس چیز کا امر ہے وہ بعینہ وہی صورت ہے جس سے منع کیا گیا ہے اس شبہ کو دور کرنا تھا۔ فرمایا کہ شراح نے اس کے بہت سے جوابات دئے ہیں میں نے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دیکھا تھا، اس وقت مولانا نانوتویؒ کی ایک بات یاد آگئی کہ اصل حدیث پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا ہے انسان خود ایک معنٰی پیدا کر کے اس میں اعتراض وارد کرتا ہے اسی اصول پر میں نے غور کیا تو بات سمجھ میں آگئی اب یہ سوال ایک طرف سے شروع ہوا پورا حلقہ تھا۔ میرا نمبر سب سے آخر میں تھا جب سب طلباء جواب دے چکے تو مجھ سے دریافت کیا گیا کہ تم بولو میں نے کہا کہ حدیث پر کوئی شبہ وارد نہیں ہو سکتا شبہ اس وجہ سے ہے کہ **ولیضع** میں جو وضع ہے اس کو رکھنے کے معنی میں لے لیا ہے حالانکہ یہاں پر ہٹانے اور دور رکھنے کے معنٰی ہیں، عن صلہ مقدر مانا جائیگا تو مطلب یہ ہوا کہ اونٹ کی بیٹھک نہ بیٹھے بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ہٹائے رکھے گھٹنوں سے پہلے۔ یعنی پہلے گھٹنے رکھے بعد کو ہاتھ رکھے پس جس چیز سے شروع میں منع فرمایا ہے اسی سے **ولیضع یدیہ** میں بھی منع کیا گیا ہے قرآن مجید میں **وضع عنک** ہے جس کے معنٰی دور کرنے کے ہیں بغیر صلہ کے بھی اسی معنٰی میں آیا ہے **ویضع الجزیہ** یعنی عیسٰی علیہ السلام جزیہ موقوف کر دیں گے۔

یہ جواب سن کر محمد یوسف صاحب دہلوی خاموش ہو گئے مولانا امروہیؒ نے اُن کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ فرمائیے آپ کا شبہ کہاں گیا انھوں نے کہا جی ہاں شبہ تو بالکل اُڑا دیا مولانا نے فرمایا اب وہ چونی انعام کی دلوائیے انھوں نے جیب سے چونی نکالی مولانا امروہیؒ نے چونی لے کر مجھے دی میں نے اُس

کے لینے میں تامل کیا اس پر مولانا نے فرمایا اس کو رکھ لو یہ انعام کی ہے میں نے حسب ارشاد رکھ لی اب مولاناؒ نے محمد یوسف صاحب دہلوی سے (یہ بھی والد صاحب کے ملنے والوں میں تھے) فرمایا کہ آپ یہ کام کریں کہ ان کے والد کو ایک خط لکھیں چنانچہ انہوں نے والد صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اُن کو مبارک باد لکھی کہ آپ کا لڑکا بہت قابل ہے اس خط کے پہونچنے پر والد صاحب کو اطمینان ہوا اور اُن کی رضامندی کے خطوط آئے۔

مولانا گنگوہیؒ سے متعلق!:

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے مولانا گنگوہیؒ کے یہاں چودہ دن میں بخاری شریف جلد ثانی پڑھی تھی۔

ایک مجلس میں مولانا گنگوہیؒ کے علم وکمال اور اُن کے تبحر اور بر وقت رفع اشکال کرنے کے سلسلے میں فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک استفتا مولانا کی خدمت میں آیا کہ نابالغ کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ ناجائز ہے ۔طلبا نے دلیل دریافت کی۔تو فرمایا دلیل ''الامام ضامن'' ہے جو تم حدیث میں پڑھ چکے ہو۔بچہ ضامن نہیں ہوسکتا، امام بھی نہیں ہوسکتا۔فرماتے تھے کہ یہ دلیل سنکر حیرت ہوگئی کہ یہ حدیث تو دیکھی اور سنی ہوئی تھی مگر اس طرف بالکل توجہ ہی نہیں ہوئی کہ اس میں سے یہ مضمون نکلتا ہے۔فرمایا خود میں نے مکہ معظمہ میں جو پہلی مرتبہ قرآن شریف تراویح میں سنایا تو میں نابالغ تھا۔

مولانا گنگوہیؒ کے تذکرے میں ایک اور واقعہ کا بھی ذکر فرمایا۔صورت واقعہ یہ تھی کہ دہلی میں پنجابیوں میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا۔اس کے غالباً چار بیٹے تھے جن میں سے ایک حنفی تھا اور باقی اہل حدیث تھے مولانا نذیر حسینؒ کا زمانہ تھا۔ان متوفی کے ترکے میں کچھ مکانات چاندنی چوک میں بھی تھے اور ان مکانات میں کسبیاں رہتی تھیں، حنفی بھائی نے اپنے حصہ میں وہ مکانات نہیں لئے بلکہ اُن کی بجائے دوسرے مکانات لئے۔اہل حدیث بھائیوں نے شوق سے وہ کسبیوں والے مکانات اپنے حصہ میں لگا لئے اور اپنے حنفی بھائی کو طعنہ دیا کہ میاں !ابوحنیفہ نے تمہارا دین تو خراب کیا ہی تھا دنیا بھی خراب کردی۔اچھے خاصے مکان زیادہ کرائے والے چھوڑ کر کم کرائے والے مکانات لے لئے اب جب کبھی

وہ حنفی بھائی نظر پڑتا تھا یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس امر کی کوئی حدیث لاؤ کہ یہ کرایہ حرام ہے اس نے ایک دن حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ یہ صورت ہے، میرے بھائی مجھے طعنہ دیتے ہیں اور حرمت کے ثابت کرنے والی حدیث طلب کرتے ہیں میں بہت پریشان ہوں اُن کے سامنے پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، گھر میں ایسے وقت جاتا ہوں کہ وہ سور ہے ہوں یا کہیں دوسری جگہ ہوں۔ اس کے ساتھ غم وغصہ کے کلمات بھی لکھے اور لکھا کہ آپ ہی میری تسلی فرمائیں گے۔ دہلی میں کسی نے تشفی نہیں کی جب یہ خط گنگوہ پہنچا مولانا نے اس خط کو سنایا اور فرمایا کہ تعجب ہے۔ دہلی تو علم کا منبع ہے وہاں کے علماء نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا۔ ان اہل حدیث کا حرمت کی حدیث طلب کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' یہ تو الٹی بات ہوگئی، حدیث اُن کو حلت کی پیش کرنی چاہئے تھی۔ ہماری دلیل تو یہ ہے جو حدیث میں موجود ہے ''مھر البغی حرام'' اب وہ حلال بتاتے ہیں تو حدیث سے ثابت کریں یہی جواب خط میں لکھدیا۔ جواب کا پہنچنا تھا کہ اس حنفی بھائی نے اپنے اہل حدیث بھائیوں کے سامنے آکر کہا کہ میاں! ہمارے پاس حرمت کی یہ دلیل موجود ہے ''مھر البغی حرام'' اب تم حلال سمجھتے ہو تو اس کی دلیل حدیث سے پیش کرو، کوئی حدیث ہوتی تو پیش کرتے آخر خاموش ہو گئے اور شرمندہ ہوئے، حنفی کو موقع ہاتھ آگیا جب وہ بھائی سامنے آتے یہ (زور سے) کہتا ''مھر البغی حرام'' ان کو سخت ندامت ہوتی تھی بالاخر انھوں نے وہ طعنہ دینا موقف کردیا۔

حنفی نے مولانا گنگوہیؒ کو شکریے کا خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے ایسا جواب مرحمت فرمایا ہے کہ میرا کام چل گیا اب وہ سب بھائی خاموش وشرمندہ ہیں کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اجازت:

حضرت مولانا گنگوہیؒ اور شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کی اجازت کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا گنگوہیؒ کے یہاں جس زمانہ میں دورۂ حدیث میں شامل ہوا گنگوہ میں ایک صاحب کا انتقال ہوا جن کا نام مولانا عبدالرحمٰن تھا اور جو حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے، اُن کے انتقال کے بعد ان کا سامان نیلام ہوا۔ میں نے اُن کے سامان میں سے ایک لفافہ جس میں

چند کاغذات تھے نیلام میں خریدا۔ اس کو جب کھولکر دیکھا تو ایک سند حدیث تھی جو مولانا ؒ نے اُن کو دی تھی اوراس میں ان تمام کتابوں کے نام درج تھے جو انھوں نے مولانا سے پڑھی تھیں۔ دوسرا کاغذ اجازت بیعت کا تھا۔ میں نے اُن کاغذات کو پڑھا اور پڑھکر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا حضرت نے اُن کو ملاحظہ فرمایا۔ سند حدیث کو تو حضرت نے رکھ لیا اور جس کاغذ میں بیعت کی اجازت تحریر تھی وہ مجھے واپس دے دیا چونکہ میرا نام اور ان مرحوم کا نام ایک تھا اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت نے گویا مجھکو اشارۃً بیعت کی اجازت دی سند حدیث والا کاغذ یہ کہکر واپس لے لیا کہ تم نے اس میں لکھی ہوئی سب کتا بیں مجھ سے نہیں پڑھی ہیں، دوسرا کاغذ (اجازت والا) تم رکھ لو۔ فرمایا اس سے پہلے میں دیوبند میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہو چکا تھا بیعت کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ جس طرح میں نے بیعت کی ہے اور جس طریقہ سے تمھارے دونوں ہاتھوں پہ ہاتھ رکھے ہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کی اجازت کا واقعہ اس طرح سنایا کہ جب امیر شاہ خان صاحب مرحوم حج کو تشریف لے گئے تو واپسی کے وقت حضرت حاجی صاحبؒ سے انھوں نے عرض کیا کہ میں ہندوستان واپس جا رہا ہوں وہاں میں اپنے دوستوں کو تحفہ لیکر جاتا وہ مجھ سے نہ ہو سکا اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے چند دوستوں کے لئے (جو آپ کے سلسلے کے ہیں) میں آپ سے اجازت نامہ حاصل کرلوں تاکہ اُن کو یہ تحفہ پیش کرسکوں۔ حضرت نے وہ فہرست لے لی جس میں خان صاحب موصوف نے اپنے دوستوں کے نام لکھے تھے اس میں ایک میرا نام بھی تھا۔ اس فہرست میں بہت سے نام تھے، حاجی صاحبؒ نے دوسرے وقت ان میں سے چند نام (غالبًا تین چار) انتخاب کئے جن کو اجازت دی اُن میں سے ایک میرا نام بھی تھا خان صاحب نے وہ اجازت نامہ مجھے لاکر دیا اور سب واقعہ بیان کیا فرمایا کہ میں حاجی صاحبؒ سے مکہ کے قیام کے زمانہ میں ملتا رہتا تھا اس زمانہ میں، میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ قیامت آگئی ہے میری زبان پر استغفار جاری ہے، سخت خوفناک سماں ہے پھر ایک مکان دیکھا جس میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہیں، وہاں تجلی باری تعالیٰ بھی دکھلائی گئی۔ جبرئیلؑ اور صحابہ کرامؓ کی بھی اس

خواب میں زیارت ہوئی، اُس مکان میں پہنچ کر وہ خوف وہراس دور ہوا۔ اسی مجلس میں حاجی صاحب کو بھی بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس خواب کو میں نے حاجی صاحب سے بیان کیا تھا، انھوں نے فرمایا تھا کہ تم کو ہمارے یہاں سے فیض ہوگا، اس کے ایک عرصے کے بعد یہ اجازت نامہ جس کا ذکر ہوا حاصل ہوا۔

فرمایا کہ میرے زمانہ میں عبداللہ مکہ کے شریف تھے اور سلطان عبدالعزیز سلطانِ ٹرکی تھے۔

ایک پیر صاحب کا واقعہ:

ایک پیر صاحب کا واقعہ سنایا کہ وہ پونہ میں آیا کرتے تھے اُن کے مریدین خلاف توحید امور کے مرتکب ہوتے تھے۔ میں نے ان مریدین کے سامنے تین آیتیں رکھیں اور کہا کہ تم جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو پکارتے ہو اس کے متعلق قرآن کا فیصلہ سنو! (۱) **انما یستجیب الذین یسمعون الأیہ (انعام) (۲) وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر) (۳) ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیٰمۃ (احقاف)**

ان تینوں آیتوں سے بطور صغریٰ وکبریٰ ونتیجہ صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ جو سنتے ہیں وہ جواب دیتے ہیں اور جو قبروں میں ہیں ان کو سنا نہیں سکتے پس نتیجہ نکلا کہ قبروں والے جواب بھی نہیں دے سکتے اب جو ایسوں کو پکاریں کہ جواب نہ دے سکیں اس سے زیادہ گمراہ کون؟ ان آیتوں کو پیر صاحب کے سامنے رکھا گیا اُن سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

شیخ طیب مکی نے (جو مشہور ادیب تھے اور ریاست رامپور میں رہتے تھے) ان آیتوں کو اس ترتیب سے سنا تو فرمایا کہ میں نے بہت سی آیتیں توحید کے مضمون کی جمع کی تھیں مگر ان تین آیتوں نے بہت ہی زبردست طریقہ سے مقصد واضح کر دیا۔

فرمایا کہ توحید کے بارے میں یہ آیت بھی جامع ہے **والذین تدعون من دونہ (الی) ولا ینبئک مثلُ خبیر. (فاطر)**

ایک مجلس میں فرمایا کہ **اعِدُّوا لھم مااستطعتم من قوۃٍ ومن رباط الخیل.** میں قوۃ کو نکرہ لایا گیا ہے جو اشارہ ہے اس طرف کہ قوت ہر زمانہ میں بدلتی رہے گی ایک زمانہ میں تیر و کمان تھے پھر کچھ

اور اور آج کچھ اور لیکن رباط الخیل اسکونکرہ نہیں لایا گیا، کیوں؟ اس وجہ سے کہ خدا کے علم میں تھا کہ قیامت تک گھوڑے سے میدان جنگ میں کام لیا جاتا رہے گا، پہلے اونٹ ہاتھی بھی جنگ میں ہوتے تھے اب دونوں کا رواج ختم ہو گیا خچر کا کام بھی گاڑیوں نے اور بار برداری کے ذرائع نے لے لیا، لیکن گھوڑا آج بھی اسی طریقہ سے رکھا جاتا ہے جس طرح پہلے رکھا جاتا تھا گھوڑے کا رسالہ ضرور ہوتا ہے، وجہ یہ کہ میدان جنگ میں گھوڑا جو کام کر لیتا ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتا اسی وجہ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے الخیل معقودٌ بنوا صیھا الخیر الی یوم القیامۃ، فرمایا کہ رسول ﷺ کا کلام اللہ ہی کا کلام ہے اس کلام سے بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ گھوڑا قیامت تک میدان جنگ میں کام دیگا پھر یہ شعر پڑھا۔

گفت الہ گفت زبان محمد است ☆ آرے زبان حق بدہان محمد است

عربی زبان ام الِسنہ ہے:

ایک دن فرمایا کہ بمبئی میں عبداللہ احمد نام کے ایک صاحب رہتے تھے اُن سے ایک شخص آ کر ملا جو کئی زبانیں جانتا تھا، اور اس کا دعویٰ تھا کہ دنیا کی جتنی زبانیں ہیں سب عربی سے نکلی ہیں، عبداللہ احمد سے وہ شخص حج کے سلسلہ میں کچھ سہولتیں چاہتے تھے انھوں نے اس کی سفارش کمشنر سے کی، اتفاق سے جس وقت وہ کمشنر سے سفارش کر رہے تھے وہ شخص آتا ہوا دکھلائی دیا، عبداللہ احمد نے کمشنر سے کہا کہ اس شخص کا کمال یہ ہے کہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ عربی تمام زبانوں کی اصل ہے خواہ کوئی سی زبان کیوں نہ ہو کمشنر نے کہا اچھا، اس شخص کو جلد بلاؤ چنانچہ بلایا گیا، کمشنر نے کہا ہم نے سنا ہے کہ تمہارا کہنا ہے کہ تمام زبانیں عربی سے نکلی ہیں اچھا یہ بتلاؤ کہ ''اندھے'' کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں اس نے کہا ''بلائنڈ'' کمشنر نے کہا یہ بتلاؤ کہ یہ لفظ عربی سے کیسے نکلا اس شخص نے جواب دیا کہ عربی میں ''بلا عین'' (بے آنکھ والا) تھا اس کو ''بلائنڈ'' کر لیا کمشنر حیران رہ گیا اور اس کے کام کو پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اس بات کا چرچا عبداللہ احمد کی مجلس میں ہوا اور ہندوستانیوں نے آپس میں کہا کہ میاں! بلائنڈ کو تو بتلا دیا اگر لفظ ''اندھا'' کے متعلق پوچھا گیا تو کیا جواب دیگا شیخ عبداللہ احمد نے کہا ٹھہر جاؤ جب وہ شخص آ جائے خود اسی سے سوال کرنا، چنانچہ اسی دن یا کسی اور دن وہ شخص ملنے آیا تو اس سے حاضرین محفل

نے سوال کیا کہ میاں! لفظ "اندھا" کے متعلق جو اردو ہے کیا کہو گے؟ اس شخص نے بے ساختہ کہا کہ عربی میں "عین ضاعً" (آنکھ ضائع ہوئی) تھا اس سے اندھا بن گیا ہے۔

زمانہ کا تفاوت اور موجودہ دور میں غفلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہمارے بچپن میں عورتیں جھولا جھلاتے وقت یہ کہتی جاتی تھیں۔

جل جلالک یامولانا ☆ نحن عبیدک لا تنانا

اسی ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ پہلے طوطوں تک کو یہ کلمات سکھلائے جاتے تھے۔

حق اللہ پاک ذات اللہ صحیح ہے ☆ خدا اور اسکا رسول غافل نہ ہو

خدا کو نہ بھول

(آج لوگ اپنے بچوں کو بھی کلمہ اور نیک بات نہیں سکھلاتے)

حضرتؒ بعض اسفار میں حضرت مولانا نانوتویؒ کے ہمراہ گئے ہیں، مظفر نگر، روڑکی، پیران کلیر کے سفروں میں کئی مرتبہ اپنی ہمراہی کا ذکر فرمایا ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کا ایک قطعہ:

حضرت مولانا نانوتویؒ کی سخن نوازی پر ایک مستقل مقالہ لکھ چکا ہوں اُس میں وہ اشعار بھی درج کر دیئے ہیں جو حضرت حافظ صاحبؒ کی زبانی سنے تھے اس لئے اُن کا اعادہ نہیں کرتا یہاں پر ایک قطعہ پیش کرتا ہوں جس کے متعلق حافظ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب حضرت مولانا نانوتویؒ پنڈت دیانند کے مقابلہ کیلئے روڑکی تشریف لے گئے تھے یہ قطعہ تحریر فرمایا تھا۔

ہم وہ نہیں ہیں دور سے باتیں کیا کریں ☆ ہم وہ نہیں ہیں دون کی بیٹھے لیا کریں

اپنا یہ قول ہے کہ ہم آئے ہیں آیئے ☆ دعویٰ اگر کیا ہے تو کچھ کر دکھایئے

ایک مرتبہ جزیرہ انڈمان کے اسیروں میں سے ایک اسیر مجاہد کی نعتیہ نظم کا یہ درد انگیز شعر سنایا۔

اے فخر نوح کیا کہیں پوچھے اگر کوئی ☆ کشتی یہ ڈوبتی ہوئی کس ناخدا کی ہے

حضرتؒ کو لسان العصر اکبر الہ آبادی کا کلام بہت پسند تھا ان کے بہت سے منتخب اشعار اپنی

بیاض میں درج فرمائے تھے یہ دو شعر اُن کے بہت پسند تھے۔

اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی آثار ونشاں سب قائم ہیں ☆ اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پر چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سر سبز شجر امید کا تھا ☆ جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

حکیم مومن خان مومن کے کلام سے بہت ربط تھا غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مومن خاندان ولی اللہی سے تلمیذانہ تعلق رکھتے تھے اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے خاص آدمی تھے۔ ایک دن ایک موقع پر مومن کا یہ شعر پڑھا۔

وہ چلا، جان چلی، دونوں یہاں سے کھسکے ☆ اس کو تھاموں کہ اُسے پاؤں پڑوں کس کس کے

اپنے اکابر کے علاوہ، دیوبند، امروہہ، رامپور، مرادآباد، بمبئی وغیرہ میں جن جن علماء و مشائخ، اطباء و ادباء اور ہر ہر فن کے ماہرین سے جو ملاقاتیں ہوئیں اُن کا تذکرہ بڑے دلچسپ پیرایہ میں کیا کرتے تھے، گنجائش نہیں ورنہ مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلیؒ، شاہ ابوالخیر دھلویؒ مولانا عین القضاۃ لکھنویؒ، مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادیؒ، نواب صدیق حسن خاںؒ اور حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ (جو آپ کی نانی کے حقیقی بھائی اور آپ کے نانا مولانا خادم حسین صاحبؒ کے مرید تھے) کی ملاقاتیں اور ان ملاقاتوں کی دل آویز باتیں جو کچھ یاد تھیں سب لکھتا۔

آپ کا طریقہ درس، طریقہ وعظ، قرآن وحدیث کے علمی نکات یہ سب پہلو باقی رہ گئے۔ اور مضمون قدرے طویل ہوگیا۔

ایک بزرگ کی بزرگانہ باتیں روح کو غیر فانی لذت اور دل کو لازوال سرور بخشتی ہیں آج حضرت حافظ صاحبؒ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے کلمات طیبات، ان کے نکات علمیہ یاد آ کر ان کی مجلس کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ ع

بوئے گل را از کہ جویم جز گلاب

اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کے اساتذہ کرام کی مغفرت بطفیل سرور کائنات ﷺ فرمائے اور ان کی قبروں کو نور سے معمور کرے۔ آمین۔

''آزاد کی کہانی'' نقد و نظر کی کسوٹی پر

مولانا آزاد مرحوم جنھیں دنیا سے رخصت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ علم و فکر اور فہم و نظر کے اعتبار سے ہندوستان ہی کی نہیں تمام دنیائے اسلام کی ایک قابل فخر شخصیت تھے۔ ان کا علمی شغف و انہماک، ان کی وسعت نظر، ان کا حافظہ، ان کی تاریخی معلومات، ان کا نہ ختم ہونے والا شوق مطالعہ، ان کی قوت اخذ و استنباط اللہ کا ایک ایسا عطیہ تھا جس کا فیضان ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و فطانت، ذکاوت و فراست اور تجربہ و مہارت کی مدد سے سیاسیات ہی میں نہیں بلکہ تاریخ و ادب کلام و عقائد میں بھی بہترین قلمی شاہکار چھوڑے اور اردو زبان کو ایسے علمی و ادبی خزانے سے مالا مال کیا جس سے ہر دور کا مورخ و ادیب فیض یاب ہوتا رہے گا۔ انھوں نے ''ترجمان القرآن'' لکھ کر اردو کی پرشکوہ تفسیر اور شاندار ترجمہ کے ذریعہ قرآن کی شوکت و عظمت کا اور اس کے معانی و بیان کی سربلندی کا بہترین انداز میں اظہار کیا۔ غرضکہ وہ نصف صدی تک علم و ادب، خطابت و بیان سیاست و فراست کی مملکت کے فرماں روا رہے اور چار دانگ عالم میں اُن کے علمی کمالات کی شہرت ہوئی۔ لیکن ان کے مفصل اور مکمل سوانح حیات نہ تو اُن کے قلم سے اُن کی حیات میں شائع ہوئے اور نہ کسی اور ہی نے اب تک یہ کام انجام دیا۔

البتہ ان کی وفات کے معا بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی[۱] نے ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ آج سے ۳۷ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نظر بند کئے گئے اور ملیح آبادی صاحب کو بھی ان کی رفاقت میسر آئی تو جیل کی اُس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ اپنے حالات قلمبند کرادیں اور پھر مولانا جو کچھ املا کراتے گئے یہ اس کو لکھتے گئے۔ اس طرح ایک نامکمل ''سوانح عمری'' انھوں نے مرتب کرلی جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ملیح آبادی صاحب لکھتے ہیں:

''آزاد کی کہانی کی شان...... یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں...... میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ

---

۱ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کا بمبئی میں ۲۴ رجون ۱۹۵۹ء کو انتقال ہوا۔ تدفین ملیح آباد میں ہوئی۔ (محب الحق)

تذکرہ کی دوسری جلد لکھا دیں۔''

ہفتوں میرے بھائی میرے بھائی کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھی بھلا پیچھا چھوڑنے والا ......تقاضا جاری رکھا آخر راضی ہو گئے اور کتاب لکھانا شروع کر دی۔ بولتے جاتے تھے اور میں پینسل سے گھسیٹتا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف کر لیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوادی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا کل کیا لکھوایا تھا۔ (ص ۱۸، ۱۹)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اپنے والد مرحوم کے حالات بھی لکھوا دئے ہیں اور خود اپنے حالات بھی چار سال کی عمر سے۔ (ص ۲۱) اسی صفحہ پر لکھتے ہیں: 'اس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ مولانا کی روزمرہ کی بات چیت قلمبند ہوگئی ہے۔'' ایک جگہ دیباچہ میں لکھتے ہیں: ''تو میں نے مولانا کو پھسلانا شروع کیا۔ پھسلانے کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے۔ بھلا مولانا کو کون پھسلا سکتا تھا۔ مگر دل کی محبت کا عالم اور ہی ہوتا ہے۔ آخر راضی ہو گئے اور تذکرہ میں جن معاملات کا اجمال ہے ان کی شرح بھی آ گئی مگر ہوا کیا دوسرے دن صبح ہی مسودہ لوٹا لیا گیا۔ فرمایا نظر ثانی کر لوں۔ عرض کیا آپ کی نظر ثانی کا حال معلوم ہے یعنی مسودہ غائب اور ہوا بھی یہی۔ (ص ۲۰، ۲۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں بعینہ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا۔ میں نے اس میں کسی قسم کا بھی تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے۔ عجائبات روزگار میں سے یہ کتاب بھی اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بھولے نہیں۔ مگر لکھا دینے کے بعد اس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے۔ مجھے حق الیقین ہے کتاب یاد آ جاتی تو ''نظر ثانی'' کے بہانے ضرور چھین لیتے اور کتاب اُن کے بیشمار مسودوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی...... ہر ملاقات پر دل دھڑکتا کہیں کتاب مانگ نہ بیٹھیں۔ خود میں بھی اپنی جگہ بڑا ''کائیاں'' تھا۔ کتاب کا معاملہ اس طرح غائب رکھا جیسے موجود ہی نہیں۔ آپ کو کئی جگہ حاشیے میں نظر آئے گا مسودے میں جگہ خالی ہے۔ اسی لئے کہ مولانا کو یاد ہوا نہیں اور کتاب دنیا سے محروم ہو گئی۔ (ص ۲۴)

میں نے اس کتاب کو جو بقول مولانا ملیح آبادی عجائبات روزگار میں سے ایک عجوبہ

ہے۔ ذوق و شوق کی نظر سے دیکھا، کتاب واقعی بڑی دلچسپ ہے اور ایک تاریخی عظمت رکھنے والے انسان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں ایک خاص دلکشی بھی ہے۔ لیکن تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مولانا آزاد ہی کی لکھائی ہوئی اور بعینہ انھیں کے الفاظ میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوائی کہ کوئی نوٹ تک اُن کے سامنے نہ ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کے خداداد حافظہ کے پیش نظر جس کا مولانا ملیح آبادی نے بھی ذکر کیا ہے اور خود مولانا نے بھی اپنے بعض مضامین و خطوط میں اللہ کے اس انعام کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بات مستبعد نظر آتی ہے کہ مولانا کو اپنی ذات یا اپنے بزرگوں کے حالات، واقعات لکھواتے وقت ایسا تسامح ہوا ہو جس سے واقعہ کا وقوع ہی تاریخی و تحقیقی حیثیت سے ناممکن ہو جائے یا واقعات کے ضبط سنین میں ایسا تضاد و تناقض ہو کہ جس سے واقعہ کے وقوع ہی کی نفی ہوتی ہو۔ اس کتاب میں جو بہت سی تاریخی غلطیاں ہیں وہ تسامح اور سہو کے ذیل میں نہیں آتیں اور نہ اسماء رجال، اسماء کتب اور اسماء آثار کی بعض اغلاط کو کاتب کے سر ڈالا جا سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مولانا آزاد کے ایک استاذ کا نام تک بار بار غلط آتا ہے۔

اس کتاب کو برادرم حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ندوی مدظلہ[1] نے بھی غور و خوض کے ساتھ ملاحظہ فرمایا۔ جنھیں مولانا آزاد سے اجراء ''الہلال'' کے زمانے سے ہی غیر معمولی عقیدت پیدا ہو گئی تھی

[1] مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ان گمنام اہل علم اور اہل فکر و نظر میں سے ہیں جو اپنی خداداد ذہانت ذوق صحیح وسیع مطالعہ اور سلامت فکر کے لحاظ سے بڑے بلند مقام کے حامل ہیں لیکن اپنی گوشہ نشینی اور خاموشی کی وجہ سے بہت کم معروف ہیں۔ مولانا کا دادھیال امروہہ کا مشہور رضوی سادات کا خاندان ہے اور ننھیال خانوادہ سید احمد شہیدؒ ہے۔ ان کے دادا مولانا حکیم علی حسن صاحب نامور طبیب حضرت مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلویؒ کے شاگرد رشید تھے اور نواب سید صدیق حسن خاں وغیرہ کے ہم سبق تھے۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے تھا۔ مولانا کے والد حکیم سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ امروہی بڑے حاذق طبیب اور بڑے ذہین تھے۔ حکیم حسن مثنیٰ صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ان کو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ تاریخ و انساب پر ان کی بڑی وسیع اور گہری نظر ہے اور کم لوگ اس موضوع پر ان کے پایہ کے ہیں۔ عربی اور اردو ادب اور شعر و سخن کا بھی بڑا بلند اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے بعض عوارض اور امراض کی وجہ سے وہ عرصہ سے گوشہ گیر ہیں۔ اگر وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو ہندوستان کے صف اول کے مصنفین میں ان کا شمار ہوتا۔ (فریدی) مولانا رضوی صاحب کی ولادت ۳ر صفر ۱۳۱۱ھ موافق ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ سیاست میں بھی دخل تھا۔ امروہہ کانگریس کے سب سے پہلے صدر اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک امروہہ میونسپل بورڈ کے چیئر مین رہے۔ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے بیعت تھے۔ ۲۸ر رجب ۱۳۸۲ھ موافق ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔ (محب الحق)

اور بعض اہم علمی اور تاریخی موضوعوں پر ان کی مکاتبت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔انھوں نے بعد مطالعہ اس کتاب کے قابل تحقیق اور لائق تنقید مقامات کی نشاندہی کی اور اجمالی طور پر کچھ زبانی تبصرہ فرمایا۔اس کے بعد میں نے دوبارہ ان مقامات کو دیکھا اور متعدد کتابوں اور بعض اہل تحقیق اُدباء سے ان کے بارے میں رجوع کیا۔میں نے جتنا جتنا اس کتاب کے قابل تنقید مقامات پر غور کیا میرے دل نے بے ساختہ یہ کہا: کاش یہ کتاب صرف ''کہانی'' نہ ہوتی۔مولانا آزاد کی شان کے مطابق اُن کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی۔اس میں حقائق ہوتے، صحیح واقعات ہوتے۔مجھے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دشواری پیش آرہی ہے۔ادھر مولانا آزاد کی کہانی اور بقول ملیح آبادی صاحب انھیں کی زبانی میرے سامنے ہے۔اور دوسری طرف تاریخی حقائق کی روشنی میں بات کچھ کی کچھ ہے۔

مولانا ملیح آبادی صاحب پر (جن کی حیثیت محض ناشر و کاتب کی ہے) خیانت وعدم دیانت کا الزام بلا دلیل لگایا نہیں جا سکتا۔وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے اس میں کسی قسم کا تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے۔بلکہ ایسا گمان کرنا بھی مشکل ہے۔اس لئے کہ مولانا ملیح آبادی کا مولانا مرحوم سے جیسا تعلق ہے وہ اس طرح کی کسی بات کے بالکل منافی ہے۔دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا آزاد ایسی صریح غلطیاں کریں اور ایسی ہوائی باتیں املا کرائیں جیسی اس کتاب میں موجود ہیں۔کیا اچھا ہوتا اگر مولانا ملیح آبادی جرأت و ہمت سے کام لے کر مولانا کی زندگی ہی میں اس کہانی کو شائع کر دیتے۔اب کس سے دریافت کیا جائے کہ حقیقت کیا ہے؟ اور کون جواب دے۔تسوید و ترتیب کے ۳۷ سال بعد اور مولانا کی وفات کے معاً بعد اس کا منصۂ شہود پر آنا پتہ نہیں کس مصلحت پر مبنی ہے؟ مولانا ملیح آبادی مجھے معاف فرمائیں میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ بہتر یہی ہوتا کہ ''ترجمان القرآن'' کا مؤلف جلیل ''الہلال'' کا مدیر اعلیٰ اس کہانی کے پورے مسودے کو غائب کر دیتا اور اس ''عجوبۂ روزگار'' کے مطالعہ کا موقع کسی کو نہ ملتا۔بہر حال اب جب کہ یہ کہانی سامنے آچکی ہے تو یہ فیصلہ تو وہ لوگ کریں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کے پاس اس باب میں کچھ معلومات ہوں کہ اس کہانی کی اصلیت کیا ہے۔میں نے تو محض سامنے آئی ہوئی ایک کتاب پر تنقید کی حیثیت سے اس کے کچھ واقعات اور بیانات کو تاریخی اور تحقیقی نقطہ نظر سے پرکھا ہے اور وہی قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔اس تبصرہ سے میری غرض تاریخی حقائق کا اجاگر کرنا ہے اور بس۔۔۔۔۔میں مولانا آزاد کی علمی اور ادبی بلندی کا قائل اور

معترف تھا اور ہوں۔ ان کی محبت اور ان کی تحریروں سے قلبی تعلق مجھے شروع ہی سے ہے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اس تبصرے میں کتاب کے تمام گوشوں کو لے لیا ہے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تنقید کرتے وقت خود مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ مگر جہاں تک میری استطاعت کا تعلق ہے میں نے خوب تلاش و جستجو کر کے یہ مختصر تبصرہ لکھا ہے۔ میرے اس تبصرے میں خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واقعات پر دوسرے واقعات کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تفصیل ملے گی۔ اور سچ پوچھئے تو اس تبصرے کا خاص محرک بھی یہ جذبہ ہے کہ خاندانِ ولی اللّٰہی کے صاف وشفاف دامن پر جو غلط دھبے لگائے گئے ہیں وہ صاف ہو جائیں۔ قلت فرصت کے باعث اس نقطہ نظر سے بھی کچھ گوشے تشنہ تنقید رہ گئے ہوں تو بعید نہیں۔

سب سے پہلے اسمائے رجال اور اسمائے کتب وغیرہ کو لیجئے۔ اور ملاحظہ فرمائیے یہ تسامحات مولانا کی مشہور و مسلّم قوت حافظہ سے کس قدر بعید معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ص ۴۴، ۴۵ پر مولانا منور الدین کے مشاہیر تلامذہ کے نام گناتے ہوئے لکھا ہے:

مولوی محبوب علی جو غدر سے پہلے دہلی کے مشہور عالم تھے۔ مولوی فضل امام جو فضل حق کے والد تھے مولوی فضل رسول بدایونی اور مولانا محمد علی گوپا مؤی "صاحب کشاف اصطلاحات الفنون" وغیرہ۔

اس جگہ صرف آخری شاگرد کے متعلق عرض کرنا ہے (مولانا منور الدین کے دوسرے شاگردوں کی بحث آگے آرہی ہے) "صاحب کشاف اصطلاحات الفنون" کا اسم گرامی تو قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ ہے جو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے ساکن تھے۔ مولانا محمد علی گوپا مؤی (بشرطیکہ اس نام کے کوئی مشہور عالم گوپا مؤ میں گذرے بھی ہوں) صاحب "کشاف اصطلاحات الفنون" نہیں ہیں۔ کہانی کے ص ۲۶۲ پر ان صاحب کو مولوی علی تھانوی فرمایا ہے۔ "ایک عجیب رسالہ مولوی علی تھانوی صاحب اصطلاحات الفنون کا بھی ملا۔" ص ۲۶۲۔ اس جگہ نسبت مکانی صحیح ہے نام پھر غلط ہے۔

(۲) ص ۶۷ پر مشہور مناظر و ادیب مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ شاگرد شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کو مولانا رشید الدین معقولی صاحب رشیدیہ لکھا ہے۔ حالانکہ رشیدیہ کے مصنف دوسرے ہیں۔ ان کا نام نامی شیخ محمد رشید جونپوریؒ ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے مشہور و جلیل القدر عالم اور شیخ طریقت تھے یعنی شاہ عبد العزیزؒ سے بھی متقدم!

(۳) قصبہ نیمی ضلع عظیم آباد (پٹنہ) کے مشہور محدث و ادیب جو خود مولانا آزاد کے اردو

مولانا آزاد کا خاندانی سلسلہ

شیخ جمال الدین:

''میرے خاندانی سلسلہ میں سب سے پہلے شیخ جمال الدین معروف ...... بہ بہلول دہلوی کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ ان کا وطن دہلی مرحوم تھا اور عہد اکبری کے مشاہیر علماء اور اصحاب سلوک و طریقت میں سے تھے۔ص ۲۵

شیخ جمال الدین دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے منتخب التواریخ، تذکرۃ الواصلین اور اخبار الاخیار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ منتخب اور تذکرۃ الواصلین تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے البتہ اخبار الاخیار (مؤلفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ) کو دیکھا تو عجیب حیرت انگیز انکشاف ہوا وہ یہ کہ شیخ جمال الدینؒ دہلوی کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے کہانی میں شیخ عبدالحق دہلویؒ کی جو جو شہادتیں بحوالہ اخبار الاخیار پیش کی ہیں وہ شیخ جمال الدین کے بارے میں نہیں ہیں دوسرے بزرگوں سے متعلق ہیں۔

اخبار الاخیار میں شاہ قیصؒ کا تذکرہ ہے۔ اس میں شیخ محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں:

''وازانجملہ شیخ عبدالرزاق المشہور بشیخ بہلول مرید وخلیفہ اوست جامع است میان علم شریعت و طریقت از اول فطرت برنشاۃ عبادت وتقویٰ وصلاح برآمدہ و برعصمت ذاتی نشو ونمایافتہ۔ بعد تحصیل علوم دینی بہ تہذیب اخلاق وتبدیل صفات موفق شد۔ والحق دریں زماں روزمرہ درویشاں و سالکاں اینچنیں مردم درسلوک ایں طریق و رسوخ قدم و اتباع سنت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر و عزیز الوجودند'' اخبار الاخیار ص ۱۹۹ مطبوعہ محمدی پریس دہلی۔

کہیں کہیں ایک دو لفظوں کا فرق کر کے بعینیہ یہی عبارت آزاد کی کہانی میں شیخ جمال الدین کے بارے میں ملے گی۔ص ۳۲ غالباً شیخ جمال الدین کی عرفیت شیخ بہلول دہلوی اسی لئے تجویز کی گئی ہے کہ شیخ عبدالرزاق المشہور بشیخ بہلول کا خلعت کمال اُن کے جسم زیبا پر کچھ نہ کچھ درست آجائے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ شیخ بہلول کا نام عبدالرزاق ہے اور اتفاق سے سکونت بھی دہلی کی نہیں ہے۔ کہانی کے ص ۳۱ پر انہیں شیخ جمال الدین کے حق میں اخبار الاخیار کی یہ عبارت بھی بتائی گئی ہے۔

''شیخ قطب عالم می گفت کہ چوں بملازمت او رسیدم بجہت غلبہ وعظ و نصیحت

تقریب سر بر آوردہ فرمود مہدویہ فرقہ ضالہ اند۔

حالانکہ یہ عبارت شیخ داؤدؒ مرید و خلیفہ مخدوم شیخ حامد الحسنی الجیلانیؒ کے بارے میں ہے۔

شیخ قطب عالم شیخ داؤدؒ کے پاس پہونچے تھے نہ کہ شیخ جمال الدین دہلوی کے پاس (دیکھئے اخبار الاخیار ص ۱۹۹)۔ کہانی میں صاحب تذکرہ کے حوالے سے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا یہ قول بھی شیخ جمال الدین کے بارے میں درج ہے کہ: "واز تصنیفات اوست شرح اصول بزودی" ص ۳۲

مگر شیخ محدثؒ نے تو اخبار الاخیار میں شرح بزودی کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تصنیف بتایا ہے اور دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے ایک تو خود قاضی دولت آبادیؒ کے تذکرہ میں دوسرے شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ کے ذکر میں کہ شیخ جونپوری کی خاطر شرح اصول بزودی قاضی صاحب نے لکھی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے اخبار الاخیار ص ۱۷۲، ۱۷۳)

شیخ محمد:

شیخ جمال الدین کے لڑکے شیخ محمد تھے...... ان پر تصوف و سلوک کا غلبہ تھا اور دہلی میں حضرت سید (؟) احمد سرہندی مجدد کے خلیفہ تھے...... مجدد صاحب کے مکتوبات کے تیسرے حصہ میں ان کے نام دو خط ہیں۔ ایک فارسی میں دوسرا عربی میں۔ ص ۳۳

زبدۃ المقامات میں مولانا ہاشم کشمیؒ نے حضرت مجددؒ کے قریب قریب تمام خلفاء کا ذکر کیا ہے۔ احقر کا ایک مقالہ جو تذکرۂ خلفاء مجدد الف ثانیؒ کے عنوان سے الفرقان کے مجدد الف ثانیؒ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اسی سے ماخوذ ہے۔ اس میں کہیں شیخ محمد دہلوی کا نام حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے نہیں اور نہ کسی اور کتاب میں ان کی یہ حیثیت معلوم ہوئی اور نہ مکتوبات کی تیسری جلد بلکہ ہر سہ جلد) میں ان کے نام کے دو خط ملے جو فارسی و عربی میں ہوں۔

شیخ محمد احسن کے صاحبزادے:

شیخ محمد احسن کے تین لڑکے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محمد یوسف تھے جنھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علوم کی تکمیل کی تھی۔ غدر سے سات آٹھ سال پہلے جب شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب نے ہجرت کی تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ ص ۶۳

شاہ عبدالعزیزؒ کے تلامذہ میں سے شیخ محمد یوسف نام کے کوئی بزرگ کسی کتاب میں نظر سے نہیں

گذرے۔ تعجب ہے کہ یہ دہلی کے باشندے تھے اور معمولی خاندان کے آدمی بھی نہ تھے پھر ذاتی حیثیت سے بھی ان کی یہ خصوصیت تھی کہ آفتاب علم و عمل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا پھر بھی دہلی اور بیرون دہلی کے کسی مورخ اور تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ علاوہ ازیں شاہ محمد اسحاق دہلویؒ اوران کے برادر خورد شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ نے ۱۲۵۸ھ میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال پہلے ہجرت کی ہے نہ کہ سات آٹھ سال پہلے۔ میر ظہور علی صاحب نے ان کی تاریخ ہجرت یوں لکھی [1] ہے:

مولوی اسحاق صاحب با کمال ☆ ترک خانہ کرد سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور ☆ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت

۱۲۵۸ھ

(احکام العیدین مؤلفہ نواب قطب الدین خاں دہلویؒ)

اس موقع پر اتنا عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شیخ محمد اور شیخ محمد احسن کے درمیان جو چھ سات پیڑھیاں ہوں گی ان میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے یہ کیوں کر باور کیا جائے کہ مولانا کو اپنے ان درمیانی اجداد کے نام معلوم نہ تھے اور اس وجہ سے یہ سلسلہ غیر متصل رہ گیا...... یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ شیخ جمال الدین دہلوی کا خاندان دہلی کے کس محلے میں بود و باش رکھتا تھا حتیٰ کہ خود مولانا کے دادا اور والد کے متعلق اس کتاب سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ دہلی کے کس محلے میں رہتے تھے۔

شیخ منورالدین:

اس کتاب میں سب سے زیادہ معرکۃ الآراء شخصیت مولانا منورالدین کی ہے۔ جو مولانا آزاد کے والد (مولانا خیر الدین) کے نانا تھے۔ ان کے متعلق مولانا آزاد کی زبانی تفصیلی حالات درج کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم علماء لاہور سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کی اجازت کے بغیر دہلی آ گئے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔

---

[1] مولوی بشیر نے دار الحکومت دہلی میں اور جناب غلام رسول مہر نے جماعت مجاہدین میں شاہ محمد اسحاق محدث کی تاریخ ہجرت ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) لکھی ہے۔ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مؤلف شاندار ماضی نے الفرقان کے شہید نمبر میں ۱۲۶۲ھ میں ان کی ہجرت تحریر کی ہے۔ حیات ولی میں ۱۲۶۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے اور تاریخ ہجرت کا ذکر نہیں کیا۔ نواب قطب الدین خاں دہلویؒ مؤلف مظاہر حق نے جو کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے احکام العیدین کے دیباچہ میں دو تاریخیں انکی ہجرت کی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صحیح سال ہجرت ۱۲۵۸ھ ہے۔ (فریدی)

۱۸۰۳ء کو یہ دہلی پہونچے تھے۔ چھ سال تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔ مکان پر کسی کو اپنے دہلی آنے کی اطلاع نہیں دی۔ شاہ صاحبؒ کے اولین تلامذہ مولانا رشید الدینؒ، مولوی برہان الدین، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، شاہ احمد سعیدؒ اور مولانا محمد وجیہ وغیرہ ان کے ہمدرس تھے۔ چھ سال کے بعد جب ان کے والد کے شہید ہونے کی خبر آئی تو یہ ''قصور'' چلے گئے اور وہاں سے اپنے اعزا کو لاکر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اپنا ایک مستقل حلقہ درس قائم کیا۔ بنگال اور دیگر اطراف ہند سے طلباء جوق در جوق مولانا منور الدین کے پاس آنے لگے۔

مولانا سدید الدینؒ، مولوی محبوب علیؒ، مولوی فضل امامؒ جو مولانا فضل حقؒ خیر آبادی کے والد تھے۔ مولوی فضل رسول بدایوئی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون مولانا منور الدینؒ کے شاگرد تھے۔ (دیکھئے ص ۴۱ تا ۴۵)

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا منور الدین نام کی دہلی میں کوئی ایسی شخصیت ہوئی بھی ہے جس کی یہ امتیازی خصوصیات ہوں؟ مجھ کو باوجود تلاش بسیار اس نام کا کوئی ایسا شخص نہ ملا جو شاہ صاحب کی شاگردی کا شرف بھی رکھتا ہو اور اطراف ہند سے طلباء جوق در جوق اس کے حلقہ درس میں آتے ہوں حیات عزیزی، حالات عزیزی تذکرہ علمائے ہند نیز اس زمانے کے فتاوی اور ان کی مہروں کو دیکھا۔ کہیں اس عظیم الشان شخصیت کا نام ونشان نہ ملا۔ ذرا غور تو فرمایئے مولانا منور الدین ۱۸۰۳ء میں دہلی پہونچے ہیں۔ چھ سال (۱۸۰۹ء تک) تعلیم میں مشغول رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ کو فارغ ہوئے کئی سال گذر گئے تھے۔ کیونکہ حضرت شہیدؒ سولہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے ہیں۔ ۲۹ را پریل ۱۷۷۹ء آپ کا سال پیدائش ہے ۱۸۰۳ء میں جب مولانا منور الدین نے دہلی آکر پڑھنا شروع کیا ہے مولانا شہید کی عمر تقریباً ۲۴ سال ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کو درس دیتے ہوئے بھی چھ سات سال ہو چکے تھے اور ۱۸۰۹ء میں جب مولانا منور الدین فارغ ہوئے (جیسا کہ کہانی میں مذکور ہے) اس زمانے میں تو شاہ صاحبؒ کا آفتاب علم نصف النہار پر چمک رہا تھا پھر مولانا منور الدین کا شاہ صاحبؒ کا ہمدرس ہونا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے۔ مولانا رشید الدین دہلویؒ بھی شاہ صاحبؒ کے قدیم ترین تلامذہ میں سے ہیں اور وہ یقیناً مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ سے بھی پہلے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کا مولانا منور الدین کا ہمدرس ہونا اور بھی بعید ہے۔

شاہ احمد سعید[1] دہلوی مہاجرؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے نہیں بلکہ ان کے شاگردوں سے پڑھا ہے۔ وہ کہاں سے ہمدرس ہو سکتے ہیں۔ رہ گئے مولوی برہان الدین اور مولانا محمد وجیہ ان سے مجھے کوئی واقفیت نہیں اور پتہ نہیں کہ یہ کس کے شاگرد تھے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منور الدین کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا محبوب علی، مولانا فضل امام، مولوی فضل رسول بدایونی اور صاحب کشاف اصطلاحات الفنون نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں مولانا محبوب علی تو حضرت شاہ صاحبؒ کے مشہور شاگرد ہیں۔ رہے مولانا فضل امام وہ ایک علمی خانوادے کے بانی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے معاصرین میں سے ہیں اور مولانا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے شاگرد رشید ہیں اور مولانا منور الدین کے دہلی آنے سے مدتوں پہلے دہلی کے صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق مرحوم کا ہی شاگرد مولانا منور الدین کو ثابت کرنا مشکل ہے چہ جائیکہ اُن کے والد جو مولانا منور الدین کے پیدا ہونے سے بھی پہلے صاحب درس و افادہ اور مشاہیر علماء میں سے تھے۔ مولوی فضل رسول بدایونی کے متعلق سنیئے وہ تحصیل علم کے لئے دہلی ہی نہیں آئے چہ جائیکہ مولانا منور الدین کے آگے زانوئے تلمذ طے کرتے۔ ان کے استادوں کی فہرست اکمل التواریخ جلد دوم مؤلفہ محمد یعقوب بدایونی میں حسب ذیل ہے:

(۱) ان کے والد (۲) دادا (۳) مولانا نور الحق فرنگی محلی (۴) حکیم بر علی موہانی (۵) شیخ محمد عابد مدنی (۶) مولانا عبداللہ سراج مکی (اکمل التواریخ ص ۱۵ تا ۲۰)

اس فہرست میں مولانا منور الدین کا نام کہیں بھی نہیں۔

اب رہ جاتے ہیں صاحب کشاف اصطلاحات الفنون ’قاضی محمد اعلیٰ تھانوی‘ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی عمر میں کہیں بڑے تھے[2]۔ بھلا جو شخص شاہ صاحب سے بھی عمر میں بڑا ہو اور جس نے

[1] انوار العارفین ص ۴۹۹ پر شاہ احمد سعیدؒ کے تذکرے میں ہے۔ علوم عقلیہ از مولوی فضل امام و مفتی شرف الدین وغیرہ ہما خواندند و حدیث شریف از تلامیذ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ مثل رشید الدین خاں وغیرہ خواندند۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے ان کے آخری دور میں صرف اجازت اسانید علم حدیث حاصل کی ہو تو بعید نہیں جیسا کہ بعض کتب سے ظاہر ہوتا ہے۔ (فریدی)

[2] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے سلسلۃ العسجد فی مشائخ الہند کے آخر میں جو اپنے کتب خانہ خاص کی فہرست دی ہے اس میں کشاف اصطلاحات الفنون کا اندراج بھی ہے۔ انھوں نے اُس کتاب کا سن تالیف ۱۱۵۸ھ لکھا ہے۔ اس لحاظ سے قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی پیدائش سے بھی پیشتر صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ ان کے نام حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا ایک مکتوب (غیر مطبوعہ) دیکھنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ان کا زمانہ پایا ہے۔ (فریدی)

شاہ صاحبؒ کے پیدا ہونے سے بھی ایک سال پیشتر کشاف اصطلاحات الفنون جیسی معرکۃ الآراء کتاب تالیف کی ہو، کوئی تک ہے کہ اس کو مولانا منور الدین صاحب کا شاگرد بتایا جائے۔ الغرض نہ تو مولانا منور الدین شاہ صاحبؒ کے اولین یا آخرین تلامذہ میں سے ہیں اور نہ ان کے شاگرد۔ یہ وہ اشخاص ہیں جو فہرست میں دکھائے گئے ہیں۔ مجھے تو ان بزرگوار کا وجود ہی دہلی کے علماء میں نہیں مل سکا۔ میں حیران ہوں کہ مولانا منور الدین کو کس کا شاگرد اور کس کا استاد قرار دوں۔

ایک اور تعجب انگیز بات ان بزرگ کے متعلق پڑھیئے:

''بالآخر جب ان کی (مولانا منور الدین کی) شہرت بہت ہوئی اور علم کے علاوہ سلوک وطریقت میں بھی مشہور ہوئے جس کا سلسلہ انھیں اپنے والد اور شاہ عبدالعزیزؒ سے پہونچا تھا تو شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں ان کو مغلیہ سلطنت کا رکن المدرسین بنادیا گیا۔'' ص ۴۵

قطع نظر اس بات کے کہ یہ بزرگ حضرت شاہ صاحبؒ سے علم باطن میں منسلک تھے یا نہیں؟ اور ان کے والد کون سے روحانی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے؟ غور طلب یہ امر ہے کہ شاہ عالم ثانی کے عہد آخر میں یہ رکن المدرسین کس طرح بنے جب کہ ۱۸۰۹ء میں فارغ ہوئے اور شاہ عالم کا انتقال (۷/ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء کو) ان کے فارغ ہونے سے تقریباً تین سال پیشتر ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں رکن المدرسین بھی عہد مغلیہ میں کوئی عہدہ تھا؟ جو ایک طرح کی وزارت تعلیم تھی۔ اس کو علم تاریخ کے ماہرین خصوصاً مغل سلاطین کے انتظام سلطنت اور قوانین مملکت سے واقفیت رکھنے والے ہی اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔ کم از کم میری نظر سے تو عہد مغلیہ کے آئین و دستور میں اس نام کا یا ملک العلماء، نقیب الاولیاء اور ملک الاطباء کا کوئی عہدہ نہیں گذرا اور نہ وہ فرائض واختیارات جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں نظر سے گذرے۔ آئین اکبری میں ان چاروں عہدوں میں سے کسی کا وجود نہیں ہے اور اگر اس کے بعد یہ عہدے قائم ہوئے تھے تو جہانگیر سے لیکر اکبر شاہ ثانی تک کی تاریخوں میں ان کا تذکرہ ہوتا۔ ماثر الامراء اور ماثر عالمگیری میں چھوٹے چھوٹے عہدے دار اور امراء تک کا بھی ذکر ہے مگر ان چاروں القاب میں سے کسی ایک لقب کے ساتھ بھی کسی عہدے دار کا ذکر نہیں۔

جامع مسجد دہلی کا مدرسہ نیز دیگر مدارس اور مولانا منور الدین:

''جامع مسجد کے مدرسے اور بعض اطراف کے مدرسوں میں تقریباً پانچسو طلباء کی ضروریات کا

انتظام ہوتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد انھوں نے (مولانا منورالدین نے) شاہ صاحبؒ کے نہج کے حلقۂ درس کو جو شاہ ولی اللہؒ کے وقت سے چلا آتا تھا ایک باقاعدہ مدرسہ کی صورت میں ''مدرسہ عزیزیہ'' کے نام سے بنادیا...... مختلف مساجد جو غیر آباد تھیں انھوں نے ان میں مدرسے قائم کئے چنانچہ بیگم اورنگ کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو اب ''حصار'' کے متصل چھاونی میں آگئی ہے۔ یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے نمونے پر ہے۔ اس میں دورویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں اور لکھا ہے کہ ان سب میں طالب علم تھے اور شاہ عبدالقادر مترجم قرآن اس کے منتظم تھے۔ جامع مسجد کے تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں شاہجہاں نے مدرسہ قائم کیا تھا اور اوپر کی گیلری بھی مدرسہ کے کام آتی تھی۔ شاہ عبدالرحیمؒ اس مدرسہ میں درس دے چکے ہیں لیکن تنزل حکومت کے بعد یہ مدرسہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ مگر انھوں نے (مولانا منور الدین نے) اپنے زمانہ رکن المدرسی میں از سرنو اسے جاری کیا اور مفتی صدرالدین جو اس وقت نئے فارغ ہوئے تھے اس کے مہتمم وصدر مدرس قرار پائے۔ یہ درس گاہ غدر سے کچھ پہلے تک رہی۔'' ص ۴۷ تا ۴۸

اس بیان کے متعلق حسب ذیل گذارشات ہیں:

(۱) شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد مولانا منورالدین نے شاہ صاحبؒ کے نہج کے حلقہ درس کو جو شاہ ولی اللہؒ کے وقت سے چلا آتا تھا مدرسہ عزیزیہ بنادیا۔ یہ ایک ایسا نیا انکشاف ہے جو نہ واقعات دارالحکومت کے مؤلف کو معلوم نہ حیات ولی اور حیات عزیزی کے جامع ومرتب کو۔ کاش کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلتا کہ مدرسہ رحیمیہ کہاں تھا؟ اور یہ نہج کا حلقہ درس کس محلے میں تھا؟ پھر مولانا منورالدین نے مدرسہ عزیزیہ کا سنگ بنیاد کس جگہ نصب کیا۔ (۲) جس مسجد میں شاہ عبدالقادرؒ رہتے تھے وہ اکبر آبادی مسجد تھی (اورنگ کی مسجد نہ تھی) شاہجہاں کی زوجہ فتحپوری بیگم کی مسجد فتحپوری جس طرح آباد رہی اس کی دوسری بیوی اکبر آبادی بیگم کی مسجد بھی ۱۸۵۷ء تک بڑی شان وشوکت کے ساتھ گلزار بنی رہی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے دور میں تو وہ مسجد ایک خاص تبلیغی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ مجاہدین کا ملجاو ماویٰ تھی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کا مرجع وموقف تھی۔ ان حضرات کے بعد بھی اس مسجد کی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ مسجد ۱۸۵۷ء تک کبھی غیر آباد نہیں رہی۔ اس مسجد کی مرکزیت ہی کو پیش نظر رکھ کر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں اس مسجد کو تباہ وبرباد کر دیا۔

(۳) ''جواب حصار کے متصل چھاونی میں آگئی ہے یہ مسجد چھوٹے پیمانے پر جامع مسجد کے

نمونے پر ہے۔اس میں دورویہ تقریباً ساٹھ حجرے ہیں'' (آزاد کی کہانی)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد منہدم نہیں ہوئی۔ابھی موجود ہے۔ چھاونی کے اندر آ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا تذکرہ دارالحکومت دہلی یا آثار الصنادید میں ضرور[1] ہوتا۔لیکن دہلی مرحوم کا ہر تذکرہ اس مسجد کے تذکرے سے خالی ہے۔

دارالحکومت دہلی میں لکھا ہے کہ:

''فیض بازار دہلی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نظر ہوئی۔محل وموقع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے۔اس کے آگے لکھا ہے:

''جس وقت اس کے (پارک) لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں۔ ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی۔ [2]

(۴) جامع مسجد دہلی کا مدرسہ تینوں دروازوں کے بالائی حجروں میں نہیں تھا بلکہ مدرسہ کی عمارت جامع مسجد کے نیچے تھی اور جامع مسجد دہلی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تعمیر ہوئی تھی۔اس مدرسہ کا نام دارالبقاء تھا۔

مرقع سلاطین مؤلفہ منشی محمد عبدالغفور دہلوی میں لکھا ہے:

''دارالشفاء دارالبقاء'' یہ دونوں مکان جامع مسجد کے ساتھ تعمیر ہوئے تھے اور بادشاہ کی طرف سے حکیم مقرر تھے۔ بیماروں کو (دارالشفاء میں) دوا ملتی تھی......اور دارالبقاء مدرسہ ہے۔ابتداء کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔وہاں اب صرف کنیر کے درخت ہیں (مرقع سلاطین ص ۲۲)۔

اتحاف النبلاء مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بھی تذکرہ مفتی صدرالدین دہلویؒ کے ضمن میں مدرسہ دارالبقاء زیر جامع مسجد دہلی لکھا ہوا ہے۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۶۰)

---

[1] الفرقان آثار الصنادید (مطبوعہ نول کشور پریس) حصہ سوم ص ۲۷ پر ہے'' مسجد پنجابی کڑہ'' کے نام سے ایک مسجد کا ذکر ہے۔اس ذیل میں یہ بھی درج ہے کہ یہ مسجد اورنگزیب عالمگیرؒ کی اہلیہ نواب اورنگ آبادی بیگم نے بنوائی تھی۔کہیں اسی مسجد کو تو'' کہانی'' میں اورنگ کی مسجد سے نہیں تعبیر کر دیا گیا ہے۔مگر شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے اس مسجد کے تعلق کا مسئلہ پھر بھی باقی رہے گا۔(فریدی)

[2] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر مقالہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی بحوالہ دارالحکومت دہلی۔(فریدی)

(۵) شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے دارالبقاء میں کبھی درس نہیں دیا۔ انھوں نے تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ اپنے ایک ہمدرس مولانا حامدؒ کے اصرار اور والدہ ماجدہ کے حکم سے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب وتصحیح کے زمانہ میں عالمگیرؒ کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن ان کے پیرومرشد خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اس ملازمت سے منع کیا۔ اتفاق سے تصحیح فتاویٰ کے سلسلہ میں ایک ایسی بات پیش آگئی کہ انھیں یہ ملازمت ترک کردینی پڑی۔ عالمگیرؒ نے ان کو جاگیر دینی چاہی مگر اس سے بھی انکار کردیا۔ (انفاس العارفین ص۲۴)

غرض کہ شاہ عبدالرحیمؒ کا اس شاہی مدرسہ دارالبقاء سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ حکومت کے کسی شعبے میں سوائے ان چند ایام کے جو تصحیح فتاویٰ میں گزرے، ملازم رہے۔

(۶) مفتی صدرالدینؒ کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم (جنھیں مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے) تحریر فرماتے ہیں:

''درعصر خود یگانہ روزگار و نادرۂ عصر بود'' اس کے بعد لکھتے ہیں: ''ریاست درس وتدریس معقولات بالخصوص وافتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ وشمالیہ دہلی وامتحان مدارس وصدارت حکومت دیوانی بوے منتہی شدہ''۔

اس کے بعد قمطراز ہیں: ''صاحب وجاہت بود نزد امراء وعلماء وحکام ورعایائے شہر'' ان کے مکان کے متعلق کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''سوائے بادشاہ وقت کے اعیان واکابر دہلی ونواح دہلی میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کے مکان پر حاضر نہ ہوتا ہو۔ طلباء اخذ علم کے لئے، اہل دنیا مشورۂ معاملات کی غرض سے، انشاء نگار اصلاح انشاء کے واسطے اور شعراء برائے مشاعرہ ان کے مکان پر آتے جاتے ہیں''۔

ان کے اخلاق واحسان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے اس سلوک کا ذکر بھی کیا ہے جو وہ طلباء دارالبقاء کے ساتھ طعام ولباس اور وظائف کی شکل میں کیا کرتے تھے۔ (ماخوذ: از اتحاف النبلاء ص ۲۶۰)

اس سے بھی بڑھ کر سر سید احمد خاں مرحوم سے سنیے! آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ شروع ہی اس شعر سے کرتے ہیں:

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن کلام بے ادبیست (باب چہارم ص۴۲)

اس کے بعد چار سطر کے القاب لکھ کر نام زبان پر لاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ (ص ۴۳) پھر قلم بھی اٹھاتے ہیں تو اعتراف کرتے ہیں:

مجلس تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ☆ ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم (ایضاً)

آپ نے دیکھا کہ مفتی صدرالدین صدر الصدور کی علمی وجاہت و عظیم شخصیت کس قدر بلند بام اور عالی مقام ہے۔ وہ مفتی صدرالدینؒ جو درس و تدریس کے علاوہ افتاء وامتحانات مدارس اور صدارت حکومت دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

بادشاہ وقت کو چھوڑ کر تمام رؤساء اور اکابران کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ جو اپنے وقت کے صاحب وجاہت عالم تھے۔ ان کو مولانا منورالدین ''رکن المدرسین'' کے مقابلہ میں نیا نیا فارغ التحصیل بتا کر مولانا منورالدین کا مقرر کردہ مہتمم وصدر مدرس بتایا جارہا ہے! آخر یہ کیوں کر سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ مولانا منورالدین نے جو حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے سخت مخالف تھے صدر مدرس اس شخص کو بنایا جو حضرت شہیدؒ کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

''بارہا از زبانش ثناوصفت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ ومولوی اسحاق دہلویؒ نزیل مکہ مکرمہ شنیدہ شد (اتحاف)

حیرت کی بات ہے کہ مولانا منورالدین جن کے توسط سے دہلی اور اطراف دہلی کے پچاس سے زائد مدارس کو قلعہ دہلی سے وظیفے ملتے تھے۔ (دیکھئے کہانی ص ۴۰) اور جنھوں نے مدرسہ شاہجہانی دارالبقاء کو از سر نو زندہ کیا ان کا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا اور مفتی صدرالدینؒ کا اس زمانے کے ہر تذکرہ نویس نے ذکر کیا ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ دارالبقاء کو از سر نو آباد کرنے والے مفتی صاحبؒ ہی تھے۔ وہی اس کے سرپرست اور وہاں کے طلباء کے کفیل تھے۔ سرسید احمد خاں آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:

''یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جناب ممدوح (جناب مولانا مولوی صدرالدین خاں بہادر صدر الصدور) نے اپنی عالی ہمتی سے اس دارالبقاء کو زر خطیر صرف

[1] آثار الصنادید کو ہی دیکھ لیجئے مفتی صدرالدین صاحبؒ کا جیسا والہانہ ذکر ہے وہ تو ہے ہی اُن حضرات کا بھی تذکرہ اس میں ملتا ہے جن کو مولانا منورالدین کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ مگر نہیں ملتا تو مولانا منورالدین کا تذکرہ۔ آخر ان سب تذکرہ نگاروں کو مولانا موصوف سے ہی ایسی کیا کد ہو گئی تھی؟ (فریدی)

کر کے از سر نو مرتب کیا ہے۔ اور شاہجہانی طور پر جو جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے ان کو نئے سرے سے بنایا ہے اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں۔ ان کی خبر گیری نان و پارچہ کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے۔ سبحان اللہ غور کرو کہ یہ کیا چشمہ فیض ہے جو ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے۔" (باب سوم ص ۱۲)

ڈولے کی رسم اور مولانا منورالدین:

"بہر حال اکبر کے وقت سے یہ رسم جاری تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اسی طرح پیدا ہوئے۔ اسی لئے معاملہ بہت نازک ہو گیا تھا کیونکہ اگر اس کے عدم جواز پر زور دیا جاتا تو یہ معنی تھے کہ جہانگیر، شاہجہاں، داراشکوہ، شجاع اور فرخ سیر تک کی پیدائش معرض بحث میں آجاتی۔ اسی لئے یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ علماء دنیا کبھی اس طرف اشارہ تک نہ کرتے اور اپنے لئے موجب ہلاکت تصور کرتے تھے۔" کہانی ص ۵۰

"مولانا منورالدین ڈولے کی رسم کی علانیہ مخالفت کرتے تھے اور اسے حرام بتاتے تھے۔ ص ۵۰۔۵۱

معلوم نہیں کہ داراشکوہ اور شجاع کو ڈولے کی پیداوار کیسے قرار دے لیا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں شہزادے اورنگزیب عالمگیرؒ کے حقیقی بھائی اور ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کے بطن سے تھے جو اعتماد الدولہ آصف خاں کی صاحبزادی نور جہاں بیگم کی بھتیجی اور مرزا غیاث الدین کی پوتی تھیں اور شاہجہاں کی سوائے ان کے کسی دوسری بیگم کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جو اولاد ممتاز محل کے سامنے زندہ رہی وہ یہ ہیں: (۱) داراشکوہ (۲) شاہ شجاع (۳) مرزا مراد بخش (۴) اورنگزیب عالمگیر (۵) انجمن آرا (۶) گیتی آرا (۷) جہاں آرا (محذورات تیموریہ مؤلفہ سید ظہور الحسن دہلوی ص ۴۷)

مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا منورالدین:

"مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ مولانا منورالدین کے ہمدرس تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد جب انھوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور ان کے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی و سربراہی مولانا منورالدین نے دکھائی، کتابیں لکھیں" ۔ص ۵۶

میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ مولانا منورالدین ہرگز مولانا شہیدؒ کے ہمدرس نہیں تھے اور جلاء العینین نام کی کوئی کتاب مولانا شہیدؒ کی تالیف یا تصنیف نہیں ہے۔ رہی مولانا منورالدین کی مخالفت شہیدؒ میں سرگرمی و سربراہی اس کے متعلق عرض ہے کہ مولانا منورالدین کا اول تو ان امتیازی خصوصیات کے ساتھ وجود ہی عنقا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت شہیدؒ کی علمی شخصیت اور خاندانی وجاہت کے آگے بڑے سے بڑے

مخالف کی جرأت نہ ہوئی کہ ان کی مخالفت میں سرگرمی دکھائے۔ اگر کسی معاصر نے علمی حیثیت سے تہذیب ومتانت کے ساتھ بعض مسائل میں ان سے تحریری مناظرہ کیا ہے تو وہ مولانا فضل حق خیر آبادی تھے۔

تقویۃ الایمان کے متعلق اتنا عرض کر دوں کہ وہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانۂ حیات ہی میں سید صاحب اور مولانا شہیدؒ کے سفر حج سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی۔

مولانا منور الدین نے خدا جانے کون کون سی کتابیں لکھیں کاش ان کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا سراغ مل جاتا جو مولانا منور الدین نے حضرت شہیدؒ کی رد میں لکھی تھیں۔

جامع مسجد دہلی کا مباحثہ:

''مولانا منور الدین نے ۱۲۴۸ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا۔ تمام علماء ہند سے فتویٰ مرتب کرایا۔ پھر حرمین سے فتویٰ منگایا۔ ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتداء میں مولانا اسماعیل اور ان کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحیٔ کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث ورد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد کا شہرہ آفاق مناظرہ ترتیب دیا۔ جس میں ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ تھے اور دوسری طرف مولانا منور الدین اور تمام علماء دہلی۔ بحث ان تمام مسائل پر تھی جو تقویۃ الایمان کی وجہ سے چھڑ کے تھے''۔ ص ۵۶

جامع مسجد دہلی کا یقیناً یہ وہی مباحثہ ہے جس کی مفصل روداد مولوی فضل رسول بدایونیؒ نے اپنی کتاب سیف الجبار میں (ص ۴۵ تا ۴۸) درج کی ہے۔ جس سے مندرجہ بالا بیان کے برخلاف یہ امور ثابت ہوتے ہیں: (۱) یہ مجلس مناظرہ ۱۲۴۰ھ میں منعقد ہوئی، ۱۲۴۸ھ میں نہیں۔ بھلا ۱۲۴۸ھ میں مولانا عبدالحیٔ اور مولانا شہیدؒ کہاں تھے؟ مولانا عبدالحیٔ ۱۲۴۳ھ میں وفات پا چکے تھے اور مولانا اسماعیل شہیدؒ ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت پی چکے تھے۔ (۲) مولانا منور الدین کے نام کوئی صاحب اس مجلس مناظرہ میں معروف یا غیر معروف حیثیت کے موجود نہیں تھے۔ اگر وہ سرگرم مخالف، بانی مناظرہ اور سربراہ ہوتے تو مولوی بدایونی ان کا ذکر ضرور کرتے۔ خصوصاً جب کہ کہانی کے بیان کے بموجب مولوی فضل رسول مولانا منور الدین کے شاگردوں میں تھے۔ (۳) حرمین سے کوئی فتویٰ مخالفین نے نہیں منگایا تھا۔ دہلی ہی کے کچھ علماء کی مہریں ایک استفتاء پر تھیں۔ (۴) مناظرانہ گفتگو آخر تک صرف مولانا عبدالحیٔ سے ہوئی تھی[1]۔

---

[1] اس مناظرہ کی صحیح روداد ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے فریدی نمبر میں ملاحظہ کریں (محب الحق)

رسالہ ما اھل بہ لغیر اللہ اور مولانا منور الدین:

’’(مولانا منور الدین کا) ایک رسالہ ما اھل بہ لغیر اللہ کے جھگڑے کی نسبت ہے۔اس میں انھیں بڑی مشکل پیش آئی۔اس لئے کہ یہ مسئلہ دراصل شاہ عبدالعزیزؒ کی وجہ سے چھڑا۔انھوں نے تفسیر فتح العزیز میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ اہلال سے مقصود ندا ہے نہ کے عندالذبح اس کا منسوب کرنا۔ اگر چہ شاہ صاحبؒ ان کے استاد ہیں تاہم اس مسئلہ میں بڑی سختی سے ان کا رد کیا ہے اور اپنے نزدیک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مفسرین سلف کے خلاف انھوں نے تفسیر کی ہے۔اس کے آخر میں بہت سے علماء کی تقریظیں وتحریریں ہیں جن میں ایک تقریظ مفتی صدرالدین کی بھی ہے۔ص ۵۹/۵۸

اول تو اس معرکۃ الآرا رسالہ کا وجود ہی مشتبہ ہے اور اگر ہو بھی تو جہاں تک مفتی صدرالدین دہلویؒ کی تائید وتقریظ کا تعلق ہے اس کے متعلق پورے وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

منجی المؤمنین من کید الحاسدین (مؤلفہ قاضی محمد حسین مطبوعہ پونہ) کے ص ۸۵ پر ایک فتویٰ اسی مسئلہ سے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تائید میں درج ہے۔اس پر مولانا محمد قطب الدین دہلویؒ، مولانا محبوب علیؒ، مولانا محمد کریم اللہؒ، مولانا احمد سعیدؒ، مولانا عبدالخالقؒ، مولانا مخصوص اللہؒ، مولانا مملوک علیؒ، مولانا حیدر علیؒ اور مولانا احمد علیؒ کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر مفتی محمد صدرالدینؒ صدرالصدور کے دستخط بھی ثبت ہیں۔اسی کتاب منجی المؤمنین کے ص ۱۱۶ پر مولانا عبدالقیوم صاحب صدیقیؒ ابن مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ مفتی بھوپال کا یہ خط بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدرالدین صاحب اس مسئلہ میں اپنے استاد کے مسلک پر تھے۔

مکرما! وما اہل بہ لغیر اللہ نزد عاجز واکثر علماء بلا شبہ حرام است ذبیحہ بلا خلاف حرام واگر کسے را اختلاف است در غیر ذبیحہ است نہ در ذبیحہ چنانچہ درینما وہ یک رسالہ الموسوم بزبدۃ النصائح از تصنیف مولوی تراب علی صاحب لکھنوی کہ بمواہیر علماء دہلی مثل مفتی صدر الدین صاحب ...... وغیرہ مطبوع شدہ ازاں وضاحت مسئلہ مذکور طلبد ارند کہ ہمہ اقوال مختلف وغیر مختلف علماء متقدمین ومتاخرین دراں مندرج اند وباقی توضیح وتنقیح معنیٰ ایں آیت شریفہ آنچہ در تفسیر عزیزیہ مرقومہ است در دیگر کتب کمیاب ازاں تشفی خاطر خود خواہند ساخت کہ دقیقہ از دقائق دراں فروگذاشت نگردیدہ واضح سامی باد۔والسلام (۵ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ)

ترجمہ: مکرما! جو جانور غیر اللہ کا نامزد ہو کر ذبح کیا جائے وہ میرے اور اکثر وبیشتر علماء کے نزدیک بلا خلاف

حرام ہے۔ کسی کو اگر اختلاف ہے تو غیر ذبیحہ کے بارے میں ہے نہ کہ ذبیحہ کے۔ اس مسئلہ میں ایک رسالہ زبدۃ النصائح نام کا ہے۔ جو مولوی تراب علی لکھنوی کی تصنیف ہے اور جس میں علماء دہلی مثلاً مفتی صدر الدین صاحب وغیرہ کی مہریں ہیں اور جو طبع ہو گیا ہے۔ اس رسالہ سے مسئلہ مذکور کی وضاحت معلوم کریں۔ اس میں علماء متقدمین ومتاخرین کے تمام مختلف وغیر مختلف اقوال درج ہیں۔ رہی اس آیت شریفہ کی توضیح وتنقیح تو جو کچھ تفسیر عزیزی میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے وہ دوسری کتابوں میں کمیاب ہے۔ اس سے اپنی تشفی خاطر کرلیں۔ اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

پھر بھلا وہ کس طرح اپنی تحقیق، اپنے مسلک اور اپنے عقیدے کے خلاف مولوی منورالدین کے رسالہ پر تقریظ لکھ سکتے تھے۔

نواب سکندر بیگم اور مولانا منورالدین:

بات یہیں ختم نہیں ہوئی کہ مولانا منورالدین شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے یا نہیں؟ اور وہ رکن المدرسین کے بلند پایہ عہدے پر فائض رہے یا نہیں؟ انھوں نے جامع مسجد دہلی میں مخالفین شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے ہمراہ ہو کر مجلس مناظرہ میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا یا نہیں؟ ان کے دیگر کارہائے نمایاں کی طرح اُن کا سفر بھوپال بھی بڑا دلچسپ اور بڑا ہی حیرت انگیز ہے اور اس سفر کی داستان پڑھ کر ایک مستقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوار نے سفر بھوپال کیا بھی ہے یا نہیں؟ ان کے بھوپال پہونچنے پر ''نواب سکندر بیگم'' کا ان کے ہاتھ پر تائب ہونا اپنے عیش محل کو مسجد بنانا۔ جہانگیر محمد خاں کا جو ''نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا''۔ (یعنی شوہر نہیں تھے) بیگم کی نظر التفات سے محروم ہونے کی بنا پر ان سے حسد کرنا اور رقاب میں زہر دینا خود ان کا بھی مولانا منورالدین کے ہاتھ پر تائب ہونا اور ان کی جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑنا اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھنا یہ سب واقعات ص ۶۰۔۶۱ کہانی کے اندر درج ہیں۔ پہلے اس سلسلہ کے کچھ ضروری اقتباسات پیش کردوں پھر اس بارے میں عرض کروں گا۔

''ان کے بعد (مولانا محمد اسحاق کے بعد) مولانا منورالدین بھی ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ ان کے مریدین ومعتقدین تمام شمالی ہند و پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ سنا تو جوق جوق آنے لگے اور کچھ دنوں کے لئے دہلی کا یہ حال ہو گیا کہ ہزاروں آدمی

.اس کی آبادی میں بڑھ گئے۔ اس ہجوم کی وجہ سے وہ اس سال نہ جا سکے اور دوسرے سال روانہ ہوئے...... چنانچہ یہ بمبئی روانہ ہوئے۔ جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا۔ وہ ان کا ذکر خیر پہلے سے سن چکی تھیں۔ انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام فرمائیں۔ نواب سکندر بیگم کے حالات ویسے ہی ناخوشگوار تھے۔ جیسے عموماً امراء کے ہوا کرتے تھے۔ مولانا کو ان حالات کی اطلاع تھی۔ یہ شہر سے باہر رک گئے اور کہلا بھیجا کہ میں اس شرط سے آسکتا ہوں کہ بیگم صدق دل سے تائب ہو۔ بیگم خود شہر سے باہر آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس درجہ متاثر ہوئی کہ ان کے ہاتھ پر تائب ہوگئی اور شہر میں لاکر اسی محل میں ٹھہرایا جسے پہلے ایک تالاب کے وسط میں عیش ونشاط کے لئے بنایا تھا اور اب مسجد کر دیا تھا۔ چند دن کے بعد مولانا نے آگے بڑھنا چاہا مگر بیگم مانع ہوئی اور چندے توقف کرنے کی درخواست کی۔ اس پر انھوں نے مستعجل رفقاء کو سفر کی اجازت دیدی اور خود اس سال ٹھہر گئے۔ بھوپال میں ان کی وجہ سے بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ نواب بیگم کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی اور ایک بڑی خلقت ان کے ہاتھ پر تائب ہوکر مرید ہوئی۔ قیام بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ نواب جہانگیر خاں جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا۔ جب مولانا کے ہاتھ پر (بیگم کے) تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظر التفات سے محروم ہو گیا تو ان سے سخت حسد و رنج پیدا ہوا......نواب جہانگیر خاں نے انھیں زہر دیدینا چاہا۔ چنانچہ ایک روز جب بیگم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور متعدد امراء اور خود جہانگیر خاں بھی دسترخوان پر تھے اور بیگم خود اپنے سامنے سے کھانے کی قابیں اٹھا اٹھا کر مولانا کے سامنے رکھتی تھیں کہ ایک پلیٹ مزعفر کی بیگم نے ان کے سامنے اٹھا کر رکھی اسی میں درحقیقت زہر تھا۔ مولانا کو کسی طرح یہ مکیدہ معلوم ہو گیا اور انھوں نے وہ قاب اٹھا کر نواب جہانگیر خاں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھائی نواب صاحب یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے۔ نواب پر اس بات کا ازحد اثر پڑا۔ اس نے اسے انکی کرامت تصور کیا۔ بے اختیار کانپنے لگا اور اسی وقت قدموں پر گر کر صدق دل سے تمام معاصی وفسوق سے توبہ کی۔ پھر تو اس کی یہ حالت ہوئی کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر پالکی کے ساتھ دوڑتا اور اسے اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا۔ (کہانی ص ۶۰ تا ۶۲)

اب تاج الاقبال تاریخ بھوپال مولفہ نواب شاہ جہاں بیگم سے حسب ضرورت کچھ اقتباس تحریر کرتا ہوں یہ اقتباس بھی ذہن نشین رہے:

(۱) غرہ رمضان ۱۲۵۳ھ کو نواب صاحب بہادر (جہانگیر محمد خاں) بتجویز صدر...... صدر نشین ہوئے...... ششم جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ کو اسلام نگر میں میری ولادت ہوئی۔ ۱۲۵۶ھ میں محلہ جہانگیر آباد آباد کیا۔ اٹھائیسویں ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ کو چھبیس برس کی عمر میں ان کا (نواب جہانگیر محمد خاں) کا انتقال ہوا۔ نور باغ میں مدفون ہوئے۔ (تاج الاقبال دفتر الاول ص ۴۱ و ۴۲)

(۲) (نواب سکندر بیگم) ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں۔ اٹھارویں ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ کو ان کا نکاح (نواب جہانگیر محمد خاں سے) ہوا۔ پندرھویں محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئیں۔ نویں شوال ۱۲۷۶ھ کو برضامندی میری اور منظوری نواب گورنر جزل بہادر نائب السلطنت فرماں روائے ہند صدر نشین بھوپال ہوئیں اور وہیں مستقل ٹھہریں۔ سیزدہم رجب ۱۲۸۵ھ کو اس دار فانی سے سرائے جاودانی کوچ کر گئیں۔'' (تاج الاقبال دفتر دوم ص ۶)''

اس کے بعد یہ طے کرنا ہے کہ مولانا منور الدین نے یہ سفر کس سن میں کیا ہے؟ آزاد کی کہانی میں صراحتاً کوئی سن نہیں ملتا۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد اسحاقؒ کی ہجرت کے بعد یہ بھی ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت پر آمادہ ہوئے...... مگر جب ذرا غور کیا تو خود اسی کتاب سے ضمناً سفر ہجرت اور سفر بھوپال کا زمانہ نکل آیا...... اگرچہ حساب لگانے میں رجعت قہقری کرنا پڑی مگر گتھی سلجھ گئی۔'' دیکھئے کہانی کے ص ۶۲ و ۶۳ پر ہے:

''ایک سال کے بعد (مولانا منور الدین) بھوپال سے بمبئی عازم ہوئے...... یہاں (بمبئی میں) دو سال قیام رہا۔ تیسرے سال مکہ معظمہ پہونچے اور پانچ سال میں پانچ حج کر کے وہیں انتقال کیا۔ اسی سال ہندوستان میں غدر ہوا۔''

ہندوستان میں غدر ۱۲۷۳ھ میں ہوا ہے۔ اس میں سے پانچ سال قیام مکہ کے کم کئے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوئے۔ اس میں سے دو سال قیام بمبئی اور ایک سال قیام بھوپال کے کم کئے۔ احتیاطاً ایک سال سفر حج کا بھی کم کیا تو تقریباً ۱۲۶۴ھ برآمد ہوئے۔ یہ زمانہ ان کے بھوپال آنے کا ہے اور اس وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوئے کم از کم چار سال گذر چکے تھے خود کہانی کے اندر بھی موجود ہے کہ ''جب بھوپال پہونچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا'' نواب سکندر بیگم پندرہ محرم ۱۲۶۳ھ کو مختار ریاست ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے اپنے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانہ حیات میں وہ مختار ریاست نہیں تھیں۔ خود ان کے شوہر والی ریاست تھے۔ جیسا کہ تاج الاقبال تاریخ بھوپال کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے اس

حقیقت کے بعد کیا اصل رہ جاتی ـ نواب جہانگیر محمد خاں کے مولانا منورالدین سے حسد و رنج کرنے و زہر کھلانے کی کوشش فرمانے اور پھر ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ان کی پالکی کے ساتھ ان کی جوتیاں اٹھا کر دوڑنے کی؟ علاوہ ازیں نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم تو نواب سکندر بیگم کے شوہر اور بھوپال کے فرماں روا تھے۔ وابستگی کے کیا معنیٰ اور نظر التفات سے محروم ہونے کا کیا مطلب؟

مزعفر کی قاب میں زہر بھر دینے کا قصہ اگرچہ بین طور پر ختم ہو گیا لیکن قطع نظر تاریخی حقائق کے خود اس واقعے کے اجزاء اس کے عدم وقوع پر دلالت کر رہے ہیں۔

غور تو کیجئے بیگم جب مولانا منورالدین کے ہاتھ پر تائب ہو چکی تھیں تو نواب جہانگیر محمد خاں جو مولانا منورالدین کے مخالف تھے اور بیگم کی نظر التفات سے محروم بھی ہو چکے تھے پھر دعوت میں کس تدبیر سے آئے اور یہ زہر آلود پلیٹ بیگم کے دسترخوان پر کس طرح پہونچی؟ علاوہ ازیں زہر کا علم رئیسہ کو تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو خود رئیسہ نے جہانگیر محمد خاں سے مولانا کی مخالفت میں سازش کر لی تھی؟ اگر علم نہ تھا تو پھر رئیسہ نے وہی قاب مولانا کے سامنے کیوں بڑھائی اس میں سے خود کیوں نہیں کھایا۔ کیا اس میں رئیسہ کی بھی کرامت شامل تھی؟ اور خود مولانا منورالدین کی مذہبی حمیت نے یہ کیسے گوارا کیا کہ وہ ایک غیر محرم رئیسہ کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں؟ اور بعد میں جب نواب جہانگیر محمد خاں نادم و تائب ہو گئے اور مولانا کی جوتیاں اٹھائے پالکی کے ساتھ پھرتے تھے تو ان پر اور ان کے خاندان پر اور ان کے حلقہ اثر پر مولانا منورالدین کے خیالات و عقائد کا اثر کیوں نہیں پڑا؟

حقیقت یہ ہے کہ بھوپال میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا اور کیسے پیش آتا جب کہ مولانا مذکور کے بھوپال آنے کے وقت نواب جہانگیر محمد خاں کا دنیا میں وجود ہی نہ تھا۔

تاریخ بھوپال شاہد ہے کہ وہاں کبھی ایسے عالم کو جو قرآن و حدیث پر بطریق صحیح عامل نہ ہو خاندان ولی اللہی کے مسلک کا سخت مخالف ہو کوئی امتیاز نہیں ملا ہے۔ نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم سے لے کر نواب سلطان جہاں بیگم تک سب کے سب بدعات سے نفور اور اہل حق کے معتقد رہے ہیں (اور آج بھی بحمداللہ یہ علاقہ شیوع بدعات سے محفوظ ہے) چنانچہ خود نواب جہانگیر محمد خاں کے عہد حکومت میں مولانا شریف حسین دہلوی قاضی ریاست تھے۔ نواب سکندر بیگم کے زمانے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم پہلے میر منشی رہے پھر مرحومہ نے ان کے علم و فضل کو ملاحظہ فرما کر ریاست بھوپال کا مہتمم عملہ

تاریخ نگاری مقرر کیا۔ پھر وہ افسر جملہ مدارس اسلامیہ بھوپال بنائے گئے۔ منشی[1] جمال الدین مرحوم مدار المہام بھوپال کو یہ عظیم الشان شرف حاصل ہے کہ انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کو سب سے پہلے ہندوستان میں طبع کرایا۔

نواب سکندر بیگم ایک عفت مآب، عصمت شعار، پابند صوم وصلوٰۃ اور خوش عقیدہ رئیسہ تھیں۔ انھوں نے ۱۲۸۰ھ میں اس زمانے میں حج کیا جب ہندوستان کے نوابوں[2] میں حج کا رواج نہیں تھا۔ حجاز میں انھوں نے ہزار ہا روپیہ خیرات[3] کیا۔ قیام حجاج کے لئے رباط بھوپال کو بنایا اور اس کے تمام مصارف ریاست سے ادا کرتی تھیں۔ جب حج کو گئیں تو مولانا عبدالحی بڈھانویؒ رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ کے اکلوتے صاحبزادے مولانا عبدالقیوم محدث[4] کو بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی۔ چنانچہ مولانا عبدالقیوم صاحبؒ انھیں کی درخواست پر بھوپال آئے اور یہاں بیٹھ کر تشنگان علم حدیث وقرآن کو مدتوں سیراب کیا۔

---

[1] منشی جمال الدین مرحوم مدار المہام ریاست بھوپال کے مختصر حالات مآثر صدیقی (مؤلفہ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں ابن نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم) میں اس طور پر درج ہیں: ''یہ منشی وحید الدین مرحوم بن محی الدین بن حسام الدین کے بیٹے تھے۔ سلسلہ نسب ان کا محمد بن ابی بکرؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ قدیم وطن ان کا بوڑیہ ضلع سہارنپور تھا...... منشی جمال الدین خاں مرحوم ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ جب سن شعور کو پہونچے تو تحصیل علم کی غرض سے دار السلطنت دہلی میں آئے مولوی مملوک علی صاحب مدرس مدرسہ انگریزی کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے اور مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مجالس وعظ میں شریک ہونا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تحصیل علم کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا اور پھر ایک خاص واقعہ درج کر کے لکھا ہے کہ ''تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور مولوی محمد اسحاق صاحبؒ اور محمد یعقوب صاحبؒ مہاجر مکہ معظمہ سے تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد نواب سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں بھوپال پہونچنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''پہلے وہ محض ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۲۶۳ھ میں نائب اول (مدار المہام) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے مدار المہام صاحب اعتقاداً وعملاً موحد متبع سنت مدبر بیدار مغز اور بڑے راسخ الاعتقاد تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان سے ان کو خاص ارادت تھی شاہ صاحب کی بہترین تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ان ہی کی وسعت فیاضی اور علم پروری سے پہلے پہل ۱۲۸۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ موافق ۱۸۸۱ء کو مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر مرحوم نے شب کے گیارہ بجے رحلت کی۔ (مآثر صدیقی حصہ دوم ص ۴۴ تا ۵۶) واضح رہے کہ مآثر صدیقی کے مؤلف مدار المہام مرحوم کے حقیقی نواسے تھے۔ (فریدی)

[2] تاج الاقبال دفتر دوم۔ [3] تاج الاقبال دفتر دوم۔ [4] جماعت مجاہدین ص ۲۹۴ (فریدی)

نواب سکندر بیگم کی صاحبزادی نواب شاہ جہاں بیگم جو پابندی احکام دین، عقل وفہم، عدل و انصاف اور انتظام سلطنت میں بے نظیر امتیاز رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنا نکاح ثانی نواب صدیق حسن خاں مرحوم سے کیا۔ ایک فرماں رواء رئیسہ کا زمانے اور ماحول کے رسم ورواج کے خلاف نکاح ثانی کر لینا ایک زبردست اصلاحی انقلاب تھا۔ جس کو شاہ ولی اللہؒ کے وصیت نامے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی جدوجہد کا زرّیں نتیجہ کہنا چاہئے۔

سلطان جہاں بیگم کی دینداری اور خوش عقیدگی بھی مسلّم الثبوت ہے اور قطب الوقت عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ سے بوکالت وسفارت مولانا قاضی محی الدین فاروقی مرادآبادیؒ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ میں (حضرت گنگوہیؒ کی وفات سے تقریباً دو ماہ قبل) بیعت[1] ہوئی تھیں۔

آخر میں اتنا اور عرض کردوں کہ بھوپال کے تالاب میں کسی ایسی عمارت کا جو پہلے نواب سکندر بیگم کا ''نشاط محل'' ہو اور پھر مسجد میں تبدیل کردی گئی ہو، کوئی نشان نہیں۔ نہ بھوپال کی تاریخ میں اس کا تذکرہ ہے۔

نہر زبیدہ اور مولانا خیر الدین:

''ان کے (مولانا خیر الدین کے) زمانہ قیام حجاز کا ایک یادگار اور تاریخی واقعہ نہر زبیدہ کی مرمت بھی ہے...... اسی زمانے میں ایک سال کے حج میں پانی بالکل بند ہوگیا اور ہزاروں آدمی پیاس سے مرگئے۔ والد مرحوم نے یہ منظر اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا اور منیٰ ہی میں ارادہ کرلیا تھا کہ دوسرے حج کے آنے سے پہلے ہی وہ اس کار خیر کو کر کے چھوڑیں گے...... اس زمانہ میں ان کے مریدین میں حاجی عبدالواحد جو کلکتہ اور بمبئی میں ''حاجی واحدنا'' کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے شریک کار حاجی زکریا تھے...... اور یہ دونوں اس سال کے حج میں موجود تھے اور والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب قسطنطنیہ کی طرف سے ناامیدی ہوگئی تو والد نے سب سے پہلے حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا سے تحریک کی اور انھوں نے دولاکھ کی پہلی رقم پیش کردی۔

اس کے بعد والد نے سات آدمیوں کی ایک مجلس بنائی اور یہ فنڈ اس کے انتظام میں دیدیا...... لیکن افسوس ہے کہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام پورا نہ ہوسکا البتہ نہر کی اس درجے درستگی ہوگئی کہ تیس برس تک پھر کسی طرح کی خرابی واقع نہ ہوئی۔ (آزاد کی کہانی ص ۹۴ تا ۹۹)

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد دوم ص ۱۰۲)

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں نہر زبیدہ کی مرمت کا ہونا مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کیرانوی مہاجر مکہ ''صاحب اظہار الحق'' وبانی مدرسہ صولتیہ کا کارنامہ ہے۔ جن کا علاوہ ہندوستان کے حجاز وترکی میں کافی اثر ورسوخ تھا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی سوانح عمری میں لکھا ہے:

''نہر زبیدہ امتداد زمانہ سے بہت زیادہ قابل مرمت واصلاح تھی اور پانی کے لئے ساکنان حرم کو کافی دقت وزحمت پیش آتی تھی اسی زمانہ میں ''سیٹھ عبدالواحد عرف واحد نا سیٹھ'' مکہ معظمہ آئے اور اس سلسلہ میں ایک مشورتی اجتماعیہ مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوا۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب باتوفیق صاحب ہمت دولت مند تھے۔ حضرت مولانا مرحوم (مولانا رحمت اللہ صاحبؒ) نے نہر زبیدہ کی ازسر نو اصلاح و مرمت کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے حکومت کی اجازت وحالات کے لحاظ سے ایک مستقل مجلس قائم کی گئی۔ جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقے میں سے ہر قوم کے ممتاز افراد مجلس میں ممبر بنائے گئے۔ اس مجلس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا مرحوم کو منتخب کیا گیا۔ مگر آپ نے اپنے شاگرد رشید فضیلت مآب مولانا شیخ عبدالرحمٰن سراج صاحب مرحوم مفتی احناف وشیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس کے لئے موزوں سمجھا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس عظیم الشان کام کی ذمہ داری اٹھائی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب نہر زبیدہ کے خزانچی اور تحویلدار مقرر ہوئے۔ خدا کا شکر واحسان ہے کہ یہ صدقہ جاریہ ان بزرگوں کی ہمت سے دوبارہ زندہ ہوا۔ (ایک مجاہد معمار ص ۵۳)

مولانا خیر الدین کا حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا پر بہتان عظیم:

کہانی میں ہے: '' اس بارے میں ان کا (مولانا خیر الدین کا) بیان یہ تھا کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تمام جائداد اپنے عزیزوں میں تقسیم کردی باقی کے لئے بھی وصیت نامہ لکھ دیا اور مولوی اسماعیل کے لئے کچھ بھی نہ رہا تو اب دنیا کی طلب دل میں سمائی اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا ایک نیا کارخانہ جمایا جائے۔ سید احمد بریلوی فوج میں ایک ان پڑھ سپاہی تھے۔ ان سے سازش کرکے انھیں پیر بنایا۔ مولوی عبدالحئی شاہ صاحبؒ کے داماد تھے وہ بھی بیٹی کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے۔ وہ شریک سازش ہوگئے اور صورت یہ قرار دی کہ خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے۔ ہم

---

۱ ان کا تعلق اس جماعت اہل حق سے ہے کہ جس کے مولانا خیر الدین سخت مخالف تھے چنانچہ کہانی کے ص ۸۷ پر لکھا ہے: ''نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب اظہار الحق بھی تھے۔'' (فریدی)

نواسے (؟) اور داماد تھے مگر محروم رہ گئے اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا۔ آدمی (مولانا اسماعیل شہیدؒ) ذہین اور لسان تھا۔ بہت جلد لوگوں میں ایک غلغلہ مچا دیا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی ان پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے (؟) نے پیر مان لیا ہے۔ اس کی پالکی پکڑ کے جوتی بغل میں داب کے دوڑتا ہے اور علانیہ اپنی محرومی اور ان کی فیض یابی کا اقرار کرتا ہے تو اس سے لوگوں میں بڑا ہی رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی''۔ ص ۳۶۴

اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد اپنے والد کے اس قسم کے بیانات سے متفق نہیں تھے اور وہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے مداحوں میں سے تھے۔ ان کے والد کے اس قسم کے غالیانہ اور انتہا پسندانہ خیالات وعقائد نے ہی در حقیقت بطور ردعمل مولانا کو وادی شکوک میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس طرح کے بیانات پر بعض جگہ ریمارک بھی کئے ہیں اور بعض جگہ انھوں نے اپنے والد کی اس قسم کی باتوں کو فتنے سے تعبیر کیا ہے۔

اس مقام پر بھی خیریت سے بہتان عظیم کا عنوان موجود ہے لیکن بہت سے خلاف تحقیق اور سراسر لغو باتوں پر تنقید نہیں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا کے والد کی علمیت اُن کے اخلاق عالیہ ان کے تزکیہ نفس اور روحانی کمالات کے اس قدر واقعات کہانی میں بیان کئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر بہت سے ناواقفوں کو شبہ ہی نہیں یقین ہو سکتا ہے کہ مولانا خیر الدین جیسا صاف باطن اور ''صاحب بصیرت'' شخص جو کچھ بھی مولانا اسماعیل شہیدؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں کہہ رہا ہے وہ صحیح ہوگا۔ حالانکہ خاندان شاہ ولی اللہؒ اور رفقاء سید احمد شہیدؒ کے بارے میں جو کچھ بھی انھوں نے ''گوہر افشانی'' کی ہے وہ سراسر بہتان ہی بہتان ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ان بہتانوں کا سرچشمہ اور منبع مولوی فضل رسول بدایونی کی کتاب سیف الجبار ہے۔ یہ وہی مولوی فضل رسول ہیں جن سے مولانا خیر الدین کو بڑی مناسبت تھی چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے گذشتہ علماء میں صرف مولوی فضل رسول بدایونی جنھوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں...... لکھی ہے ٹھیک اسی رنگ پر تھے جو اس بارے میں والد مرحوم کا تھا۔ (کہانی ص ۱۶۴)

حتیٰ کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی جن سے مولانا خیر الدین کے اچھے تعلقات تھے اور جن کو صحیح الاعتقاد فرمایا کرتے تھے جب وہ کلکتہ میں ان سے ملے اور ایک مسئلہ میں اختلاف ہوا تو

''ان کے جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدہ میں بھی فتور[1] ہے۔'' (کہانی ص ۱۶۶)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیر الدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی بات پوری طرح یاد نہیں رہی تھی وہ تو یوں ''گل افشانی'' فرما رہے ہیں: (۱) شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے آخر عمر میں اپنا تمام مملوکہ منقولہ کہ ہر جنس کثرت سے تھی حرم اور نواسوں وغیرہ کو ہبہ کر کے خالص کرادیا مگر مولوی اسماعیل کو کچھ نہ دیا۔ (سیف الجبار ص ۱۷، ۱۸) (۲) ''جب شاہ صاحبؒ نے اپنے ساری مملوکات اوروں کو ہبہ کر دی مولوی اسماعیل گھبرائے اور مولوی عبدالحی شاہ صاحبؒ کے داماد...... موقوف ہو کر دہلی میں آئے دونوں نے مل کر سید احمد نام...... شاہ صاحب کے مرید کو پیر بنایا اور ساتھ لے کر شہروں میں پھیری شروع کی اور در بدر گھر بہ گھر قرآن و حدیث کے درس کو وسیلہ ٹھہرایا۔'' (ص ۳۴)

کہانی میں اسماعلیہ اور اسحاقیہ کے عنوان سے ص ۱۶۵ پر مولانا خیر الدین کی بے نظیر تحقیق پیش کی گئی ہے۔ وہ بھی سیف الجبار ہی کے ص ۵۰، ۵۱ سے ناتمام طریقے پر ماخوذ ہے۔

اب میں بہتان عظیم کا مختصر جواب دینے سے پہلے میاں سید احمد علی بجنوری (شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) کے خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں شاہ صاحبؒ کی بیماری اور وفات کے چشم دید حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس خط کا ترجمہ مولانا ذوالفقار احمد بھوپالیؒ نے اپنی کتاب الروض الممطور فی علماء شرح الصدور میں درج کر دیا ہے۔ اس خط کا فقط وہ حصہ جس سے مولانا خیر الدین کے ''بہتان عظیم'' کی جڑ کٹ جاتی ہے یہاں پر نقل کیا جا رہا ہے:

''(حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے) روز سہ شنبہ کہ دن درس کا تھا بکمال بے طاقتی منبر پر آرام کر کے تفسیر آیہ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم فرما کر بس کیا۔ پہر دن باقی رہے۔ فقیر کو طلب فرما کے کاغذ وصیت نامہ مشتمل بر ہبہ فروش و کتب خاص ذات خود بمولوی محمد اسحاق دام ظلہم و دیگر امورات کا لکھوا کر مہر فقیر کی اس پر ثبت کرائی۔ من بعد مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ کو طلب کر کے ان کی مہریں ثبت

---

[1] جس مسئلہ میں اختلاف ہوا تھا ضمناً اس کو بھی پڑھئے: لکھا ہے اختلاف مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ایک رسالہ پر پیدا ہوا جس میں انھوں نے عدم ایمان ابوین آنحضرت ﷺ اور ایمان ابو طالب پر زور دیا تھا۔ حالانکہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کا مسلک اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ ایمان ابوین اور عدم ایمان ابو طالب کے قائل ہیں۔ ان کی تصانیف و ملفوظات میں جا بجا اس بارہ میں تصریحات ہیں۔ (فریدی)

کرائیں۔ اس دن حال بہت متغیر تھا...... جمعہ کے دن چاہا کہ موافق معمول کے مدرسہ میں آئیں نہ آسکے۔ درس موقوف ہوا مگر زیارت سب کو میسر ہوئی۔ وقت شام کے تفسیر مدارک وتفسیر رحمانی سنی۔ بعدہٗ جو کچھ نقدی تھی اس کو برادرزادوں اور ذوی الارحام حاضر وغائب کو تقسیم فرمایا۔ (اس کے دو دن بعد) بعد نماز فجر ساتویں ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ داعی اجل کو لبیک اجابت فرمائی اور اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (الروض الممطور ص ۲۰۱)

دیکھئے معتبر ترین شاہد کا بیان ہے کہ شاہ صاحبؒ نے حاضر و غائب برادرزادوں اور ذوی الارحام کو...... جو کچھ نقدی ان کے پاس تھی تقسیم کردی تھی۔ حضرت شاہ محمد اسماعیلؒ جو شاہ صاحبؒ کے برادرزادے تھے وفات شاہ صاحب کے وقت دہلی میں موجود نہ تھے۔ مگر حصہ ان کو بھی دیا گیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ ان کو محروم کردیا گیا ہو۔ البتہ مولانا محمد اسحاق صاحبؒ اپنے نواسے کو بحیثیت اپنے جانشین اپنی کتابیں اور فرش فروش ضرور ہبہ کیے۔

اس میں مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تخصیص نہیں۔ مولوی محمد موسیٰ، مولوی مخصوص اللہ وغیرہما برادرزادگان کو بھی کچھ نہیں ہبہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس جو ایک درویش صفت متوکلانہ زندگی بسر کرنے والے محدث تھے کونسے ایسے خزانے اور کونسا ایسا مال کثیر رکھا ہوا تھا جس کا یہ پروپگنڈہ کیا جارہا ہے اور اس کی بنیاد پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش فرمائی جارہی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو کفن تک گاڑھے کا دیا گیا تھا اور وہ خود وصیت فرماگئے تھے کہ میرا کفن اس کپڑے کا ہو جو میں پہنتا ہوں۔

"کرتا آپ کا دھوتر کا اور گاڑھے کا پاجامہ ہوتا تھا۔" (الروض الممطور وکمالات عزیزی)

اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے مگر مولانا خیرالدین کے اس بہتان عظیم کو بیان کرتے ہوئے دو جگہ شاہ شہیدؒ کو نواسہ لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحیؒ کی اس زوجہ سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کی صاحبزادی تھیں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان صاحبزادی کا انتقال شاہ صاحبؒ کے سامنے ہی ہوگیا تھا۔ پھر داماد کو شاہ صاحب کے مال میں آرزو کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہ اور کتاب التوحید:

کہانی میں بیان کیا گیا ہے کہ "شاہ ولی اللہ مرحوم کو جو عین محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور د

شیوع عقائد کے زمانہ میں حرمین میں مقیم تھے۔ اس کی کتاب التوحید ملی اور اس کی وجہ سے ان کے خیالات میں بھی یک گونہ فتور ہوا۔ وہ اس فتنہ کو اپنے ہمراہ ہندوستان لائے۔ ان کی کتابوں میں مولوی اسماعیل کو کتاب التوحید ملی۔'' (کہانی ص ۳۶۵)

یہ عظیم ترین بہتان بھی مولانا خیر الدین کے ''حقائق و معارف'' کا ایک نمونہ اور ان خیالات کی ایک جھلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متعلق وہ رکھتے تھے۔ غور تو کیجئے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قیام حرمین کا زمانہ ۱۱۴۳ھ سے ۱۱۴۵ھ تک کا ہے ۱۱۷۶ھ میں ان کا وصال ہو گیا اور مولوی فضل رسول بدایونی جو مولانا خیر الدین کے معتمد علیہ اور ''مولانا اسماعیل دشمنی'' میں ان کے خاص ہم مشرب و ہم مزاج ہیں سیف الجبار میں یہ ارقام فرما رہے ہیں کہ کتاب التوحید ۱۲۲۱ھ میں اواخر ایام سلطان سلیم ثالث میں مکہ معظّمہ کے اندر آئی تھی۔ پھر قیام حرمین کے زمانے میں یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ اس موقع پر بھی اگر مولانا خیر الدین کو مولوی فضل رسول بدایونی کی پوری بات یاد رہتی تو وہ وہی کہتے جو انھوں نے سیف الجبار میں لکھی ہے۔ دیکھئے مولوی بدایونی کتنا عجیب انکشاف فرماتے ہیں۔

وہ حضرت شہیدؒ اور رفقائے سید احمد شہیدؒ پر الزامات بیجا لگاتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''ان ہی سامانوں سے سیر و سیاحت کرتے پھرتے تھے کہ تیسرا فساد ظاہر ہوا یعنی کتاب التوحید نجدیہ کی مراد آباد میں کہ وہاں پہلے سے کسی قدر اس مذہب کی گفتگو تھی۔ ہاتھ لگی۔ اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی گویا اسی کتاب التوحید کی شرح ہے۔'' (سیف الجبار ص ۴۳)

ایک غلط بات کتنے تک سے کہی گئی تھی کہ کتاب التوحید مراد آباد سے مل گئی تھی۔ مولانا خیر الدین نے اس کو تاریخی اعتبار سے خواہ مخواہ پیچیدہ اور دور از کار بنا دیا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ حرمین سے کتاب التوحید لائے اور شاہ اسماعیل صاحب کو اپنے دادا کے کتب خانہ سے وہ کتاب ہاتھ لگ گئی۔ معاندین شاہ اسماعیل تقویۃ الایمان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے رہے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ سید صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ حج کو گئے تو وہابیوں سے متاثر ہوئے اور وہاں کتاب التوحید مل گئی اور تقویۃ الایمان لکھی۔ کوئی کہتا ہے مراد آباد سے کتاب التوحید مل گئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تقویۃ الایمان ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ دادا کے کتب خانہ سے کتاب التوحید برآمد کر لی تھی اور اس کا چربہ تقویۃ الایمان ہے۔ ٹھکانہ ہے ان محققین کی ژولیدہ بیانی اور اختلاف رائے کا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی:

اب اس سے بھی بڑا بہتان جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پڑھ لیجئے: "والد مرحوم (مولانا خیر الدین) کہتے تھے کہ جب ان کے (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے) انتقال کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی کی مجلس ہوئی اور شاہ فخر الدین مرحوم نے ان کے سر پر پگڑی رکھی تو کان میں کہا تھا تمہارے خاندان کی چادر پر ایک دھبہ لگ چکا ہے۔ اپنی سعی و ہمت سے اسے دھوڈالنا۔ یہ شاہ ولی اللہؒ کی طرف اشارہ تھا اور مشہور تھا کہ ان کو اپنے ذوق تفنن میں اعتزال کی طرف میلان رہا ہے۔ (ص ۳۶۷)

مولانا منور الدین نے تو حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا عبدالحیؒ کے عقائد پر مصنوعی فضا میں ہوائی حملے کئے ہی تھے اور آگے بڑھ کر اپنے فرضی استاد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پر بھی ہاتھ صاف کیا تھا اور ان کی تفسیر اور ان کے فتویٰ کو عالم خیال میں مضبوط دلائل سے رد کر دیا تھا۔ اب ان کے نواسے مولانا خیر الدین کا زمانہ آیا تو انھوں نے باوجود اس ادعا کے کہ وہ خاندان ولی اللہی سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں شاہ عبدالعزیزؒ کا رد بقول مولانا آزاد (بروایت کہانی) "سو تفسیروں" کے حوالوں سے **ما اھل بہ لغیر اللہ** کے مسئلہ میں کیا اور جب اس سے بھی تسکین خاطر نہ ہوئی تو صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو اول محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کا خوشہ چیں بتایا اور پھر معتزلی بنا کے چھوڑا...... اور کتنے مقدس انداز میں اپنے دل کی بات شاہ فخر الدین کی زبان سے شاہ عبدالعزیزؒ کے کان میں چپکے سے کہلوادی...... شاہ فخر الدین نے چپکے سے جو بات شاہ صاحبؒ کے کان میں کہی تھی وہ مولانا خیر الدین کو غالباً مولانا منور الدین کے واسطے سے معلوم ہوئی ہوگی۔ مولانا منور الدین ہی ایک ایسی نادر روزگار شخصیت ہیں جو اپنے استاد شاہ عبدالعزیزؒ کی دستار بندی کے وقت بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

میں پوری بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ دستار بندی کی داستان محض بے اصل ہے۔ حضرت عبدالعزیزؒ کی سجادہ نشینی کی کوئی تقریب نہیں ہوئی جس میں حضرت شاہ فخر الدین چشتیؒ نے دستار باندھی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو شاہ عبدالعزیزؒ اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر فرماتے۔ کوئی تذکرہ نویس لکھتا، خود شاہ فخر الدینؒ کے ملفوظات میں اس کا ذکر ہوتا...... علاوہ ازیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں فارغ التحصیل ہو کر منازل سلوک طے کر چکے تھے۔ وہ عملاً اپنے والد کے جانشین ان کی

زندگی ہی میں ہو چکے تھے۔ پھر کیا ضرورت تھی جشن سجادہ نشینی منعقد کرنے اور شاہ فخرالدینؒ سے ایسی بات سننے کی؟ اور کمال یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے باکمال باپ پر جو استاد اور پیر ومرشد بھی تھا اور جس سے غایت درجہ تعلق تھا جیسا کہ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ اتنا بڑا بہتان سنا اور وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔

اس قسم کی باتوں سے کہانی بھری پڑی ہے۔ مولانا خیرالدین جن کو ایک پاکباز اور تقدس مآب کی حیثیت سے بار بار پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے وہابیوں، اسماعیلیوں اور اسحاقیوں کو تمام عمر جو کوری کوری سنائی ہیں اس سے تو کتاب کا بڑا حصہ لبریز ہے۔

مولانا خیرالدین کا سفرِ عراق:

''(انھوں نے) عراق کا سفر کیا اور چھ سات ماہ ٹھہرے اس زمانہ میں شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف تھے۔ ان کے یہاں مہمان ہوئے، ان سے طریقہ قادریہ کی اجازت لی اور انھوں نے اُن سے طریقہ نقشبندیہ کی۔'' (کہانی ۸۱)

مولانا آزاد نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانیؒ مرحوم کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''والد مرحوم جب ۱۲۹۱ھ میں عراق گئے تھے تو سید عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علیؒ سجادہ نشین تھے۔ انھیں کے یہاں ٹھہرے۔'' (کاروانِ خیال ص ۷۵)

معلوم نہیں ان دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے۔ آیا وہ شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف کے زمانے میں عراق گئے تھے یا سید علی کے زمانے میں؟

پوری کتاب سے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ مولانا خیرالدین سلسلہ نقشبندیہ میں کس بزرگ سے بیعت تھے؟ اور یہ بھی تعجب ہے کہ مولانا خیرالدین نے صاحب روح المعانی پر حیات ومماتِ خضر کے مسئلہ میں اعتراض کرتے وقت یہ غور نہ فرمایا کہ سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بلند پایہ صاحب علم ظاہری وباطنی بزرگ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ خود حیاتِ خضر کے قائل نہیں ہیں؟ مکتوبات معصومیہ میں ان کا مکتوب اور اس کے دلائل ملاحظہ فرما لیتے تو پھر شاید اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ فرماتے۔

مولانا آزاد کا سفر عراق وحجاز:

مولانا کے بھائی کے تذکرہ میں ہے کہ: ''بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا ان کو بہت شوق تھا چنانچہ اسی سلسلہ میں جب ایک ساتھی یعنی حافظ عبدالرحمٰن امرتسری مل گئے تو انھوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گئے لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا اور واپس چلا آیا۔ (کہانی ص ۱۷۹)

اس موقع پر سن روانگی نہیں بیان کیا گیا لیکن ص ۳۱۱ پر ہے:

''۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر ''لسان الصدق'' کا نہیں نکلا۔ وہاں سے واپس آیا تو مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر ۱۹۰۴ء میں اپنے برادر بزرگ کی معیت میں ہوا۔ مولانا واپس آگئے اور وہ وہیں رہے اور اواخر ۱۹۰۶ء میں وہ صاحب فراش ہو کر واپس آئے۔ حتیٰ کے اوائل ۱۹۰۷ء میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہو گیا گویا وہ تقریباً تین سال بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف رہے۔ مولانا وسط ۱۹۰۴ء میں واپس آگئے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا شبلی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی اور مولانا نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور الندوہ سے ان کے تعلق پر اصرار کیا۔ چنانچہ کہانی میں ہے: ''دو تین ہفتہ بعد وہ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے برابر خطوط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں۔ (ص ۳۱۳) ص ۳۱۴ پر الندوہ کی ادارت کے سلسلہ میں ہے۔

یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہونچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔''

کانفرنس کا یہ اجلاس لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۰۴ء میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا نے اپنے بھائی مرحوم کے ساتھ شرکت کی۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے بھائی دسمبر ۱۹۰۴ء میں ہندوستان میں موجود تھے۔ پھر ۱۹۰۴ء میں ان کی معیت میں عراق کا سفر کس طرح ہو سکتا ہے؟ دونوں بھائیوں کی دسمبر ۱۹۰۴ء میں کانفرنس میں شرکت کی تائید مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کے ایک مضمون سے بھی ہوتی ہے جو الندوہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں ان دونوں بھائیوں کی لکھنؤ میں ملاقات کے متعلق شائع ہوا ہے۔ لکھنؤ سے واپسی پر مولانا چند ماہ بمبئی میں رہے اور لکھنؤ نہ جا سکے لیکن آخر کار ''اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا اور لکھنؤ پہونچ گیا...... اور الندوہ کی ایڈیٹری انھوں نے میرے متعلق کر دی۔ تقریباً سات آٹھ مہینہ وہاں

قیام رہا۔" (ص ۳۱۴) (جولائی ۱۹۰۵ء لغایت فروری ۱۹۰۶ء)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا قیام ۱۹۰۴ء سے اوائل ۱۹۰۶ء تک بمبئی اور لکھنؤ میں رہا۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں پھر بمبئی گئے اور لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے معاً بعد جو اپریل ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوا تھا "وکیل" کی ادارت سنبھالی اور اپنے بھائی کے انتقال تک امرتسر میں رہے۔ بھائی کے انتقال کی خبر معلوم ہونے پر (اوائل ۱۹۰۷ء میں) ادارت وکیل چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور چند ماہ قیام کے بعد پھر امرتسر واپس آئے اور دوبارہ وکیل کے فرائض ادارت انجام دیئے جون ۱۹۰۸ء تک امرتسر رہے۔ پھر ترک تعلق کر کے بھوپال آ گئے جولائی ۱۹۰۸ء میں پونہ چلے گئے اور وہیں قیام تھا کہ والد کی شدید علالت کا ایک تار سے علم ہوا اور کلکتہ چلے گئے۔ جس روز پہونچے اس کے چند گھنٹے بعد والد ماجد کا انتقال ہو گیا (دسمبر ۱۹۰۸ء میں) دیکھئے آزاد کی کہانی ص ۳۲۱ تا ۳۲۵

ان تمام تحریروں سے ثابت ہوا کہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء تک مولانا کا قیام مسلسل ہندوستان میں رہا اور وہ ہندوستان سے باہر کہیں نہیں گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی ۱۹۰۳ء میں اپنے والد کے ساتھ دوبارہ حجاز چلے گئے تھے اور مولانا جنھیں گھر کی زندگی سے کئی سال پہلے دل برداشتگی ہو گئی تھی اور اب تک باقی تھی (ص ۳۱۳) بمبئی ہی میں مقیم رہے اور "لسان الصدق" نکالتے رہے۔ بڑے بھائی والد کے ساتھ (جو اواخر ۱۹۰۴ء میں حجاز سے واپس آئے تھے ص ۱۴۴) واپس آ گئے اور دسمبر ۱۹۰۴ء میں مولانا کے ساتھ لکھنؤ کانفرنس میں شرکت کی۔ مولانا اس کے بعد "الندوہ" سے متعلق ہو گئے اور پھر وکیل سے۔ ۱۹۰۶ء میں جب مولانا وکیل میں تھے ان کے بھائی تنہا عراق و بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی غرض سے گئے اور وہاں سے جو خطوط بھیجتے تھے وہ "وطن" امرتسر میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے (ص ۱۷۸)۔ مولانا کا ان پانچ سال ۴ تا ۸ء میں عراق کا سفر کسی طرح صحیح نہیں۔

کہانی میں سفر عراق ۱۹۰۴ء میں بتایا گیا ہے لیکن کاروان خیال کے جس خط میں سفر عراق کا ذکر فرماتے ہیں اس وقت اپنی عمر ۲۰۔۲۱ سال کی بتائی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شک و انکار کے بعد یقین و اعتقاد کا حصول، عقلیت و الحاد کے بعد حقیقت کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ (ص ۴۲۶) تو یہ زمانہ ۸۔۹ء کا ہوتا ہے اور اس وقت اُن کے بڑے بھائی وفات پا چکے تھے۔ مولانا کا قیام والد کی وفات سے پہلے اور اس کے بعد اجراء "الہلال" ۱۹۱۲ء تک مسلسل و غیر منقطع طور پر ہندوستان ہی میں رہا۔ لہٰذا اس

زمانہ میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا حوالہ جات سے ثابت ہے یہ سفر نہیں ہوسکتا۔

کہانی میں عراق کا جانا بھائی کی معیت میں بتایا گیا ہے لیکن مولانا نے اپنے مکتوب کاروان خیال میں جو کوائف تحریر فرمائے ہیں اس میں کہیں بھائی کی موجودگی کا تذکرہ بھی نہیں اور یہ ممکن نہ تھا کہ دونوں بھائی ساتھ ہوں اور چھوٹے بھائی کی تو علماء واکابر عراق پذیرائی کریں اور بڑے بھائی کو جو کسی لحاظ سے بھی ان سے کم نہ تھے پوچھیں تک بھی نہیں۔ نیز ۱۹۰۴ء میں مولانا شک وانکار کے دور میں تھے پھر اس وقت علامہ نعمان آلوسی زادہ کا ''من این اخذت ھذ المشرب'' کہنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

ان مسلسل واقعات کی روشنی میں جو مولانا کی اس کہانی میں موجود ہیں عراق کا سفر تنہا یا بھائی کی معیت میں ۱۹۰۴ء میں یا اس کے بعد ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء میں سفر حجاز کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ جب کہ دسمبر ۱۹۰۴ء لغایت اپریل ۱۹۰۶ء مولانا کا قیام مسلسل بمبئی اور لکھنؤ رہا۔ ۱۹۰۵ء کا حج ۱۴ر فروری ۱۹۰۵ء میں اور ۱۹۰۶ء کا ۴ر فروری ۱۹۰۶ء میں ہوا اور اس زمانہ میں بھی مولانا الندوہ کے ایڈیٹر اور لکھنؤ میں قیام پزیر تھے۔ پھر یہ سفر کس طرح ۱۹۰۵ء میں ہوسکتا ہے۔

الغرض مولانا کی زندگی کے مسلسل واقعات سے یہ امر ثابت اور نا قابل بطلان ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں (جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی) ہندوستان آنے کے بعد ۱۹۵۱ء تک ہندوستان سے کہیں باہر نہیں گئے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کے مولانا سے پچاس سال تک برابر تعلقات رہے۔ علمی وسیاسی معیت و رفاقت بھی برابر رہی۔ الہلال میں بھی کچھ عرصہ بحیثیت رفیق و معین کار مولانا کی اعانت فرمائی اور جو مولانا کی نجی زندگی، مشاغل گھریلو حالات اور سفر وحضر کے واقعات سے پورے پورے واقف تھے ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا جب سے وادی غیر ذی زرع سے ہندوستان آئے پھر کبھی ہندوستان سے باہر نہیں گئے۔''

اسی طرح ۱۹۰۱ء میں لاہور کا سفر انجمن حمایت الاسلام کے اجلاس میں شرکت، مولانا حالی سے ملاقات بحیثیت مدیر لسان الصدق تھا۔ تعارف بھی کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ لسان الصدق کا اجراء ۱۹۰۲ء میں ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا ہے اور ندوہ کا یہ اجلاس اواخر ۱۹۰۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ تو پھر جب ۱۹۰۱ء میں لسان الصدق جاری نہیں ہوا تو اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تعارف اور مولانا حالی کا

---

[1] آزاد کی کہانی ص ۳۰۸ تا ۳۰۹۔

استعجاب کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ غالباً اس موقع پر ضبط سن میں تسامح ہوا ہے۔ ص۳۳۲ پر انجمن حمایت الاسلام میں لکچر کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر مارچ ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ مولانا نے ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد لاہور پہونچنے سے پہلے شیخ عبدالقادر کو خط لکھ دیا تھا اور شیخ عبدالقادر سے ندوۃ العلماء کے جلسہ کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی[1]۔ غالباً اسی اجلاس انجمن حمات الاسلام لاہور میں جو ندوہ کے اجلاس کلکتہ کے بعد ہوا ان کی مولانا حالی سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی جیسا کہ ان کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ انجمن میں دوسرے سال پھر گیا اور تقریر کی (یعنی ۱۹۰۲ء کے اجلاس انجمن کے بعد ۱۹۰۳ء میں) مولانا حالی مرحوم سے ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں جو اس سے پہلے سفر میں یعنی ۱۹۰۲ء کے سفر میں حاصل ہوئی تھی[2]۔

بہر حال ہندوستان کے اسفار اخبار و رسائل کے اجراء اور ان کی تقدیم و تاخیر ظاہر کرنے کے لئے بیشتر تو سنین کا تذکرہ ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ تضاد و تناقض سے خالی نہیں[3]۔

[1] کہانی ص۳۳۲ (رضوی) [2] کہانی ص۳۳۳ (رضوی) [3] اس آخری عنوان کا کل مضمون مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ (فریدی)

مرتب کی دیگر کتابیں اور مبصرین

''سیرت ذوالنورینؓ'' مبصر: مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری مدیر ماہنامہ ندائے شاہی مراد آباد

مولانا محب الحق صاحب مدھوبنی، مقیم حال امروہہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے خصوصی تربیت یافتہ شاگرد ہیں۔ ترتیب و تالیف کا بھی شوق ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے حالات اور مکتوبات پر مشتمل آپ کی تالیف ''فیضان نسیم'' کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ زیر تبصرہ رسالہ ''سیرت ذوالنورین'' خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کی حیات مقدسہ پر لکھا گیا۔ موصوف کا ایک عام فہم اور جامع مقالہ ہے جسے آپ نے دس بارہ سال قبل لکھا تھا اور حضرت مفتی صاحبؒ کو لفظاً لفظاً سنایا بھی تھا مگر اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب یہ رسالہ بعض اصحاب خیر کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ کی زبان سادہ اور تصنع سے خالی ہے۔ عوام اس سے بخوبی استفادہ کر کے حضرت عثمان غنیؓ کے مقام رفیع کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رسالہ کے شروع میں حضرت مولانا سید طاہر حسن امروہی اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کی تقریظات اور آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک نظم در مدح حضرت عثمانؓ بھی شامل ہے۔ جس سے رسالہ کی رونق بڑھ گئی ہے۔

''مکتوبات مشاہیر'' مبصر: مولانا عبدالحمید نعمانی (ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی)

خطوط و مکتوبات انسان کے اصل اور فطری خیال کا آئینہ ہوتے ہیں۔ تحریر اور تقریر میں حالات اور مخاطب کے لحاظ سے بسا اوقات اپنی جگہ سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے یا نیچے آنا پڑتا ہے لیکن خطوط نگاری میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ یہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ ذہن میں نہیں ہوتا ہے کہ خط مکتوب الیہ کے سوا دوسرے بھی پڑھیں گے۔ کچھ بتایا جاتا ہے، کچھ پوچھا جاتا ہے اور اس میں کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا ہے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ بالکل ایک دوسرے کے سامنے اصل حالت میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بات حقیقت و صداقت پر مبنی ہے کہ کسی کو سمجھنے کے لئے سب سے معتبر اور بہتر ذریعہ اس کے خطوط ہوتے ہیں۔ مکاتیب نبویؐ اور صحابہؓ و تابعینؒ کے مکاتیب اس کے روشن نمونے ہیں۔ بعد کے دور میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور سید احمد شہیدؒ کے مکتوبات علم و عرفان اور حقائق و معارف کے خوبصورت نمونے ہیں۔ اردو میں علامہ شبلی نعمانی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا آزادؒ، مولانا مودودیؒ اور شعراء و ادباء میں غالب، اقبال، رشید احمد صدیقی، عبدالحق، نواب یاور جنگ اور جان نثار اختر وغیرہم کے مکتوبات قابل مطالعہ ہیں۔ ادھر ماضی قریب اور حال کے برسوں میں بڑی تعداد میں خطوط و مکتوب کے مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ دینی و مذہبی حلقوں میں مکاتیب کی اشاعت پر توجہ دی جا رہی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک اچھا ''مجموعہ مکاتیب'' بنام عبدالکریم پاریکھ سامنے آیا ہے۔ مولانا مفتی ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند کے نام مجموعہ مراسلات اور مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبیداللہ مبارک پوریؒ کے مکاتیب بھی خاصے کی چیز ہیں۔ جناب مولانا محب الحق صاحب کا مرتب کردہ مجموعہ مکتوبات مشاہیر بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اگرچہ اس نام سے اور بھی خطوط کے مجموعے

شائع ہو چکے ہیں تاہم اس زیر تبصرہ مجموعہ کی الگ حیثیت ہے۔ مولانا محب الحق صاحب بہت محنتی اور لگن کے آدمی ہیں۔ انھیں محقق شہیر مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہی کی بابرکت فیض بخش صحبت و خدمت میں رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ انھوں نے دیکھا ہے کہ کام کی تحقیق و تصنیف کا کام کس طرح کیا جاتا ہے۔ مرتب موصوف کی دو کتاب ''فیضان نسیم'' اور ''مکتوبات نعمانی'' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ دونوں کتابوں کی ترتیب و تبویب کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ مرتب میں تبویب و ترتیب کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان کی یہ صلاحیت اور سلیقہ مندی اور زیادہ نظر آتی ہے۔ انھوں نے مکتوبات مشاہیر میں صرف یہ نہیں کیا ہے کہ نواب آخون عزیز الٰہی خاں کو مختلف اہل قلم کے لکھے مکاتیب کو ترتیب سے جمع کر دیا ہے بلکہ مرتب موصوف نے بہت سے مکتوب نگاروں کے تعارف کے ساتھ ان کے کام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ کام انھوں نے بڑی محنت سے کیا ہے۔ خط لکھنے والے علماء، صحافی، دانشور اور ادباء جیسے قبیل کے جو افراد ہیں ان کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان میں سے ۴۲ مکتوب نگاروں کا تعارف دیا گیا ہے۔ بقیہ کے حالات نہیں مل سکے ہیں۔ ''مکتوبات مشاہیر'' کے بعض خطوط بہت کام کے ہیں۔ دیگر مکاتیب سے بہت سی مفید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مکتوب نگاروں میں سے یہ حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا علی میاں ندویؒ، مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ، حکیم عبدالرشید محمودؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا مطلوب عثمانی، مولانا احتشام الحسنؒ، مولانا تقی امینیؒ، مولانا قاری محمد طیبؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ۔ بقید حیات حضرات میں مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا زین العابدین، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مولانا محمد طلحہ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کے مکتوبات کے مجموعے بڑے کام کے اور معلومات افزاں ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ایک اچھی کوشش ہے البتہ معیاری کتابت پر تھوڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس میں یکسانیت بھی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کا حسن متاثر ہوا ہے۔ کچھ اور توجہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً ص ۱۷ پر مولانا نعمانیؒ کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی بیشمار تصنیفات ہیں۔ یہاں بہت سی کا محل تھا۔ ص ۱۹ پر مولانا علی میاں ندویؒ کی مشہور کتابوں میں سیرت سید احمد شہیدؒ کا ذکر ہونا چاہئے۔ ص ۶۰ پر مولانا زین العابدین مدظلہ کے ذکر کے تحت لکھا ہے کہ غالباً مولانا عبدالجبار اعظمیؒ سے اجازت بیعت حاصل ہے۔ مولانا مدظلہ مظاہر علوم سہارنپور میں تخصص فی الحدیث کے استاذ ہیں۔ ان سے ایک خط لکھ کر یا فون سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ان کو آیا مولانا اعظمیؒ سے اجازت بیعت حاصل ہے۔ اس صورت میں غالباً کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ یقینی بات سامنے آجاتی ہے۔ اس سے تحقیق دوبالا ہو جاتی۔ ص ۸۱ پر حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ کے خط میں براہ مہربانی کو برائے مہربانی کتابت کر دیا ہے۔ صحیح لفظ براہ ہے۔ ص ۸۷ پر مکتبہ فکر لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ صحیح مکتب فکر ہے۔ یہ انگریزی لفظ اسکول آف تھاٹ کا ترجمہ ہے۔ مکتبہ اس لحاظ سے بے معنیٰ لفظ ہے۔ پہنچنے کو کتاب میں پہونچے لکھا ہے یہ غلط املا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن اس طرح کی غلطیوں سے پاک ہوگا خاص طور سے کتابت کی یکسانیت ہونی چاہئے۔ اس طرح کی غلطیوں کو چھوڑ کر مکتوبات مشاہیر ایک مفید کتاب ہے۔ امید ہے کہ اس سے علماء، صوفیاء اور دانشوروں کے علمی و مفید غیر مطبوعہ مکاتیب کی اشاعت کو تقویت ملے گی اور دوسرے حضرات کو بھی اس طرح کے کام کے لئے تحریک ملے گی۔



دیگر
اردو
مطبوعات

تذکرہ اطباء اودھ	از پروفیسر کمال الدین حسین
مشائخ نقشبندیہ مجددیہ	از حضرت مولانا مولوی محمد حسن
تاریخ مشائخ چشت (حصہ اول)	از پروفیسر خلیق احمد نظامی
تاریخ مشائخ چشت (حصہ پنجم)	از پروفیسر خلیق احمد نظامی
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	از پروفیسر خلیق احمد نظامی
ماخذ مولانا ابوالکلام آزاد	از پروفیسر خلیق احمد نظامی
فرائد قاسمیہ	از مولانا قاسم نانوتویؒ
جامع العلوم	از جلال الدین جہاں گشت
سراج الہدایہ	از جلال الدین جہاں گشت
حیاتِ اجمل	از شفا الملک حکیم رشید احمد خاں





مقالات فریدی

حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہیؒ کے مقالات

(جلد اوّل)

جامع و مرتب :

مولانا محب الحق